فقہائے پاک و ہند

تیرھویں صدی ہجری

جلد دوم

محمد اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

: ۱۹۸۴
تعداد ۱۱۰۰
مطبع کمبائن پرنٹرز۔ لاہور
ناشر محمد اشرف ڈار (معتمد)
ادارہ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

فہرست مضامین

ع — فقہائے کرام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اب تک سلسلۂ "فقہائے ہند" کی آٹھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، جن کی ترتیب یہ ہے:

۱- **جلد اوّل**:- پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کے فقہائے عالی قدر کے حالات پر مشتمل ہے۔

۲- **جلد دوم**:- نویں صدی ہجری کے فقہائے کرام کے ارباب فقہ کا تذکرہ ہے۔

۳- **جلد سوم**: دسویں صدی ہجری کے فقہائے کرام کے واقعات پر محیط ہے۔

۴- **جلد چہارم**، حصہ اوّل:- گیارھویں صدی ہجری کے تذکرۂ فقہا پر محتوی ہے۔

۵- **جلد چہارم**، حصہ دوم:- یہ بھی گیارھویں صدی ہجری کے علما و فقہا کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۶- **جلد پنجم**، حصہ اوّل:- بارھویں صدی ہجری کے ہندی فقہا کی علمی و فقہی سرگرمیوں کا مجموعہ ہے۔

۷- **جلد پنجم**، حصہ دوم:- اس میں بھی بارھویں صدی ہجری کے علما و فقہا کی تحقیقی تگ و تاز کو حیطۂ کتابت میں لایا گیا ہے۔

۸- **فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری جلد اوّل**:
اس میں نام کی تھوڑی سی تبدیلی سے تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے پاک و ہند کے

حالات و سوانح ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔

اب مجموعی اعتبار سے اس سلسلے کی نویں جلد پیش کی جا رہی ہے، جسے نام کی تبدیلی کے بعد تیرھویں صدی ہجری کی جلد دوم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِس سلسلے کی پہلی جلد جو دو سال قبل (۱۹۸۲ء میں) طبع ہوئی، حروفِ تہجی کی ترتیب سے حرفِ الف سے شروع ہو کر حرفِ ط پر ختم ہوئی تھی اور اس میں برِصغیر کے ایک سو علما و فقہا کے واقعات و سوانح حیطۂ تحریر میں لائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ "بعض اور فقہائے کرام" کے عنوان سے ان فقہا کا تذکرہ کیا گیا تھا جن کے حالات نہیں ملتے یا ملتے ہیں تو بہت کم ـــــــ! ان میں ردیف الف کے ضمن میں پندرہ، ردیف ب میں نو، ردیف ج میں دو، ردیف ح میں دس، ردیف ر میں نو، ردیف س میں چار، ردیف ش میں چار اور ردیف ص میں بھی چار فقہائے کرام کا تذکرہ ہے۔

خیال یہ تھا اور اس سے پہلی جلد کے مقدمے میں اس کا اظہار بھی کیا گیا تھا کہ جلد دوم حرفِ ع سے شروع ہو کر حرفِ ی تک ختم ہو جائے گی، لیکن جب لکھنے بیٹھا اور مختلف شخصیتوں کے حالات و کوائف پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ دوسری جلد میں کتاب ختم کر دینا ممکن نہیں۔ بے شک کتنے بھی اختصار سے کام لیا جائے، پورے مواد کو ایک جلد میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ چنانچہ بڑی مشکل سے صرف حرفِ ع ختم ہو سکا ہے، جس میں چھیالیس فقہائے عظام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جن حضرات کو تذکرہ نگاروں نے فقیہ قرار دیا ہے، لیکن ان کے زیادہ حالات میسر نہیں، ان کا تذکرہ "بعض دیگر فقہائے کرام" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ ان کی تعداد چھتیس (۳۶) ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد

اس سے پہلی جلد کے مقدمے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذکر ہوا تھا اور بتایا گیا تھا کہ انگریزوں کے خلاف اہلِ ہند کی یہ پہلی بغاوت تھی جسے انگریزوں نے "غدر"

کا نام دیا۔ نیز وضاحت کی گئی تھی کہ اس میں ملک کے کس کس طبقے کے لوگوں نے حصہ لیا اور کن اسباب و وجوہ کی بنا پر لیا۔ یہ بھی عرض کیا تھا کہ بغاوت پر قابو پا لینے کے بعد انگریزی حکومت نے اس ملک کے باشندوں پر انتہائی مظالم ڈھائے۔ مسلمانوں کو بالخصوص ہدفِ ستم ٹھہرایا۔ مغل حکومت ختم ہوگئی اور اس کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر گرفتار ہوا۔ انگریز کی عدالت میں اس پر بغاوت کا مقدمہ چلا، اُسے جلا وطنی کی سزا ملی اور اس نے بےکسی اور غربت کے عالم میں رنگون میں وفات پائی ——— برِصغیر کی تاریخِ سیاست کا ایک بہت بڑا باب یہاں آکر ختم ہو گیا۔

اِس کے بعد ایک اور دور شروع ہوتا ہے، جسے اِنتہائی سنگین اور دردناک دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس دور میں دو فریق ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف انگریزی حکومت ہے جو تمام سیاسی اختیارات کی مالک اور ظلم و ستم کے ہر چھوٹے بڑے ہتھیار سے مسلح ہے۔ دوسری طرف اہلِ حق کی جماعت ہے جو بظاہر بہت کم تعداد پر مشتمل ہے۔ ان کے پاس نہ دنیوی جاہ و جلال ہے، نہ مادّی شان و شکوہ ——— ان کا تمام تر سرمایہ کلمۂ حق ہے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ انگریزی حکومت کے نزدیک ان کا یہ بہت بڑا جرم تھا۔ اسی کی پاداش میں یہ گرفتار ہوئے، اسی کے نتیجے میں اُنھیں شدید جسمانی سزائیں دی گئیں اور اسی بنا پر انھیں کالے پانی بھیجا گیا۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل یا اس متن کی کچھ تشریح آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمایئے:

تبلیغ اسلام اور دعوت جہاد

برِصغیر پاک و ہند کے مختلف حصّوں میں تبلیغِ اسلام اور دعوتِ جہاد کا جو سلسلہ سیّد احمد شہید کے زمانے سے جاری تھا، واقعۂ بالاکوٹ کے بعد حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ اس میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ پھر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں واقعات کی رفتار میں کچھ اور تغیر رُونما ہوا۔ چند سال پیشتر پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم تھی اور قدرتی بات ہے کہ مجاہدین کی اوّلین ٹکر انہی سے

ہوئی۔ پھر سکھوں کی جگہ انگریزی تسلط نے لی تو ان کا مقابلہ براہِ راست انگریزوں سے ہوا۔ سکھ اور انگریز دونوں مسلمانوں کے دشمن تھے اور مجاہدین یکے بعد دیگرے دونوں سے متصادم ہوتے۔ سکھوں سے تصادم کا دور عارضی تھا، لیکن انگریزوں سے سو سال سے زیادہ عرصہ، ۱۹۴۷ء (یعنی قیام پاکستان) تک جنگ جاری رہی ــــــــ سرحد پار کے مجاہدین تو باقاعدہ میدانِ محاربہ میں انگریزوں سے برسرِپیکار تھے، لیکن بعض لوگ برصغیر کے مختلف علاقوں میں انھیں نقد روپے بھیجتے تھے اور اس روپے سے وہ اسلحہ وغیرہ خریدتے اور انگریزی حکومت کے خلاف اسے استعمال کرتے تھے ــــــــ روپیہ اکٹھا کرنا اور پھر اُسے مجاہدین کے مرکز میں بھیجنا، سخت مشکل کام تھا جو انتہائی خفیہ طریقے سے ہوتا تھا۔ ہندوستان میں اس کے جو مراکز قائم تھے، ان میں بہت بڑا اور اہم مرکز عظیم آباد کا محلہ صادق پور تھا۔ عظیم آباد اس زمانے میں "پٹنہ" کا نام تھا جو ہندوستان کے صوبہ بہار کا دار الخلافہ ہے۔ اس کا محلہ صادق پور جلیل القدر علما کا مرکز تھا، جن میں مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی، مولانا فیاض علی، مولانا عبدالرحیم، حکیم عبدالحمید، مولانا عبداللہ اور حافظ عبدالمجید وغیرہ بہت سے نامور حضرات شامل ہیں۔ ان سب کا تعلق جماعتِ مجاہدین سے تھا۔ اس تعلق کی بنا پر انگریزی حکومت نے انھیں شدید اذیتوں اور سخت مصیبتوں میں مبتلا کیا اور ایسی ایسی سزائیں دیں کہ جن کے تصور ہی سے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

پہلی مخبری

ہوتی مردان کا ایک شخص غزن خاں، ضلع کرنال کے محکمۂ پولیس میں سارجنٹ کے عہدے پر فائز تھا۔ مئی ۱۸۶۳ء کی بات ہے کہ اس کو جرنیلی سڑک پر گشت کے دوران ضلع کرنال کے ایک مقام پر چار آدمی پیدل جاتے ہوئے ملے۔ ان کی وضع قطع درویشوں کی سی تھی اور رنگ سانولے تھے۔ غزن خاں نے انھیں بنگالی سمجھ کر روکا اور پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اسے شبہ تھا کہ یہ لوگ مجاہدین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس شبہے کی وجہ یہ تھی کہ ہوتی مردان اور مجاہدین کے مرکز میں اس وضع قطع اور شکل و صورت کے لوگ

اس نے دیکھے تھے۔ ان آدمیوں نے غزن خان کو بتایا کہ وہ ملکا (سرحد) سے آئے ہیں اور منشی محمد جعفر کے پاس تھانیسر جا رہے ہیں، اس سے مل کر آگے نکل جائیں گے اور مہینے دو مہینے بعد واپس آئیں گے۔ انھوں نے غزن خان سے کہا تم بھی نوکری چھوڑ کر ہمارے ساتھ ملکا چلو، وہاں بہت بڑی جنگ ہونے والی ہے۔

غزن خان نے یہ باتیں سنیں تو انھیں گرفتار کر کے پانی پت کے تھانے میں لے گیا۔ اور ایک رپورٹ تیار کی، جس میں لکھا کہ یہ لوگ حکومت کے دشمن ہیں۔ انھوں نے بہت کہا کہ ہمیں چھوڑ دیا جائے لیکن غزن خاں نے انھیں نہ چھوڑا۔ وہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے تو عدم ثبوت کی بنا پر انھیں رہا کر دیا گیا۔ ان کا مقدمہ مسٹر سٹیفن ایجسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں پیش ہوا تھا، اس نے ۱۸ مئی ۱۸۶۳ء کو حکم لکھا کہ "چھان بین کے بعد واضح ہوا کہ یہ چار آدمی معمولی مسافر ہیں، لہٰذا انھیں رہا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔"[1]

ان کی رہائی کو غزن خاں نے اپنی پیشہ وارانہ توہین سمجھا اور اس کو سخت ذہنی کوفت ہوئی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ اس نے مسلمانانِ برصغیر کے اس اصلاحی اور دینی نظام کو انگریزی حکومت کی خوشنودی کے لیے برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے بیٹے فیروز کو جو سرحد کے ایک مقام حمزہ خاں میں مقیم تھا، خط لکھا کہ تم ملکا جاؤ، وہاں ایک اخوند زادہ عبداللہ اقامت گزیں ہے۔ اس کی مسجد میں جا کر ٹھہرو اور اس کے ذریعے مکمل معلومات حاصل کرو کہ جماعتِ مجاہدین کو ہندوستان کے کس کس علاقے اور کن کن لوگوں کے ذریعے مالی امداد ملتی ہے۔ فیروز باپ کی ہدایت کے مطابق وہاں پہنچا، دس دن اس علاقے میں مقیم رہا، مختلف مقامات پر گیا، مجاہدین کے ٹھکانوں اور ان کی سرگرمیوں کا پتا چلایا اور پورے کوائف حاصل کر کے واپس اپنے وطن حمزہ خاں آیا اور اپنے باپ غزن خاں کو تمام تفصیلات

---

[1] سرگزشتِ مجاہدین، ص ۳۷۷ (حاشیہ)

تحریر کرکے بھیجیں۔ اس نے باپ کو یہ بھی بتایا کہ محمد جعفر تھانیسری مجاہدین کی مالی امداد بھی کرتا ہے اور انھیں رائفلیں وغیرہ بھی بھیجتا ہے، اور پھر اس کے بھیجے ہوئے مال اور اسلحہ کو مجاہدین انگریزوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ فیروز نے یہ بھی لکھا کہ مجاہدین فخریہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہندوستان میں بہت بڑے بڑے آدمی ان کے دوست ہیں۔ اس سلسلے میں وہ محمد جعفر تھانیسری کا نام بھی لیتے ہیں، اُسے وہ خلیفہ کہتے ہیں اور اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ گویا وہ کوئی بہت بڑا نواب ہے۔[۲]

اس طرح غزن خاں اور اُس کے بیٹے فیروز کی رپورٹ سے پہلی مرتبہ سرکاری سطح پر مجاہدین کی اس تنظیم کا راز فاش ہوا، اور یہ پہلی مخبری تھی جو ان باپ بیٹے نے ان سراپا خلوص لوگوں کی کی۔

اب یہ رپورٹ آگے چلی۔ سوار پولیس کے افسر کپتان موزلی نے یہ رپورٹ انسپکٹر جنرل پولیس کو بھیجی اور ضلع انبالہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کپتان پارسنز کو اس کی مزید تحقیقات کا حکم ملا۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری اپنی کتاب "کالا پانی" میں لکھتے ہیں :

"غزن خاں نے ۲۸ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۰ھ (۱۱ دسمبر ۱۸۶۳ء) کو کسی ذریعے سے میرے حال سے واقف ہوکر اپنی دنیوی بھلائی کا موقع جان کر ایک لمبی چوڑی کیفیت خیر خواہانہ بحضور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہوکر یہ مخبری کی کہ یہ جنگ جو ہندوستانی مجاہدین کے ساتھ سرحد پر ہو رہی ہے، ان لوگوں کو محمد جعفر لمبردار تھانیسر روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے[۳]۔"

مولوی محمد جعفر کی تلاشی اور گرفتاری

جب غزن خاں ڈپٹی کمشنر کرنال کو یہ رپورٹ دے کر اس کے بنگلے سے باہر نکلا تو

---

[۲] سرگزشت مجاہدین، ص ۳۷۸

[۳] کالا پانی، ص ۴۶۔

اُسی وقت مولوی محمد جعفر کے ایک دوست کو اس کا پتا چل گیا۔ اس نے اپنے ایک ملازم تادا کو، جو مولوی صاحب کا ہمسایہ اور خیر خواہ تھا، بطور افسوس کے ساری بات بتائی۔ تادا اسی وقت کرنال سے تھانیسر آیا تاکہ مولوی صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کر دے اور یہ بتا دے کہ ان کی مخبری ہو چکی ہے اور تلاشی کا خطرہ ہے۔ لیکن جس وقت وہ تھانیسر پہنچا، رات ہو چکی تھی اور مولوی صاحب کے گھر کے دروازے بند تھے، لہٰذا اس وقت اس نے ان کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور خیال کیا کہ صبح کو بتا دیا جائے گا۔ لیکن وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ کو منظور ہو۔ اسی وقت کپتان پارسنز پولیس کی بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مولوی صاحب کے مکان کے دروازے پر پہنچ گیا یعنی تادا نے جس غرض کے لیے سفر کی تکلیف اُٹھائی تھی وہ پوری نہ ہوئی۔

مولوی محمد جعفر کے مکان کا محاصرہ کر لیا گیا اور تلاشی لی گئی۔ مولوی صاحب کے خطوط، مجاہدین سے متعلق کاغذات اور ضروری چیزیں جو پولیس کے لیے مفید مطلب ہو سکتی تھیں، قبضے میں کر لیں۔ لیکن مولوی صاحب کو گرفتار نہیں کیا، کیونکہ ان کے وارنٹ گرفتاری نہیں تھے۔ مجاہدین کے بارے میں بعض لوگوں کو ہدایات دینے اور دیگر امور کی تکمیل کے لیے مولوی صاحب تھانیسر سے نکلے اور پانی پت پہنچے، وہاں سے دہلی اور پھر علی گڑھ گئے۔ اب اُن کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکے تھے۔ پولیس سراغ لگاتی ہوئی ان کے پیچھے پہنچی اور اُنھیں علی گڑھ سے گرفتار کر لیا گیا۔

مزید گرفتاریاں

پولیس نے جب مولوی صاحب کے خطوط اور کاغذات کو سامنے رکھا تو تفتیش کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ بہت سی نئی چیزیں اس کے علم میں آئیں اور مجاہدین کے متعدد نئے معاونین کا پتا چلا۔ معاونین میں ہندوستان کے شہر پٹنہ کے بڑے بڑے علما بھی شامل تھے۔ ان سب کے گھروں کی تلاشیاں لی گئیں اور پھر اُنھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان گرفتار شدہ لوگوں کو انبالہ کے ڈپٹی کمشنر کپتان ٹائی کی عدالت میں پیش کیا گیا اور پھر ان پر مقدمہ چلا۔۔۔۔۔ یہ مندرجہ ذیل حضرات تھے:

۱۔ **شیخ محمد شفیع ٹھیکیدار:** یہ کاروباری آدمی تھے جو مختلف چھاؤنیوں میں فوج کو گوشت فراہم کرتے تھے۔ جائداد پچاس لاکھ کے قریب تھی "شفاعت علی" کے نام سے مجاہدین کی امداد کرتے تھے۔ ان کے والد شیخ محمد تقی تھے جو سید احمد شہید کے مرید تھے۔

۲۔ **مولوی محمد جعفر:** تھانیسر (ضلع انبالہ) کے رہنے والے تھے اور وہاں کے نمبردار تھے۔ والد کا نام میاں جیون تھا۔ ذات ارائیں۔ مقدمے کے وقت عمر پچیس سال تھی۔ مجاہدین کے معاونین کی فہرست میں ان کا نام "پیر جلال" تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بھی انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے چند رفقا کو لے کر دہلی گئے تھے لیکن جب پتا چلا کہ انگریزوں نے ہنگامے کو دبا دیا ہے تو واپس آگئے تھے۔

۳۔ **مولانا یحییٰ علی جعفری عظیم آبادی:** عظیم آباد (پٹنہ) کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے دور کے نامور عالم تھے۔ جب مقدمہ شروع ہوا، ان کی عمر بیالیس سال تھی۔ خدام مجاہدین میں "محی الدین" کے نام سے موسوم تھے۔ ۲۶ رمضان ۱۲۸۰ھ (۵ مارچ ۱۸۶۴ء) کو انھیں گرفتار کر کے ریل گاڑی کے ذریعے انبالے بھیجا گیا۔

۴۔ **مولانا عبدالرحیم:** عظیم آباد (پٹنہ) کے صاحبِ ثروت خاندان کے فرد اور وہاں کے رئیس تھے۔ مولانا فرحت حسین کے بیٹے اور مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی عظیم آبادی کے بھتیجے تھے۔ آغازِ مقدمہ کے وقت اٹھائیس برس عمر تھی۔

۵۔ **میاں عبدالغفار:** مقدمے کی کارروائی میں انھیں مولانا عبدالرحیم کا ملازم بتایا گیا ہے۔ نیکی، حسنِ عمل اور حمیتِ دینی کی وجہ سے سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ عمر پچیس سال تھی۔

۶۔ **الٰہی بخش:** والد کا نام کریم بخش تھا۔ مولانا احمد اللہ عظیم آبادی کے

مختار تھے ۔ خود بھی کاروبار کرتے تھے ۔ عمر بیالیس سال تھی ۔ پانچ سال جیل میں رہے ۔

۷ ۔ **عبدالکریم انبالوی** : شیخ محمد شفیع کے مختار تھے اور شیخ صاحب کی بھانجی سے اُن کی شادی بھی ہوئی تھی ۔ عمر پنتیس برس تھی تین سال قید کاٹ کر رہا ہوئے ۔

۸ ۔ **قاضی میاں جان** : موضع کمر کلی (ضلع پٹنہ) کے رہنے والے تھے اور سلسلۂ مجاہدین کے نہایت مخلص کارکن تھے ۔ عمر ساٹھ برس تھی ۔ انبالہ جیل میں وفات پائی ۔ انبالہ کے جج کا بیان ہے کہ باغیانہ خط وکتابت کا سب سے بڑا حصہ انہی کے گھر سے دست یاب ہوا ۔

۹ ۔ **حسینی ابن میگو** : عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے تھے ۔ عمر پنتیس سال تھی ۔

۱۰ ۔ **حسینی بن محمد بخش** : تھانیسر کے رہنے والے تھے ۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی کے عہد امارت میں مجاہدین کے ساتھ شریک جہاد رہے ۔ پھر جماعتی امور میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کے معاون بنا دیے گئے ۔ مقدمہ شروع ہوا تو عمر پچیس برس تھی ۔ سات سال جیل میں رہے ۔

۱۱ ۔ **عبدالغفور** : والد کا نام شاہ علی خاں تھا ۔ ضلع شاہ آباد (صوبہ بہار) کے رہنے والے تھے ۔ ایک روایت کے مطابق ہزاری باغ کے باشندے تھے ۔ تھانیسر میں مولوی محمد جعفر کے ہاں مقیم تھے ۔ عمر پچیس سال تھی ۔ دس سال جیل کاٹ کر رہا ہوئے ۔

یہ اپنے وقت کے معزز اور خوش حال لوگ تھے ، لیکن گرفتاری کے بعد ان کو انتہائی الم ناک سزائیں دی گئیں ۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا ، ہتھکڑیاں اور لوہے کے طوق پہنائے گئے ، اس قسم کی روٹیاں کھانے کو دی گئیں جن میں چوتھا حصہ ریت اور مٹی شامل تھی ——— ان میں سے بعض کو علیحدہ علیحدہ پھانسی کی کوٹھڑیوں میں رکھا گیا ۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کو بالخصوص مبتلائے اذیت کیا گیا ، کئی کئی گھنٹے مسلسل

انھیں زدو کوب کیا جاتا ______ مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ مجھ پر جو سختی کی گئی، اُس کے پیشِ نظر مجھے یقین ہوگیا تھا کہ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ رمضان کے کچھ روزے میرے ذمے باقی تھے، کوئی چیز کھائے پیے بغیر میں نے روزے رکھنا شروع کر دیے۔ دوسرے دن مار پیٹ کے بعد مجھے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے میں لے جایا گیا اور چاپلوسی سے کہا کہ سب کچھ بتا دو تمھیں سرکاری گواہ بنا کر رہا کر دیا جائے گا بہت بڑا عہدہ بھی دیا جائے گا، میں نے انکار کیا تو پھر مار پیٹ شروع ہوگئی۔ صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک مسلسل بارہ گھنٹے زدو کوب جاری رہی۔ افطاری کا وقت ہوا تو میں نے بنگلے کے درخت سے پتے توڑ کر روزہ کھولا۔

یہ تمام تفصیلات اُنھوں نے اپنی کتاب "کالا پانی" میں تحریر کی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر صابر و شاکر تھے، کتنے بلند حوصلہ اور اپنے مقصد سے کس درجے محبت رکھتے تھے۔

۱۔ پہلا مقدمۂ بغاوت، انبالہ

یہ مقدمہ چونکہ انبالے میں شروع ہوا تھا اس لیے برصغیر کی سیاسی تاریخ میں اسے انبالہ کیس یا مقدمۂ انبالہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ پہلا مقدمۂ بغاوت تھا۔ مقدمے کی ابتدائی کارروائی ڈپٹی کمشنر کپتان ٹائی کی عدالت میں شروع ہوئی جو ایک ہفتہ جاری رہی۔ اس اثنا میں الزامات کی نوعیت، گواہوں کی ترتیب اور شہادتوں کی تفصیل مرتب کی گئی، اور تمام ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا گیا۔ سیشن عدالت میں باقاعدہ مقدمہ جاری ہوا۔

ملزم پہلے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہوئے تو دورانِ مقدمہ میں نماز کا وقت ہوگیا۔ نماز کی اجازت طلب کی تو نہ ملی۔ پھر معمول یہ رہا کہ جوں ہی نماز کا وقت ہوتا، ملزم تیمم کرکے اور بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لیتے۔ مقدمے کی سماعت جتنے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں ہوئی، تمام ملزم الگ الگ پھانسیوں کی کوٹھڑیوں میں بند رہے۔ جب مقدمہ سیشن سپرد ہوا تو سب کو حوالات میں اکٹھا کر دیا گیا۔ اب ماحول قدرے

سازگار تھا اور تمام دوست اکٹھے رہتے تھے، اس لیے مصیبتوں اور اذیتوں کا احساس تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ان دنوں مولوی محمد جعفر اکثر یہ شعر پڑھتے تھے۔

پائے در زنجیر پیش دوستاں
بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

مولانا یحییٰ علی تکلیفوں اور اذیتوں کے ان دنوں میں عام طور پر یہ رباعی پڑھتے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے۔

لَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ لِلّٰہِ مَصْرَعِیْ
وَ ذَالِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَ اِنْ یَّشَأْ یُبَارِکْ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعٖ

یعنی جب میں مسلمان مارا جاؤں تو مجھے کچھ پروا نہیں کہ اللہ کی طرف میرا لوٹنا، اگرچہ کسی بھی طرح سے ہو۔

یہ سب اللہ کی راہ میں ہے، وہ چاہے تو بوسیدہ ہڈیوں اور تمام اعضائے جسم میں برکت اور بالیدگی پیدا کر دے۔

فیصلہ

ہم یہاں اس مقدمے کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے۔ اس موقعے پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سیشن جج کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ بعض ملزموں نے بڑی بڑی فیسیں دے کر انگریز وکیلوں کی خدمات بھی حاصل کیں۔ لیکن عدالت نے ۲ مئی ۱۸۶۴ کو حسب ذیل فیصلہ سنایا:

۱۔ **شیخ محمد شفیع** :۔ سزائے موت، جائداد ضبط، لاش جیل کے قبرستان میں دفن کی جائے۔

۲۔ **مولانا محمد یحییٰ علی** :۔ یہی سزا۔

۳۔ **مولانا جعفر تھانیسری** :۔ سزائے موت، جائداد ضبط۔

۴۔ **مولانا عبدالرحیم** :۔ حبس دوام بعبور دریائے شور، جائداد ضبط۔

۵۔ **قاضی میاں جان** :۔ یہی سزا۔

۶۔ میاں عبد الغفار:۔ حبسِ دوام لعبور دریائے شور، جائداد ضبط۔

۷۔ منشی عبد الکریم:۔ 〃 〃 〃 〃

۸۔ الٰہی بخش :۔ 〃 〃 〃 〃

۹۔ عبد الغفور:۔ 〃 〃 〃 〃

۱۰۔ حسینی عظیم آبادی:۔ 〃 〃 〃 〃

۱۱۔ حسینی تھانیسری :۔ 〃 〃 〃 〃

سزا سُننے کے بعد ملزموں کے انگریز وکیلوں نے جوڈیشل کمشنر پنجاب کی عدالت میں اپیل دائر کی، جس کے نتیجے میں سزاؤں میں کچھ تخفیف ہوئی اور پہلے تین ملزموں کی سزائے موت کو حبسِ دوام لعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ یہ فیصلہ ۲۴ اگست ۱۸۶۴ء کو صادر ہوا۔ جن تین بزرگوں کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل ہوئی، اس کی اطلاع انھیں ۱۶ ستمبر ۱۸۶۴ء کو ملی۔

جیساکہ اُوپر بتایا گیا، شیخ محمد شفیع، مولانا یحییٰ علی اور مولوی محمد جعفر (تینوں) کو پھانسی کی سزا سُنائی گئی تھی۔ یہاں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ سزا سُن کر شیخ صاحب تو بہت مغموم ہوئے، البتہ دوسرے دونوں بزرگ انتہائی خوش تھے۔ انگریز پولیس کپتان نے مولوی محمد جعفر سے اس خوشی کی وجہ پوچھی تو اُنھوں نے بتایا کہ شہادت کی اُمید پر خوش ہیں، جو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، تم اس کو کیا جانو۔[۳]

اس کے بعد ان کی سزائے موت ختم کر دی گئی کہ ملزم اس سے خوشی محسوس کرتے تھے اور اُن کو خوش کرنا ہرگز مقصود نہ تھا۔ اس کے بجائے حبسِ دوام لعبور دریائے شور کی سزا دی گئی کہ موت کے مقابلے میں یہ زیادہ تلخ اور تکلیف دہ سزا ہوگی۔ شیخ محمد شفیع کی سزا صرف جائداد کی ضبطی تک محدود رکھی گئی۔ جن لوگوں کو پھانسی کی سزا ختم کر کے حبسِ دوام کی سزا دی گئی، ان کے سر اور داڑھی مونچھ مونڈ دیے

---

[۳] کالا پانی، ص ۶۸۔

گئے۔ مولانا یحییٰ علی داڑھی کے کٹے ہوئے بال ہاتھ میں اُٹھائے پھرتے اور کہتے:
"افسوس نہ کرو تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کی خاطر کاٹی گئی۔"[۵]

کالے پانی کو روانگی:

ان گیارہ ملزموں میں سے چار ملزموں، مولانا یحییٰ علی، میاں عبدالغفار، مولوی محمد جعفر تھانیسری اور مولانا عبدالرحیم کو کالا پانی بھیجا گیا۔ پہلے تین بزرگوں کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر انبالہ سے پیدل لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرتسر کے راستے لاہور لایا گیا اور کچھ عرصہ لاہور سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ اس کے بعد ریل گاڑی کے ذریعے ملتان اور وہاں سے کشتی میں سوار کر کے کوٹڑی پہنچایا گیا۔ کوٹڑی سے کراچی اور کراچی سے بادبانی جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچے۔ ۸ دسمبر کو بمبئی سے جمنا جہاز میں سوار ہوئے اور چونتیس دن کے بعد ۱۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو پورٹ بلیئر (جزیرۂ انڈمان) میں اُترے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالرحیم کو انبالہ جیل سے نکالا گیا، وہ بیمار تھے، لاہور پہنچے تو ایک سال آٹھ مہینے لاہور سنٹرل جیل میں رہے۔ اس کے بعد ملتان، کوٹڑی، کراچی اور بمبئی کے راستے کالا پانی پہنچے۔ ان کا یہ سفر نہایت اذیت ناک تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ خود بیمار تھے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ جس جہاز میں یہ سوار تھے، اس کے تمام مسافر مختلف امراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ سمندر میں طوفان آگیا، جس کے باعث جہاز تئیس (۲۳) دن کے بجائے ایک مہینہ اکیس دن میں پورٹ بلیئر پہنچا۔

۲۔ عظیم آباد کا پہلا مقدمۂ بغاوت

مولانا یحییٰ علی وغیرہ کے مقدمے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد، جو دراصل پہلا مقدمۂ بغاوت تھا، عظیم آباد (پٹنہ) میں مولانا احمد اللہ پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ یہ ترتیب کے اعتبار

---

[۵] کالا پانی ص ۴۳۔

سے دوسرا مقدمۂ بغاوت تھا۔ لیکن عظیم آباد (پٹنہ) کے دو مقدموں میں سے پہلا تھا۔

مولانا احمد اللہ اپنے علم و فضل، زہد و عبادت اور فہم و تدبر کی بنا پر عظیم آباد اور اس کے گرد و نواح میں نہایت اعزاز و احترام کے مالک تھے۔ مولانا یحییٰ علی کے بڑے بھائی تھے۔ اپنے علاقے کے رئیس اور امیر آدمی تھے۔ مولوی الٰہی بخش جعفری کے فرزند تھے۔ ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے، والد نے احمد بخش نام رکھا تھا۔ سیّد احمد شہید سے وابستگی پیدا ہوئی تو انھوں نے احمد اللہ نام رکھا اور پھر اسی نام سے شہرت پائی۔ مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور دیگر اساتذہ سے علوم دینی حاصل کیے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تقریباً تین مہینے سرکٹ ہاؤس میں نظر بند رہے۔

عظیم آباد کے اس پورے خاندان کو حکومتِ انگریزی نے مبتلائے مصیبت کر دیا تھا اور سب حضرات پر جھوٹے مقدمات قائم کر دیے گئے تھے۔ مولانا احمد اللہ کے فرزند دلبند حکیم عبدالحمید نے "شہر آشوب" کے نام سے فارسی میں ایک مثنوی لکھی تھی، جس میں اس تمام ابتلا کی تفصیل بیان کی تھی۔ اس مثنوی میں مولانا احمد اللہ کے چھوٹے بھائی مولانا یحییٰ علی کی اس سزا کا ذکر بھی دردناک انداز میں کیا ہے، جو ایک سال پہلے انبالہ میں دی گئی تھی۔

۲۹ رمضان ۱۲۸۱ھ (۲۷ فروری ۱۸۶۵ء) کو مولانا احمد اللہ کے لیے سزا کا حکم جاری کیا گیا۔ پہلے ضبطیٔ جائداد اور پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ پھر اسے حبسِ دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ مولانا کو پھانسی کے حکم سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ سزا سن کر اسی طرح خوش و خرم تھے، جس طرح کہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا یحییٰ علی تھے۔

جائداد کی ضبطی اور نیلامی

جائداد کی ضبطی اور حبسِ دوام کی سزا سے ان حضرات کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ اس قسم کی سب تکلیفیں ذاتی طور پر یہ حضرات نہایت صبر و تحمل سے برداشت کر سکتے تھے، اصل تکلیف اہل و عیال کی تھی، جو جائداد ضبط ہو جانے کی وجہ سے بے گھر ہو گئے تھے اور سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ اُن کے پاس نہ رہی تھی، گزر اوقات کا بھی

کوئی انتظام نہ تھا۔ ان کی منقولہ جائداد کی نیلامی کا مسئلہ سامنے آیا تو عظیم آباد (پٹنہ) کے مسلمانوں نے متفقہ طور پر بولی نہ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ تاہم انگریزوں نے حوشِ انتقام میں لاکھوں کی جائداد کوڑیوں میں فروخت کردی۔ نیلامی سے تقریباً ستّر سال بعد ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتیجے میں صوبہ بہار میں کانگرس کی وزارت بنی تو ۱۹۳۹ء میں حاجی پور کے دیہاتی حلقے کے رکنِ اسمبلی مسٹر بدرالحسن نے بہار اسمبلی میں ان جائدادوں کی قیمت اور نیلامی کے بارے میں سوال اٹھایا۔ کرشن بلبھ سہائے نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے:

جائداد غیر منقولہ:

	روپیہ	آنہ	پائی
۱۔ مولانا عبدالرحیم:	۱۲۸۶۶	۰	۰
۲۔ مولانا یحییٰ علی:	۲۰۶۰	۴	۰
۳۔ مولانا احمد اللہ:	۵۸۷۷۶	۴	۰
	۷۳۷۰۲	۸	۰

جائداد منقولہ:

	روپیہ	آنہ	پائی
۱۔ مولانا عبدالرحیم:	۲۳۲	۷	۱۰
۲۔ مولانا یحییٰ علی:	۶۴۵	۰	۰
۳۔ مولانا احمد اللہ:	۲۵۱۷	۱۲	۹
	۳۳۹۵	۴	۷

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ جائداد منقولہ میں ان تینوں حضرات کی کتابیں، فرنیچر، بچے، گھوڑے، پالکیاں، زیور وغیرہ بیش قیمت چیزیں شامل تھیں، جو نہایت ہی تھوڑی رقم میں نیلام ہوئیں۔

اس کے بعد ان کے مکانات منہدم کرادیے گئے اور ان کے محلے صادق پور کا

احاطہ عظیم آباد (پٹنہ) کی میونسپل کمیٹی کو دے دیا گیا۔ اس میں وہ جگہ بھی شامل تھی جسے "قافلہ" کہا جاتا تھا، اور اسے "قافلہ" اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہاں مجاہدین اور اس جماعت کے کارکن قیام کرتے تھے۔ اس تمام جگہ پر پٹنہ میونسپل کمیٹی کی عمارت تعمیر ہوئی۔

عورتوں اور بچوں کی حالتِ زار

مولانا احمد اللہ کے اہل و عیال کو عید کے دن ان کے گھروں سے نکالا گیا۔ تمام عورتیں اور بچے انتہائی پریشانی کے عالم میں تھے۔ نہ رہنے کے لیے مکان اور نہ استعمال کے لیے کوئی سامان ۔۔۔ ایک خوش حال گھرانہ بے حد بے چارگی اور بے بسی کا شکار ہو گیا تھا۔ مولانا احمد اللہ کے بیٹے حکیم عبدالحمید نے جو بہت اچھے عالم اور شاعر تھے، "مثنوی شہر آشوب" میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس مثنوی کے کچھ اشعار "سرگزشتِ مجاہدین" میں مولانا غلام رسول مہر نے درج کیے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

چوں شبِ عید را سحر کردند — ہمہ را از مکاں بدر کردند
ضبط و تاراج جملہ مال و متاع — نقد و جنس و ہمہ اثاث و زراع
بہرِ ما بود آہ جرم سخت — بُردن سوزنے زِ جملہ رخت
من نہ تنہا کہ ہمرہم تن ہا — بچگان و زنان و شیون ہا
احمد اللہ بود مجرمِ شاہ — طفلک بے گناہ را چہ گناہ
مایۂ عیش، سازِ ماتم شد، — عیدِ ما غرۂ محرم شد
زندہ بودم و لیک مُردہ صفت — ضَاقَتِ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

اب ترتیب وار ان اشعار کا ترجمہ پڑھیے:

جب عید کی رات ختم ہوئی اور ہمارے اہل و عیال نے صبح کی تو سب کو مکان سے نکال دیا گیا۔

تمام مال و متاع ضبط اور برباد ہوا۔ نقدی، غلّہ، سامان اور زراعت ہر شے ختم ہو گئی۔

ہمارے لیے آہ کرنا بھی سخت جرم تھا اور تمام سامان میں سے سوئی تک اُٹھانے کی اجازت نہ تھی۔

میں اکیلا نہ تھا، میرے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ بچے، عورتیں، اور اُن کی آہ و فریاد تھی۔

حکومت کا مجرم تو احمد اللہ تھا، بے گناہ بال بچوں کا کیا قصور تھا۔

ہماری زندگی کا سرمایہ موت کا سامان بن گیا —— ہماری عید محرم کا چاند ہو گئی۔

میں زندہ تھا، لیکن مُردوں کی سی حالت میں۔ میرے لیے زمین اپنی وُسعت کے باوجود تنگ ہو گئی۔

حکیم عبدالحمید طبابت کرتے تھے، اور اُن کا اچھا خاصا دواخانہ تھا۔ وہ بھی حکومت نے ضبط کر لیا۔ یعنی گزر بسر کے لیے کوئی چیز ان کے پاس باقی نہ رہنے دی۔ کتابیں اور کپڑے وغیرہ کوئی شے اُن کے قبضے میں نہ تھی۔ کتابوں کی ضبطی سے اُنھیں بالخصوص بہت تکلیف پہنچی، فرماتے ہیں۔

کُتبِ ملتِ مسلماناں
رفت در دستِ حرف ناخواناں

یعنی مسلمانوں کی دینی و مذہبی کتابیں اَن پڑھ لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئیں۔

مولانا احمد اللہ کو کالے پانی لے جانے کے لیے کب عظیم آباد (پٹنہ) سے روانہ کیا گیا، اس کی صحیح تاریخ کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، مولوی محمد جعفر تھانیسری اور میاں عبدالغفار سے بہت پہلے ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو وہاں پہنچ گئے تھے۔

۳۔ مالدہ کا مقدمۂ بغاوت

ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں مجاہدین کے جو مراکز قائم تھے، ان میں ایک مرکز مالدہ تھا۔ یہ مرکز صوبہ بنگال میں تھا۔ "ہمارے ہندوستانی مسلمان"

کا مصنف ڈاکٹر ہنٹر ۱۸۷۰ء کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہابیوں کی تحریک جہاد کا یہ مرکز "تقریباً تیس سال" پہلے قائم ہوا تھا[۶]۔ اس حساب سے اس مرکز کی بنیاد ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ پڑی۔ اس مرکز میں ضلع مالدہ کے علاوہ اس کے متصلہ اضلاع میں سے مرشد آباد اور راج شاہی کے بعض حصے بھی شامل تھے ——— اس کے بانی مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ایک خلیفہ مولانا عبدالرحمٰن لکھنوی تھے جو مجاہدین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں جنوبی بنگال کے ضلع مالدہ میں گئے تو وہاں خدمتِ مجاہدین کے لیے حالات سازگار معلوم ہوئے اور اس ضلع کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کر لی۔ شادی بھی وہیں کی اور مدرس کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے زمینداروں اور دیگر لوگوں نے ان سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ہنٹر کے بقول وہ انتہائی پُرجوش واعظ تھے اور بہت ہی مؤثر انداز میں لوگوں کو انگریز کے خلاف دعوتِ جہاد دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کثیر تعداد میں نوجوان ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو گئے۔ وہ لوگوں سے باقاعدہ رقمیں وصول کر کے عظیم آباد (پٹنہ) کے مرکز میں بھیجتے تاکہ یہ رقمیں سرحد کے مجاہدین کو پہنچائی جائیں[۷]۔

جو لوگ مولانا عبدالرحمٰن لکھنوی کے ماتحت بنگال کے مختلف مقامات سے رقمیں فراہم کرنے پر متعین تھے، ان میں سے ایک شخص رفیق منڈل تھے۔ کئی سال وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۸۵۳ء میں حکومت کو رفیق منڈل کے متعلق امانتِ مجاہدین کا شبہ ہوا۔ ان کی تلاشی لی گئی تو کچھ ایسے خطوط برآمد ہوئے، جن سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اُن کا تعلق مجاہدین سے ہے۔ چنانچہ اُنھیں گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ عرصے بعد وہ رہا ہوئے تو تمام جماعتی کاروبار جو وہ خود انجام دیتے تھے، اپنے بیٹے مولوی امیرالدین کے سپرد کر دیا۔

۶؎ ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۱۹

۷؎ ایضاً

مولوی امیر الدین انتہائی سرگرم آدمی تھے اور اُن کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا۔ دریائے گنگا کے دونوں کناروں اور اس کے جزیروں میں آباد مسلمانوں اور اضلاع مالدہ، مرشد آباد اور راج شاہی میں وہ نہایت اثر و رسوخ کے مالک تھے اِن کے اخلاص اور قوتِ کار کی وجہ سے سب لوگ اُن کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ——— مولوی امیر الدین نے جو لوگ جہاد کے لیے سرحد بھیجے اُن کی صحیح تعداد بتانا تو مشکل ہے، البتہ ہنٹر کا کہنا ہے کہ مجاہدین کی ایک سرحدی چوکی کے چار سو تیس آدمیوں میں سے کم و بیش دس فی صد وہابی مجاہد اِنہی کے بھیجے ہوئے تھے۔[۵]

بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں مجاہدین کے لیے بے حد تکریم کے جذبات پائے جاتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل مولانا عنایت علی عظیم آبادی اس علاقے میں بہت کام کر چکے تھے اور لوگوں پر ان کی نیکی اور مخلصانہ کارکردگی کا بے پناہ اثر تھا۔

مولوی امیر الدین پر انگریزی حکومت کے خلاف سازش اور بغاوت کا مقدمہ ۱۸۷۰ء میں مالدہ میں قائم ہوا۔ اُنھیں ضبطیٔ جائداد اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں وہ کالا پانی پہنچے۔ دس گیارہ سال کی سختی اور جلاوطنی کے بعد ۱۸۸۳ء (۱۳۰۰ھ) میں کالا پانی سے رہا ہو کر واپس وطن آئے۔

یہ تیسرا مقدمہ تھا جو انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور اعانتِ مجاہدین کے جرم میں وہابیوں کے خلاف قائم ہوا۔ انگریزوں کے نزدیک اسے "مقدمۂ بغاوت مالدہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۴۔ راج محل کا مقدمۂ بغاوت

مالدہ کے مقدمۂ بغاوت کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ۱۸۷۰ء میں وہابیوں کے خلاف

---

[۵] ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۲۲۔

چوتھا مقدمہ بغاوت راج محل میں قائم کیا گیا۔ اس مقدمے کا اصل نشانہ ابراہیم منڈل تھے جو راج محل کے نواح میں ایک مقام اسلام پور کے رہنے والے تھے۔ راج محل صوبہ بہار کی بھاگل پور کمشنری میں واقع ہے۔

ابراہیم منڈل بہت باہمت اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ عظیم آباد (پٹنہ) کے بزرگان دین سے ان کا تعلق تھا۔ جماعت مجاہدین کے سرگرم کارکن تھے۔ علاقۂ سرحد میں نقد روپے بھی بھیجتے تھے اور جہاد کے لیے آدمی بھی روانہ کرتے تھے۔ ہنٹر نے اپنی تصنیف "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں جس انداز میں ان کا ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کے لیے یہ بہت خطرناک آدمی تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ "۱۸۷۰ء میں جب وہابی تحریک کے مرکزوں پر دھاوا بولا گیا تو ابراہیم منڈل ان لوگوں میں سے تھے، جن کو خاص طور پر مقدمۂ سازش کے لیے منتخب کیا گیا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "ان کی سازش کا بیال کسی بھی کمزور حکومت کو مرعوب کرنے کے لیے کافی تھا۔"

ابراہیم منڈل کو اکتوبر ۱۸۷۰ء میں حبس دوام بعبور دریائے شور اور ضبطی جائداد کی سزا ہوئی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری جو ان دنوں خود جزائر انڈمان میں عمر قید کاٹ رہے تھے، اپنی کتاب "کالا پانی" میں تحریر کرتے ہیں:

"ایک بوڑھے اور ضعیف شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں پکڑا اور اپنے معمولی اور پرانے گواہوں سے جو چاہا گواہی دلوا کر بے چارے کو کالا پانی روانہ کر دیا۔[۹]

۵۔ عظیم آباد کا دوسرا مقدمۂ بغاوت

عظیم آباد (پٹنہ) میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور سازش کا پہلا مقدمہ ۱۸۶۵ء میں مولانا احمد اللہ کے خلاف دائر ہوا تھا۔ اس سے چھ سال بعد ۱۸۷۱ء میں دوسرا مقدمہ قائم ہوا۔ اس مقدمے میں سات ملزم تھے، جن کے نام

---

[۹] کالا پانی، ص ۱۲۱

یہ ہیں :- (۱) مولانا مبارک علی (۲) مولانا تبارک علی (۳) حاجی دین محمد (۴) حاجی امین الدین (۵) پیر محمد (۶) حشمت داد خان (۷) امیر خاں۔

ابتدائی سماعت انگریز مجسٹریٹ بار بور کی عدالت میں یکم مارچ ۱۸۷۱ء کو شروع ہوئی، ۲۷ مارچ کو فرد جرم عائد کرکے ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا گیا۔ یکم مئی ۱۸۷۱ء سے مقدمے کی سماعت مسٹر پرنسپ سیشن جج نے شروع کی۔ حکومت کی طرف سے الزام ثابت کرنے کے لیے ایک سو چھتیس گواہوں کی طویل فہرست عدالت کو دی گئی، لیکن ایک سو تیرہ آدمی پیش ہوئے۔ چھیالیس آدمیوں نے ملزموں کی طرف سے شہادت دی۔ درمیان میں کچھ دن سماعت ملتوی رہی۔ ۱۸۷۱ء کے آخر میں مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔

یہ اُنیسویں صدی عیسوی اور تیرھویں صدی ہجری کا آخری بڑا مقدمہ سازش تھا جو "بڑا دہابی مقدمہ" کے نام سے مشہور رہوا۔

اس مقدمے کے ملزم مولانا مبارک علی کو مولانا احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد صادق پور کے مرکز مجاہدین کا نگران مقرر کیا گیا تھا۔ پہلے یہ ۱۸۶۸ء میں گرفتار ہوئے، اس کے بعد ۱۸۷۱ء کے مقدمے میں پکڑے گئے اور انھیں اس قدر مبتلائے اذیت کیا گیا کہ حالت قید ہی میں وفات پا گئے۔

مولانا تبارک علی مولانا مبارک علی کے بیٹے تھے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ ۱۸۶۲ء کی جنگ میں جو سرحد میں امبیلا کے مقام پر مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف لڑی تھی، یہ اس وقت کے امیر مجاہدین مولانا عبداللہ کے ساتھ شریک جہاد تھے اور مجاہدین کے ایک دستے کی کمان ان کے سپرد تھی۔ اس جرم میں انھیں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں مولانا امیر الدین وغیرہ کے ساتھ کالے پانی پہنچے۔ دس برس قید کاٹنے کے بعد رہا ہوئے۔ حاجی دین محمد اور پیر محمد کو کئی مرتبہ گرفتار کیا گیا اور مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ اسی طرح حاجی امین الدین کو بھی بار بار پکڑا گیا اور متعدد مقدموں میں کئی دفعہ الجھایا گیا۔

اس مقدمے کے سات ملزموں میں سے حشمت داد خاں اور پیر محمد خاں کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا، لہٰذا اُنھیں ۴ رجولائی ۱۸۷۱ء کو رہا کر دیا گیا۔ باقی پانچ ملزموں کو حبس دوام لعبور دریائے شور اور ضبطیٔ جائداد کی سزا سُنائی گئی، مگر ان میں سے مبارک علی تو ہندوستان ہی میں حالتِ قید میں وفات پا گئے اور امیر خاں جن کی عمر گرفتاری کے وقت پچھتر سال تھی، آٹھ نو سال جیل میں رہے اور ۱۸۷۸ء میں رہا کر دیے گئے۔ رہائی کے وقت اُن کی عمر پچاسی سال کے لگ بھگ تھی۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ امیر خاں اور حشمت داد خاں کی طرف سے کلکتے میں چیف جسٹس نارمن کی عدالت میں ہیبس کارپس کی درخواستیں دی گئی تھیں۔ یہ درخواستیں انگریز قابل وکیلوں نے دی تھیں، مگر نارمن نے ۱۹ اگست ۱۸۷۰ء کو یہ درخواستیں مسترد کر دی تھیں۔ اس کے بعد ایک شخص عبداللہ پنجابی نے احاطۂ عدالت میں چیف جسٹس نارمن پر قاتلانہ حملہ کیا اور ۲۱ ستمبر ۱۸۷۱ء کو نارمن وفات پا گیا۔ قتل کے پس منظر کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ حملہ آور عبداللہ دماغی خرابی کے مرض میں مبتلا تھا، لیکن اس کے باوجود عبداللہ کو پھانسی کی سزا دی گئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد یہ پانچ بڑے مقدمے تھے جو انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور سازش کے سلسلے میں ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۱ء تک سات سال کے عرصے میں وہابیوں پر قائم کیے گئے۔ برِ صغیر کی سیاسی تاریخ میں یہ مقدمے، "وہابی مقدمے" کے نام سے موسوم ہوئے۔ انگریزوں کی سیاسی اصطلاح میں وہابی اور باغی دونوں لفظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے تھے، چنانچہ ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں وہابی کو باغی اور باغی کو وہابی قرار دیتا ہے۔

وہابی تحریک میں حصہ لینے والوں کو جن آلام سے دوچار کیا گیا اور جن مصائب

میں ڈالا گیا وہ برصغیر کی سیاسی تاریخ کا نہایت دردناک باب ہے۔ انھیں جیلوں میں خوف ناک سزائیں دی گئیں، اُن کی جائدادیں ضبط کی گئیں اور ان کی آمدنی کے تمام ذرائع ختم کر دیے گئے۔ حق و آزادی کی خاطر ان لوگوں نے جو قربانیاں دیں اور جو تکلیفیں برداشت کیں، اس کی تفصیلات کو الفاظ کا جامہ پہنانا ناممکن ہے۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کو جزائر انڈمان بھیجا گیا، جسے "کالا پانی" کہا جاتا ہے۔ اس موقعے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق بھی اختصار کے ساتھ کچھ عرض کر دیا جائے۔

کالا پانی

کالا پانی اپنی ہولناکیوں اور وحشت ناکیوں کے اعتبار سے ایک مشہور مقام ہے۔ گزشتہ صفحات میں متعدد مرتبہ اس کا نام آیا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں انگریزی حکومت نے تحریک مجاہدین یا وہابی تحریک کے بہت سے ارکان کو گرفتار کر کے بطور سزا کے وہاں بھیجا اور اس سزا کا نام "عبور دریائے شور" رکھا۔ اس جگہ کا دوسرا نام "انڈمان" ہے جو بحر ہند میں چھوٹے بڑے ایک ہزار جزیروں پر محیط ہے۔ مختلف جزیروں کے اس پورے مجموعے کو "جزائر انڈمان" کہا جاتا ہے۔ نقشے پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ جزائر کلکتے سے سات سو اسی میل جنوب میں، رنگون سے تین سو ساٹھ میل جنوب مغرب میں، مدراس سے سات سو چالیس میل جنوب مشرق میں اور سیلون سے اتنے ہی فاصلے پر مشرق میں واقع ہیں۔

شروع شروع میں ان جزیروں کے متعلق لوگوں میں بہت سے ہیبت ناک اور خوف ناک افسانے مشہور تھے۔ ستمبر ۱۷۸۹ء کو انگریزوں نے پہلی مرتبہ ان جزیروں میں قیدیوں کی نوآبادیاں بنانے کا منصوبہ بنایا۔ لیفٹیننٹ بلیئر پہلا انگریز ہے جو وہاں کچھ قیدیوں کو لے کر گیا، اور اسی کے نام پر جزیرے کے دارالحکومت کو "پورٹ بلیئر" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا اس قدر خراب اور مُضر صحت تھی کہ سات سال بعد ۱۷۹۶ء میں اس منصوبے پر عمل درآمد کا سلسلہ ترک کر دیا گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اس کی آبادی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس جنگ میں شامل ہونے والے جن لوگوں کو انگریزی حکومت نے لمبی قید کی سزائیں دیں وہ درحقیقت سیاسی قیدی تھے، اس لیے کہ انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے باقاعدہ جنگ لڑی تھی یا یہ کہ آزادیٔ وطن کے لیے میدانِ جہاد میں اُترنے کا ان پر الزام عاید کیا گیا تھا۔ انگریزی حکومت ان کو ملک کے عام جیل خانوں میں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ ان کے افکار و خیالات سے دوسرے قیدی بھی اثر پذیر ہوں گے اور جیل کی فضا خراب ہوگی۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ جزائر انڈمان کو دوبارہ آباد کیا جائے اور ۱۸۵۷ء کے قیدیوں کو وہاں بھیجا جائے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ان جزائر کی فضا، آب و ہوا اور زمین انسانی آبادی کے قطعاً قابل نہ تھی اور اس کا تجربہ ہو چکا تھا، لیکن اس کے باوجود انگریزی حکومت نے ان اسیرانِ حریت کو وہیں بھیجنا ضروری سمجھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حکومت ان سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ قید کے دوران قیدیوں کے جسمانی تحفظ اور صحت کی ذمے داری حکومت کے فرائض میں شامل ہوتی ہے، مگر اس کی انگریزوں نے کوئی پروا نہیں کی اور انھیں ایسی جگہ بھیجا جو ان کی صحت کے لیے ہر اعتبار سے تباہ کن تھی۔ ۱۸۵۷ء کے قیدیوں کی اس طویل فہرست میں بعض ایسی اُونچی شخصیتیں بھی شامل تھیں، جن کو دوبارہ وطن آنا نصیب نہ ہوا۔ مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی نے وہیں انتقال کیا اور وہ اسی سرزمین میں مدفون ہوئے۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے لکھا ہے کہ ۱۸۶۱ء میں "غدر" کے تقریباً ایک ہزار قیدی رہا کر دیے گئے تھے، جن کے خلاف نہ قتل کا کوئی الزام تھا اور نہ انھوں نے تحریک ۱۸۵۷ء میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ ان کے علاوہ مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ "غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسیوں راجے اور نواب اور زمیندار، مولوی، مفتی، قاضی، ڈپٹی کلکٹر، منصف، صدر امین صدر الصدور، رسالدار، صوبیدار، جمعدار

وغیرہ وہاں قید ہیں[۱۰]۔"

۱۸۵۷ء کے بعد پانچ "وہابی سازش مقدمات" کے ان مجرموں کو جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، انڈمان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ انڈمان میں ان کے ساتھ کیا برتاؤ ہوا، اور انھیں کیا کیا مصائب برداشت کرنا پڑے، اُس کا ہلکا سا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے کیا جا سکتا ہے:

مولانا احمد اللہ

ان حضرات میں ایک بزرگ مولانا احمد اللہ تھے، جن کے مقدمے اور جرم کے بارے میں گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ انھیں ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو عظیم آباد (پٹنہ) سے پورٹ بلیئر پہنچایا گیا تھا۔ یعنی جو عالی ہمت لوگ مجاہدین کی امداد و اعانت کے جرم میں ماخوذ تھے، ان میں سے انڈمان (کالا پانی) پہنچنے والے یہ سب سے پہلے بزرگ تھے۔ اس زمانے میں ایک صاحب سید اکبر زمان اکبرآبادی چیف کمشنر انڈمان کے میر منشی تھے[۱۱]۔ انھوں نے مولانا کے علمی و عملی اور خاندانی حالات سے پوری واقفیت حاصل کر لی تھی۔ وہ چیف کمشنر سے اجازت لے کر مولانا کو اپنے مکان پر لے گئے جو انڈمان کے ایک جزیرے "رُوس آئی لینڈ" میں تھا۔ پھر اس کے بعد اپنے قریب ہی اُن کے لیے ایک اور مکان کا بندوبست کر دیا، اور چیف کمشنر کی کچہری میں اپنے ماتحت لکھنے پڑھنے کا کام بھی اُن کو دلا دیا۔ اس طرح ان کی قید کے ابتدائی پانچ سال کسی قدر اطمینان سے گزر گئے۔

۱۰؎ کالا پانی ص ۹۹

۱۱؎ سید اکبر زمان عمدہ خصائل اور شریف آدمی تھے۔ وہابی مقدمات کے تمام لوگوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہندوستان میں قلعہ آگرہ کے فوجی محکمے میں میر منشی تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی بنا پر بیس سال قید کی سزا ہوئی۔ انڈمان میں قید کی مدت پوری ہونے کے بعد ۱۹۰۴ء میں آگرہ آئے اور یہیں وفات پائی۔

۸ فروری ۱۸۷۲ء کو ہندوستان کا وائسرائے لارڈ میو انڈمان کے دورے پر گیا اور اُسی دن رات کے وقت ایک مسلمان قیدی شیر علی نے اُسے قتل کر دیا (جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آ رہی ہے) اس کے بعد تمام مسلمان قیدیوں، بالخصوص وہابی مقدمات کے اسیروں پر سختی شروع ہو گئی — ان لوگوں کو دور دراز جزیروں میں بھیج دیا گیا۔ مولانا احمد اللہ کو وائپر آئی لینڈ لے جایا گیا جہاں نہایت خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا تھا، وہاں محکمہ طبابت میں محرری کا کام ان کے سپرد کیا گیا، اور راشن کے علاوہ دس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ہسپتال کے قریب مکان بھی دیا گیا اور خدمت کے لیے ملازم بھی — ! سرکاری فرائض انجام دینے کے بعد ان کا زیادہ وقت تلاوت قرآن مجید، نماز، ذکر الٰہی اور تسبیح و استغفار میں صرف ہوتا۔ وہ بہت بڑے مبلغ تھے۔ اپنے ساتھیوں کو اللہ کی توحید کا درس دیتے اور نیکی کی تلقین فرماتے۔ ان کے ساتھ رہنے والے قیدی تو ان کی نیکی و تدین سے اثر پذیر تھے ہی، پولیس والے اور وہ فوجی جو ان کے قریب رہتے تھے، وہ بھی ان سے نہایت متاثر ہوئے اور ان میں سے ہر شخص نماز روزے کا پابند، تہجد گزار، توحید کا دلدادہ اور پکا مومن بن گیا۔

مولانا مرحوم بہت سے اوصاف کے مالک تھے۔ متقی، بلند کردار، سخی اور سب کے ہمدرد تھے۔ جو کچھ پاس ہوتا مستحق اور غریبوں کو دے دیتے۔ آخر میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ مسلسل بخار کی وجہ سے چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ مولانا عبدالرحیم (جن کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے اور آگے بھی آ رہا ہے) ان کے عزیز تھے، وہ کئی میل کا سفر طے کر کے ان کے پاس جاتے اور خدمت کرتے۔ بالآخر صبر و استقلال کے اس پیکر نے ۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ (۲۱ نومبر ۱۸۸۱ء) کو رات کے آٹھ بجے وفات پائی۔ ان کے ملازم کا نام عبدالواحد تھا۔ اس کا بیان ہے کہ آخری وقت میں آنکھ کھولی، "الا اللہ یا مالک الملک" کہا اور سرد ہو گئے۔[۱۲] مولانا عبدالرحیم، مولانا محمد جعفر تھانیسری،

---

[۱۲] کالا پانی۔ ص ۱۲۷

میاں عبدالغفار، سید اکبر زمان، مولوی محمد جان اور دوسرے حضرات کو اطلاع ہوئی تو وہاں پہنچے اور تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔

اس سے قبل مولانا احمد اللہ کے چھوٹے بھائی مولانا یحییٰ علی ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ (۲۰ فروری ۱۸۶۸ء) کو وفات پا چکے تھے، اور انھیں جزیرہ روس آئی لینڈ میں دفن کیا گیا تھا۔ کوشش کی گئی کہ انھیں بھی وہیں بھائی کے پہلو میں دفن کیا جائے لیکن حکومت نے اجازت نہیں دی۔ مجبوراً اُن کو ڈنڈاس پائنٹ میں سمندر کے کنارے ایک ٹیلے پر جہاں چند قبریں اور بھی تھیں، سپردِ خاک کر دیا گیا۔ مولانا عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ وہ مقام انتہائی وحشت ناک تھا۔ ایک طرف لمبے لمبے جنگلی درخت آسمان کو چھو رہے تھے، دوسری طرف سمندر کی موجیں جو اُونچائی میں پہاڑ کی مانند دکھائی دیتی تھیں، جزیرے سے آکر ٹکراتی تھیں۔ یہ تمام منظر انتہائی خوف ناک اور دل ہلا دینے والا تھا — ایسی حالت میں ہم لوگ ایسے دُرِّ یتیم کو ایسے لعلِ شب چراغ کو، ایسے یاقوتِ احمر کو اپنے ہاتھوں مٹی میں دبا کر آہِ سرد بھرتے ہوئے، باچشمِ گریاں و دلِ بریاں اپنی اپنی جگہوں پر واپس آئے۔[۳۱]

مولانا یحییٰ علی:

مولانا موصوف "انبالہ وہابی سازش کیس کے" مجرم تھے۔ وہ انبالہ سے لاہور، ملتان کراچی اور بمبئی وغیرہ ہوتے ہوتے ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو انڈمان پہنچے۔ چیف کمشنر انڈمان کے میر منشی سید اکبر زمان نے انھیں بھی اپنے پاس جزیرہ "روس آئی لینڈ" میں رکھا۔ اس طرح مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی دونوں بھائی ایک ہی جگہ رہنے لگے۔ تبلیغ دین، اشاعتِ اسلام اور اصلاحِ عوام کے لیے مولانا یحییٰ علی بھی اسی طرح کوشش کرتے جس طرح ان کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ کرتے تھے۔ اوقاتِ فرصت میں لوگوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم دینا اور نیکی کی تلقین کرنا ان کا بنیادی کام تھا۔

۳۱؎ تذکرہ صادقہ، ص ۵۷۔

نہایت صابر و شاکر بزرگ تھے۔ پہلے پھانسی اور ضبطیٔ جائداد کا حکم سُنایا گیا۔ اس کے بعد پھانسی کی سزا عبور دریائے شور میں بدل دی گئی، مگر ضبطیٔ جائداد کا حکم بدستور باقی رہا۔ تمام جائداد نیلام کر دی گئی، مکانات خالی کرا لیے گئے، عورتوں اور بچوں کو گھروں سے نکال دیا گیا۔ تمام مال و اسباب، کتابیں اور مسوّدے ضبط کر لیے گئے۔ جن مکانوں میں یہ لوگ کئی پُشتوں سے سکونت پذیر تھے، انھیں مسمار کر دیا گیا۔ خاندانی قبرستان بھی کھدوا دیا گیا اور مُردوں کی ہڈیاں قبروں سے نکلوا کر باہر پھینک دی گئیں۔ یہ بہت بڑی مُصیبتیں تھیں جو ان پاک باز حضرات نے برداشت کیں۔ یہ عظیم قربانیاں محض سیاست کے لیے نہ تھیں۔ یہ تقاضائے فرض تھا اور اس کا مقصد صرف اللہ اور رسُول ﷺ کی رضامندی و خوشنودی تھا۔ کوئی دنیوی مفاد اس میں ہرگز نہ تھا، بلکہ اس لحاظ سے سراسر نقصان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مصائب و آلام کو انھوں نے نہایت تحمل سے برداشت کیا۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔

گھر میں پیش آنے والے حوادث سے مطلع ہونے کے بعد انڈمان سے جو خط اہلیہ محترمہ کو تحریر فرمایا وہ لائقِ مطالعہ ہے، لکھتے ہیں:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ

یحییٰ علی کی طرف سے، بخدمت اُمِّ حبیبہ اُمِّ محمد یوسف سلمہا اللہ تعالیٰ۔

ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نورِ چشم محمد حسن مدعمرہٗ کے، حال انہدام دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا، اور صدمہ بہت گزرا۔ کیونکہ سکونت قدیم سے، خصوصاً وہ مکان کہ جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو، اور کاروبارِ فریضہ بہت اجرا پائے ہوں، مومنین کو انس و محبت بطورِ اہل و عیال کے ہوتی ہے۔

اسی روز شب کو رُوحِ انور حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ تبسم کناں فرمانے لگے کہ البتہ انہدام سے مکانوں کے، مالکان کو خصوصاً نسواں کو رنج والم بہت ہوا ہے، اور ہونے کی جگہ ہے، اور ان آیاتِ کریمہ کو زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ
رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝[14] رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا
صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۝[15]
عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا
رٰغِبُوْنَ ۝[16]

اور فرمایا ان آیات کو وردِ زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجد اقصیٰ اور مکاناتِ انبیاء علیہم السلام بخت اور جالوت کے ہاتھ سے انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیاً منسیا ہو گئے اور یہ اماکنِ متبرکہ از سرِ نو بنا ہوئے اور پہلے سے زیادہ آباد ہوئے۔ تم بھی اپنے ربّ کے فضل سے ایسی ہی اُمید رکھو۔ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے۔

---

[14] یہ سورۃ البقرہ کی آیات نمبر ۱۵۵ تا ۱۵۷ ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:۔ اور جو لوگ صبر کرنے والے ہیں، اُنھیں کامیابی کی بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی ان پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو ان کی زبانِ حال کی صدا یہ ہوتی ہے:۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (کہ ہم تو مال و اولاد سمیت اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب دنیا سے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جانے والے ہیں) سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم کی بارش ہوتی رہتی ہے اور وہی اس کی رحمت کے حق دار ہیں اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ہیں۔

[15] یہ سورہ الاعراف کی آیت نمبر ۱۲۶ ہے، اور اس کا ترجمہ یہ ہے:۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں صبر کی محنت سے شادکام فرما، اور ہمیں اسلام کی حالت میں اس دُنیا سے اُٹھا۔

[16] یہ سورہ القلم کی آیت نمبر ۳۲ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:۔ شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس کا اچھا بدلہ دے ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

بعد اس مکاشفہ کے میں نے بہت انشراح و تسکین پایا اور اپنے بڑے بھائی (مولانا احمد اللہ صاحب) کو آگاہ کیا۔

دریائے عشقِ خالقِ ہر دو جہاں میں ہم
نام و نشان دارِ فنا کے ڈبا چکے

کفنی گلے میں ڈال کے تسمہ کمر کے بیچ
جوگی ہوئے ہیں محرمِ اسرار کے لیے

اے خدائے من، فدایت جانِ من جملہ فرزندان و خاندانِ من[17]

کالے پانی پہنچنے کے تقریباً دو سال بعد مولانا ممدوح بیمار ہو گئے اور قانون کے مطابق ہسپتال میں ڈاکٹری علاج ہونے لگا۔ مولانا عبدالرحیم (جو ان کے بھانجے تھے) حکامِ بالا کی اجازت سے کچھ دیر اپنا کام کرتے اور کچھ دیر مولانا کی خدمت میں گزارتے۔ بیماری کے دنوں میں بھی مولانا کا یہ معمول رہا کہ جو لوگ عیادت کے لیے آتے انھیں پند و نصیحت فرماتے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ زندگی کے آخری لمحے تک انجام دیتے رہے۔

بیماری اگرچہ زیادہ نہ تھی تاہم اس کی تکلیف ضرور تھی۔ بڑے بھائی مولانا احمد اللہ دن میں دو مرتبہ مزاج پرسی کے لیے آتے۔ ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ کو طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوئی تو مولانا احمد اللہ کو بھی بلالیا گیا اور مولانا عبدالرحیم بھی آگئے۔ زبان پر اللہ کا ذکر جاری تھا اور ہوش بجا تھے کہ اسی دن یعنی ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ (۲۰ فروری ۱۸۶۸) کو

---

[17] اقتباس از مکتوب مولانا یحییٰ علی جو ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۳ھ کو یکشنبہ کے روز انڈمان سے اپنی اہلیہ محترمہ کے نام ارسال فرمایا: بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ ج ۴، ص ۱۵۶ تا ۱۵۸۔

رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ کالا پانی جاکر دو سال ایک مہینہ اور نو دن زندہ رہے۔ وفات ہسپتال میں ہوئی تھی، اس کے بعد میّت کو گھر لے گئے۔ سید اکبر زمان نے چیف کمشنر سے اجازت لے کر تمام جزیروں میں اعلان کرا دیا تھا کہ جو لوگ تکفین و تدفین اور نمازِ جنازہ میں شریک ہونا چاہیں، ان کے مکان پر پہنچ جائیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی مثرزِ تمام اور متعین وقت پر پہنچ گئے۔ پانچ ہزار کے قریب لوگ اس مردِ مجاہد کی خبر وفات سن کر اُن کے گھر پہنچے۔ نمازِ جنازہ کئی مرتبہ پڑھی گئی اور اس پیکرِ عزیمت کو انڈمان کے جزیرہ روس آئی لینڈ میں دفن کیا گیا۔

مولوی کبیر احمد پھلواروی نے مندرجہ ذیل اشعار میں تاریخِ وفات کہی:

چونکہ یحییٰ علی ستودہ خصال — عالم و زاہد و محدث بود
روحِ پاکش گزاشت مجلسِ تن — راہِ ملکِ وصالِ حق پیمود
گشت راضی خدائے پاک ازو — عزتش پیشِ قدسیاں افزود [۱۸]
ہاتفے سالِ او ز روئے الم — رضی اللّٰہ ربہ فرمود
۱۲۸۴ھ

مولانا عبدالرحیم

وہابی سازش کے پہلے اور دوسرے مقدمے کے اسیروں میں سے مولانا عبدالرحیم تمام اسیروں کے بعد انڈمان پہنچے۔ یہ مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی کے بھانجے تھے۔ سید اکبر زمان اکبر آبادی نے (جن کا ذکر ایک سے زیادہ مرتبہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے) ان کے قیام کا انتظام بھی مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی مکان میں کر دیا تھا۔ انھیں بھی محرری کا کام دیا گیا، جس کی تنخواہ چھ روپے ماہانہ تھی۔ ان کے رفیقِ کار ایک بزرگ سید انشاء اللہ تھے جو ہندوستان کے ایک مقام باندہ

۱۸۔ سرگزشتِ مجاہدین ص ۳۴۴۔

کے رہنے والے تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے سلسلے میں قید ہو کر کالے پانی پہنچے تھے۔ یہ بہت ضعیف ہو گئے تھے اور مولانا عبدالرحیم ازراہِ ہمدردی اُن کے کام میں ان کی مدد کرتے تھے۔ اس کے بعد مولانا کو دوسرے محکمے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اُنھوں نے حکام کی اجازت سے ایک دکان دار کے ساتھ مل کر تجارت بھی شروع کر دی تھی۔

لارڈ میو کے قتل کے بعد (جس کا ذکر آگے آئے گا) وہابی سازش مقدمات اور ۱۸۵۷ء کے سلسلے کے مسلمان قیدی ہدفِ عتاب بنے تو مولانا عبدالرحیم کو بھی ایک دُور افتادہ مقام پر بھیج دیا گیا۔ جس انگریز افسر کے ماتحت یہ کام کرتے تھے، وہ انتہائی سخت مزاج تھا۔ مولانا نے محنت اور مستعدی سے کام کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے جسم پر کسی بیماری کی وجہ سے کثرت سے سیاہ دھبے پڑ گئے تھے۔ وہ خود ڈاکٹر تھا، لیکن اپنی اس بیماری کا علاج نہ کر سکا۔ اس کے باورچی نے اُسے بتایا کہ مولانا کے پاس اس مرض کی دوا ہے۔ چنانچہ اُس نے مولانا سے کہا اور مولانا نے ایک خاص ترکیب سے روغن لوبان کشید کر کے اُسے دیا، جس کے استعمال سے تمام داغ دھبے دُور ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مولانا پر اور مہربان ہو گیا، بلکہ محکمہ صحت کے حکام سے اس دوا کو سرکاری شفاخانے میں رکھنے کی درخواست کی، لیکن یہ درخواست اس وجہ سے منظور نہ ہوئی کہ اس سے حکومت کے ایک مسلمان باغی قیدی کا اعزاز وقت کے تمام انگریز ڈاکٹروں سے بڑھ جائے گا۔

تقریباً اٹھارہ سال بعد ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لارنس نے مولانا کے حبسِ دوام کا حکم منسوخ کر دیا، لیکن حکم ثانی جاری ہونے تک بدستور انڈمان میں رہنے کا فیصلہ صادر کیا گیا۔ اس کے بعد لارڈ رپن نے جزائر انڈمان کے ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جنھیں اعانتِ مجاہدین کے سلسلے میں سزائیں دی گئی تھیں۔ اس کے بعد یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۰۰ھ (۱۰ مارچ ۱۸۸۳ء) کو سوا اُنّیس سال بعد مولانا وطن پہنچے۔

ان کے خاندانی مکانات جو محلہ صادق پور میں تھے گرا دیے گئے تھے اور وہ تمام جگہ پٹنہ کی میونسپل کمیٹی کو دے دی گئی تھی، اب وہاں بازار بن چکے تھے اور کمیٹی کی عمارت تعمیر ہو گئی تھی۔ ان کے خاندانی قبرستان کا بھی نام و نشان باقی نہ رہا تھا۔ اہل و عیال "محلہ تمرہیہ" میں جا بسے تھے۔ پٹنہ پہنچنے کے بعد دوسرے دن مولانا اپنے مکانوں کی جگہ پر گئے تو نقشہ بالکل بدل چکا تھا۔ یہ دیکھ کر اُن کو سخت ذہنی کوفت ہوئی اور وہاں کھڑے ہو کر انتہائی درد انگیز لہجے میں یہ شعر پڑھے:

یا منزلا لعب الزمان باھلہ ۔۔۔ فاباد ھم بتفرق لا یجمع
ان الذین عھدتھم بک مرۃ ۔۔۔ کان الزمان بھم یضر وینفع
اصبحت تفزع من یراک وطالما ۔۔۔ کنا الیک من المعاول نفزع
ذھب الذین یعاش فی اکنافھم ۔۔۔ بقی الذین حیاتھم لا تنفع

ان اشعار کا ترتیب وار ترجمہ یہ ہے:

اے وہ منزل جس کے رہنے والے زمانے کی دستبرد کا شکار ہوئے اور انھیں اس طرح منتشر کر دیا گیا کہ پھر جمع ہونے کی توقع نہیں۔

وہ جنھیں کبھی تیری آغوش میں آسودہ حال دیکھا تھا، زمانہ ان کے سہارے نفع نقصان پہنچاتا تھا۔

جو تجھے اب دیکھتا ہے، گھبرا اُٹھتا ہے، کبھی یہ حالت تھی کہ مشکلات سے گھبرا کر ہم تیری آغوش میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔

وہ لوگ تو گزر گئے جن کے سائے میں اصل زندگی تھی۔ اب وہ باقی رہ گئے ہیں جن کی زندگیاں کسی بھی کام کی نہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے یہاں آکر شہر کا رنگ ڈھنگ، اسلوبِ زیست، لباس و پوشاک اور تمام طرزِ معاشرت یک قلم بدلا ہوا پایا تو رہائی پر از حد افسوس ہوا۔ کاش میں بھی انڈمان کی زمین میں مر جاتا تو حشر کے روز اپنے دونوں ساتھیوں (مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی) کے ساتھ اُٹھنے کی سعادت حاصل کرتا۔[19]

۱۹۔ [illegible]

مولانا عبدالرحیم جوں ہی پٹنے پہنچے، سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پابندی عائد کر دی کہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو کچہری میں حاضری لکھوائی جائے اور اجازت کے بغیر شہر سے باہر نہ جائیں۔ اگر کہیں جائیں تو وہاں کی قریبی پولیس چوکی یا تھانے میں اطلاع دیں۔ سات برس تک یہ پابندی قائم رہی۔ ملک سے باہر جانے کے لیے اجازت لینا ضروری تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں باہر جانے کے لیے پروانہ راہداری لینے کا کوئی قانون نہ تھا۔ انھوں نے دو حج کیے۔ پہلی مرتبہ ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) میں اور دوسری مرتبہ ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۴ء) میں۔

اس جلیل القدر عالم اور عظیم مجاہد نے ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ (۲۴ اگست ۱۹۲۳ء) کو تقریباً نوّے برس کی عمر میں نمازِ مغرب سے قبل وفات پائی۔

"تذکرۂ صادقہ" جس کا دوسرا نام "الدر المنثور فی تراجم اہل صادق پور" ہے، انھی کا مرتب کردہ ہے۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ "مولانا ابوالکلام آزاد بھی مولانا عبدالرحیم سے ملے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ پٹنہ گیا اور مولوی مظہر الحق بیرسٹر کے مکان پر ٹھہرا تو مولانا عبدالرحیم نے پیغام بھیجا کہ ملنے کے لیے آنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ آگئے اور کچھ دیر بات چیت کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن میں اُن کی ملاقات کے لیے گیا۔ بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔"[۲۰]

مولانا محمد جعفر تھانیسری

مولانا محمد جعفر نے ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (۱۶ جون ۱۸۶۲ء) سے اپنے حالات قلم بند کرنا شروع کیے تھے جو ان کے مکان وغیرہ کی تلاشی کے وقت ارکانِ حکومت کے ہاتھ لگے۔ ان حالات سے پتا چلتا ہے کہ مولانا موصوف کی ولادت ۱۸۳۷ء کے لگ بھگ ہوئی۔ دس سال کی عمر تک کوئی تعلیم حاصل نہ کی۔ بارہ سال کے ہوئے تو ان کے والد

---

۲۰ سرگزشت مجاہدین، ص ۳۹۴۔

میاں جیون وفات پا گئے۔ اس وقت ان کا چھوٹا بھائی محمد سعید صرف چھ مہینے کا تھا۔ والد کی وفات کے بعد تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔ چند کتابیں پڑھیں تو عرائض نویسی شروع کردی۔ بہت ذہین اور معاملہ فہم تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ کمال حاصل کرلیا تھا کہ تمام عرائض نویس اور وکلا، عدالتی قواعد و ضوابط کو سمجھنے اور بعض قانونی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ان سے مشورہ لینے لگے تھے۔

ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور محنت کرکے تھانیسر میں اچھی خاصی جائداد پیدا کرلی تھی۔ انگریزی حکومت کے ہمیشہ مخالف رہے اور آزادیٔ وطن کو اپنا نقطۂ نظر قرار دیے رکھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جب کہ بیس سال کی عمر تھی اور بھرپور جوانی کا عالم تھا، دس بارہ ہم خیال لوگوں کو ساتھ لے کر انگریزوں سے لڑنے کے لیے دہلی پہنچے۔ لیکن جب انگریزوں کا دہلی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا تو واپس آ گئے اور معمول کے مطابق اپنا کام شروع کر دیا۔ شادی پانی پت میں ہوئی۔ گرفتاری کے وقت ان کی تین اولادیں تھیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ بڑا بیٹا باپ کے زمانۂ قید میں انتقال کر گیا تھا۔ چھوٹا بیٹا، بیٹی اور بیوی رہائی کے وقت زندہ تھے۔

مولانا محمد جعفر ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو مولانا یحییٰ علی اور میاں عبدالغفار کے ساتھ انڈمان پہنچے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُدھر انڈمان کے ساحل پر جہاز سے اُترے اور اِدھر سید اکبر زمان کی کوشش سے چیف کمشنر کی کچہری میں نائب میر منشی مقرر ہو گئے۔ رہنے کو مکان اور خدمت کو نوکر ملا۔ کہیں قیام کرنے اور آنے جانے کی مطلق روک ٹوک نہ تھی۔ اہلیہ کو قانون کے مطابق وطن سے بُلانے کے لیے حکومت سے درخواست کی۔ لیکن حکومت نے یہ درخواست منظور نہ کی۔ اس زمانے میں ایک کشمیری خاتون کسی مصیبت میں پھنس کر قیدی کی حیثیت سے انڈمان میں مقیم تھی، مولانا نے اس سے نکاح کر لیا۔ لیکن یہ بیوی ۳۰ اپریل ۱۸۶۸ء کو فوت ہو گئی۔

اسی دوران الموڑہ (ہندوستان) کے ایک برہمن خاندان کی عورت وہاں پہنچی جسے خاندان

کے لوگوں نے کسی دشمنی کی بنا پر قتل کے الزام میں کالے پانی کی سزا دلوا دی تھی، مولانا نے اسے مسلمان کر کے اس سے نکاح کر لیا۔ اس سے آٹھ بچے پیدا ہوئے۔

مولانا نے وہاں انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ ان کے سوا مسلمان قیدیوں سے کوئی بھی انگریزی نہ جانتا تھا۔ عرائض نویسی بھی کرتے تھے، انگریزوں کو اردو بھی پڑھاتے تھے اور تھوڑی بہت تجارت بھی کرتے تھے، جس سے انھوں نے ہزاروں روپے کمائے۔ مسلمان قیدیوں کو ان کی قابلیت سے بہت فائدہ پہنچا۔

اپنی مشہور کتاب "کالا پانی" میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۱ء میں ان کے دل میں یہ خیال کروٹ لینے لگا تھا کہ جلد ہی رہائی پا کر ہندوستان چلے جائیں گے۔ چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۸۸۲ء کو ان کی رہائی کا حکم جاری ہو گیا۔ سب سے پہلے یہ اطلاع پانی پت میں اُن کی بیوی کو ملی۔ ۲۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو یہ حکم کالے پانی پہنچا۔ لیکن ان کی انڈمان والی اہلیہ کی مدتِ قید ابھی پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے حکومت سے اجازت لے کر اس کی رہائی کا حکم آنے تک وہاں مزید کچھ عرصہ ٹھہرنا پڑا۔ اس اثنا میں اپنا سامان فروخت کیا۔ مکان وقف کر کے اس کی مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے، لیکن ڈپٹی کمشنر نے اس کی منظوری نہ دی۔

بیوی کی رہائی کا حکم آیا تو ۹ نومبر ۱۸۸۳ء کو انڈمان سے روانہ ہوئے۔ جس جہاز میں سوار ہوئے، اس میں ایک بڑا تاجر بھی سفر کر رہا تھا، جس کا نام علی رضا تھا، اس نے جہاز میں ان کی بہت خدمت کی۔ ۱۳ نومبر ۱۸۸۳ء (۱۴ محرم ۱۳۰۱ھ) کو کلکتے پہنچے۔ وہاں چینا پاڑا میں مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے) کے بھائی مولوی عبدالرؤف مقیم تھے، دو روز اُن کے ہاں قیام کیا۔ پھر الٰہ آباد، کان پور، علی گڑھ اور سہارن پور ہوتے ہوئے ۲۱ نومبر ۱۸۸۳ء کو رات کے نو بجے انبالہ چھاؤنی کے سٹیشن پر پہنچے — ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو اپنے گھر تھانیسر سے نکلے تھے، کچھ دن کم بیس سال بعد وطن واپس آئے۔ بے چارگی کی حالت میں اکیلے گھر سے روانہ ہوئے تھے، اب واپس آئے تو ایک بڑا کنبہ جو ایک بیوی اور آٹھ بچوں پر مشتمل تھا، ان کے ساتھ تھا۔ علاوہ ازیں آٹھ ہزار روپے نقد ان کے پاس تھے۔

ان کا ایک انگریز شاگرد کپتان ٹمپل تھا، جو رہائی کے زمانے میں انبالہ چھاؤنی میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس کو استاد کی رہائی اور واپسی کا پتا چلا تو خط لکھا کہ اگر میرے پاس قیام کرنا پسند کریں تو ضمانت دے کر حکومت سے اجازت لے سکتا ہوں، چنانچہ وہ انبالہ چھاؤنی چلے گئے۔ ٹمپل انھیں بیس روپے ماہانہ خود دیتا تھا اور تیس روپے بعض دوسرے انگریزوں کو پڑھانے سے مل جاتے تھے۔ اس طرح پچاس روپے ماہانہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ جب تک ٹمپل انبالہ چھاؤنی میں رہا، انھیں کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ اس کا تبادلہ ہو گیا تو ان پر کئی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ لیکن فروری ۱۸۸۸ء میں حکومت نے خود ہی تمام پابندیاں اُٹھا دیں اور وہ مختلف مقامات اور شہروں میں آنے جانے لگے۔ ہر جگہ کے مسلمان ان کا نہایت احترام کرتے تھے۔[۲۱]

۱۸۹۵ء میں نزہتہ الخواطر کے فاضل مصنف مولانا سید عبدالحی رائے بریلوی دہلی، پانی پت، سرہند، انبالہ، دیوبند، گنگوہ وغیرہ کے سفر پر گئے تو انبالہ میں مولانا محمد جعفر کے مکان پر بھی گئے۔ لیکن مولانا کچھ روز پیشتر ریاست پٹیالہ کے ایک مقام "کھرڑلہ" تشریف لے گئے تھے، اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔[۲۲]

مولانا نے کئی کتابیں تصنیف کیں جنھیں تحریک آزادیٔ وطن کے سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ اس موضوع پر کتب حوالہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ متفرق رپورٹیں یا مجموعہائے ضوابط بھی تحریر کیے۔ علاوہ ازیں تین اہم کتابیں یادگار چھوڑیں جن کا مختصر تعارف یہ ہے :۔

۱۔ **تاریخ عجیب** :۔ یہ جزائر انڈمان کی تاریخ ہے، جس میں جزیروں کی جغرافیائی تفصیلات بھی بیان کی ہیں اور اُن کی آبادکاری کی عہد بہ عہد کیفیت بھی تحریر کی ہے۔ کتاب کے آخر میں اختصار کے ساتھ ان تمام زبانوں کی بول چال کا مرقع درج

---

۲۱ سرگزشت مجاہدین، ص ۴۴۲۔

۲۲ ماہانہ "معارف" مارچ ۱۹۳۹ء

کیا ہے جو انڈمان میں بولی جاتی تھیں، مثلاً اُردو، عربی، فارسی، ترکی، ساحلی، پشتو، مکرانی، بوچی، سندھی، نکوباری، مرہٹی، بنگالی، برمی، چینی، کشمیری، پنجابی وغیرہ — انڈمان کے زمانۂ قید میں انھوں نے وہاں کی تقریباً تمام بولیاں سیکھ لی تھیں۔ یہ کتاب حکومت کی منظوری سے ۱۸۷۹ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ نے شائع کی تھی۔

۲۔ **تواریخ عجیب** :۔ یہ کتاب "کالا پانی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی گرفتاری، مقدمے، قید، سفر انڈمان، اسیری کی زندگی اور رہائی کی پوری سرگزشت بیان کی ہے۔ ضمناً اپنے رفقا کے حالات بھی تحریر کر دیے ہیں۔

۳۔ **سوانح عجیبہ** :۔ یہ کتاب سید احمد شہید اور اُن کے اکابر خلفا کے حالات پر مشتمل ہے۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے غالباً ۱۹۰۵ء میں وفات پائی۔ اُن کے فرزند ارجمند مولوی محمد اسماعیل وکیل انبالہ، ۱۹۴۷ء کے فسادات میں غیر مسلموں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔[۲۳]

میاں عبد الغفار

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے، میاں عبد الغفار عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے تھے اور وہابی سازش کے مقدمۂ انبالہ میں ماخوذ اور قید ہوئے تھے۔ ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو مولانا یحییٰ علی اور مولانا محمد جعفر کے ساتھ انڈمان پہنچے — انھوں نے مارچ ۱۸۷۲ء میں حکومت سے درخواست کر کے بیوی اور دولڑکوں کو اپنے پاس بُلا لیا تھا رہائی کے بعد اہل و عیال کے ساتھ عظیم آباد واپس آ گئے۔ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) کے قریب وفات پائی۔

مولوی امیر الدین

مولوی امیر الدین کو مالدہ کے مقدمۂ وہابی سازش میں حبسِ دوام اور ضبطیٔ جائداد کی سزا ہوئی تھی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان بھیجے گئے۔ اس وقت وہاں نئے قانون

۲۳ے سرگزشت مجاہدین، ص ۴۴۲۔

جاری ہو چکے تھے جو بہت سخت تھے۔ ان کی رُو سے وہ تمام مراعات ختم ہو گئی تھیں، جو اس سے قبل قیدیوں کو حاصل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی امیر الدین کو کئی سال تک شدید مشقت کرنا پڑی۔ اس کے بعد ان کو مدرسے میں معلّم مقرر کر دیا گیا۔ ۳ مارچ ۱۸۸۳ء کو مولانا عبدالرحیم اور میاں عبدالغفار کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوئے۔

مولوی تبارک علی

اُنھیں عظیم آباد (پٹنہ) کے دوسرے مقدمۂ سازش میں حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور اور ضبطیٔ جائیداد کی سزا ہوئی تھی۔ ان کے والد مکرم مولوی مبارک علی حالتِ قید میں فوت ہو گئے تھے۔ مولوی تبارک علی کو بھی انڈمان پہنچنے کے بعد ابتدا میں سخت مشقت کرنی پڑی۔ پھر سٹیشن محرر مقرر ہو گئے تھے۔ رہا ہونے کے بعد ۲ مارچ ۱۸۸۳ء کو انڈمان سے وطن روانہ ہوئے۔

میاں مسعود گل

انھیں مسعود خاں بھی کہا جاتا ہے۔ بنگال کے ضلع بوگرہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۶۰ء میں گرفتار ہوئے اور قید کر کے انڈمان بھیجے گئے۔ مدت قید ختم کر کے ۲۸ اپریل ۱۸۸۳ء کو وہاں سے عازمِ وطن ہوئے۔

ابراہیم منڈل

راج محل کے مقدمۂ سازش کے ضمن میں ان کا ذکر آ چکا ہے۔ انڈمان پہنچنے کے وقت بہت بوڑھے اور ضعیف تھے۔ قید کی مدّت پوری کر کے واپس آئے اور ۱۹۰۳ء کے لگ بھگ سفرِ آخرت اختیار کیا۔

اِن کے علاوہ وہابی سازش مقدمات کے اور بھی بہت سے قیدی تھے جنھیں کالے پانی بھیجا گیا یا برِصغیر کے مختلف جیل خانوں میں بند کیا گیا اور شدید سزائیں دی گئیں لیکن ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے یا معلوم ہوئے ہیں تو بہت کم ــــــــــ!

حکومتِ ہند کا اِعلان

۱۱ جنوری ۱۸۸۳ء کو وہابی اسیرانِ انڈمان کی رہائی کے بارے میں حکومت ہند کے

محکمۂ داخلہ کی طرف سے مندرجہ ذیل اعلان بغرضِ اطلاع عام شائع ہوا:

"مقدمے کے تمام پہلوؤں پر کامل غور و فکر اور حکومتِ بنگال و حکومتِ پنجاب کے مشورے کے بعد گورنر جنرل نے اپنی کونسل کے اجلاس میں فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ جن لوگوں کو سلطنت کے خلاف جنگ میں شرکت و اعانت کے جرم کی بنا پر حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی اور وہ ابھی تک سزا بھگت رہے ہیں، انھیں اب رہا کر کے گھروں میں آنے کی اجازت دے دی جائے۔ البتہ انھیں پولیس کی نگرانی قبول کرنا ہوگی۔ نیز مقامی حکومتیں ان کے کہیں آنے جانے اور رہنے سہنے پر جو پابندیاں عائد کرنا مناسب سمجھیں، وہ لازماً منظور کرنا پڑیں گی۔"[۴۴]

لارڈ میو کا قتل

گزشتہ صفحات میں اُس دور کے وائسرائے ہند لارڈ میو کے قتل کا ذکر کئی مرتبہ ہوا ہے۔ اس کے قتل کا حادثہ انڈمان میں پیش آیا اور اس کی وجہ سے مجاہدین اسلام اور سرفروشانِ آزادی کی قید کا زمانہ بھی بڑھ گیا اور ان پر سختیاں بھی پہلے کی نسبت زیادہ ہونے لگیں۔ چونکہ یہ واقعہ بھی اُن کی اسیری سے کچھ تعلق رکھتا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قتل کے بارے میں بھی اس موقعے پر اختصار کے ساتھ ضروری باتیں بیان کر دی جائیں۔

لارڈ میو ۱۸۶۹ء میں ہندوستان کا وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس کو برصغیر کے سیاسی اور دیگر معاملات سے خاصی دلچسپی تھی ـــ وہ انڈمان میں بھی بعض اصلاحات جاری کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے کچھ تجاویز سوچیں، ضابطے مرتب کیے اور ۱۸۷۱ء میں انھیں نافذ بھی کر دیا۔ اس اثنا میں اس نے خود انڈمان جانے اور وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ وہ کلکتے سے رنگون گیا اور وہاں سے ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو صبح کے وقت انڈمان پہنچا۔ اس کی بیوی بھی ساتھ تھی، اور بھی بہت سے لوگ اس کے ہمرکاب تھے۔ وہاں کے چیف کمشنر نے جہاں تک ممکن تھا، وائسرائے

۴۴۔ سرگزشت مجاہدین، ص ۵۴۴ بحوالہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۱۱ جنوری ۱۸۸۳ء

کی حفاظت کے تمام انتظامات کر لیے تھے ——— مثلاً

۱۔ سب مشقتی قیدیوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ کوئی بھی اپنے کام سے غیر حاضر نہ رہے۔

۲۔ پولیس کی گارد وائسرائے کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے رہے۔

۳۔ گارد کے ہر سپاہی کی بندوق بھری ہو۔

۴۔ جن جزیروں میں زیادہ سنگین مجرم رہتے تھے، ان میں پولیس کے علاوہ مسلح فوج وائسرائے کی حفاظت کے لیے متعین کر دی گئی تھی۔

چیف کمشنر اور حکام بالا نے پرانے قیدیوں کو یقین دلایا تھا کہ وائسرائے کے واپس جانے کے بعد اچھے چال چلن والے باغی اور دوسرے قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ اس لیے پرانے قیدی وائسرائے کی آمد پر خوش تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ جلد ہی رہا ہو کر وطن واپس چلے جائیں گے۔

۸ فروری ۱۸۷۲ء کی صبح کو وائسرائے کا جہاز انڈمان کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو اسے اکیس ضرب توپوں کی سلامی دی گئی، اس کے بعد وہ جہاز سے اترا، اور فوراً ہی مختلف مقامات کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ قیدیوں کے زنانہ اور مردانہ ہسپتالوں میں گیا، بعض بارکوں کا معائنہ کیا اور قیدیوں کی اصلاح و بہبود کے لیے گفتگو کی۔ جزیرے میں ریل گاڑی جاری کرنے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ——— وائسرائے کا انداز ایسا تھا کہ وہ بھی قیدیوں سے اظہارِ ہمدردی کرتا تھا اور قیدی بھی چند گھنٹوں میں اسے اپنا خیر خواہ سمجھنے لگے تھے۔ اس وقت مولانا محمد جعفر تھانیسری بھی وائسرائے کے ساتھ تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ راستہ چلتے وقت پولیس کے آدمی جب وائسرائے کے بہت نزدیک ہو جاتے اور قیدیوں کو اس سے ذرا دور ہٹاتے تو وائسرائے اس پر ناراضی کا اظہار کرتا اور پولیس سے کہتا کہ انھیں کچھ نہ کہو، آزادی سے چلنے پھرنے دو ——— مولانا فرماتے ہیں کہ خود وہ وائسرائے سے اتنے قریب ہو جاتے کہ کپڑے سے کپڑا چھونے کی نوبت آجاتی۔ اس نے دوپہر کا کھانا چیف کمشنر کے ساتھ کھایا۔[۲۵]

۲۵؎ کالا پانی، ص ۱۱۴

انڈمان میں ایک بہت ہی سرخ رنگ کی لکڑی ہوتی ہے جو نہایت مضبوط، خوش نما اور خوشبودار ہے۔ اس لکڑی کے لیے اس زمانے میں ایک آرا گھر بھی بنایا گیا تھا۔ وائسرائے اُسے بھی دیکھنے گیا اور اس عجیب وغریب لکڑی کا ایک بڑا تختہ ملاحظہ کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بالآخر اسی لکڑی کے تختے سے وائسرائے کا تابوت بنایا گیا۔[۲۶]

وائسرائے تمام دن مختلف مقامات میں گھومتا رہا۔ جب دن غروب ہونے میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تو اس کے پرائیویٹ سکرٹری نے اصرار کیا کہ اب باقی مقامات کا دورہ دوسرے دن پر ملتوی کر کے آرام کے لیے جہاز پر تشریف لے جانا چاہیے۔ وائسرائے نے جواب دیا، ابھی دن باقی ہے، ٹھنڈا اور سہانا وقت ہے، اب ماؤنٹ ہیریٹ[۲۷] کو دیکھ لینا چاہیے، جہاں ایک سینٹوریم بنانے کی تجویز تھی۔ چنانچہ اس کی سواری کے لیے ایک گھوڑا حاضر کر دیا گیا۔ لیکن آدھی چڑھائی پر گئے تو وائسرائے نے پیدل چلنے پر اصرار کیا اور کہا کہ جو شخص چاہے گھوڑے پر سوار ہو جائے، میں تو پیدل چلوں گا۔ ماؤنٹ ہیریٹ پر وائسرائے بہت خوش تھا، وہاں دیر تک غروب آفتاب کا نظارہ کرتا رہا۔ اس نے اپنے پرائیویٹ سکرٹری سے کہا کہ ایسا شاندار نظارہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔

ماؤنٹ ہیریٹ سے واپس آنے لگے تو فضا پر تاریکی چھا رہی تھی۔ وائسرائے اور اس کے ساتھی، تین چوتھائی حصہ طے کر چکے تو مشعل بردار بھی پہنچ گئے۔ اس وقت سات بجے تھے۔ اس سے آگے مولانا محمد جعفر تھانیسری کے الفاظ پڑھیے، جو انھوں نے اپنی کتاب کالا پانی میں تحریر فرمائے ہیں:

---

[۲۶] کالا پانی، ص ۱۳۱

[۲۷] یہ جنوبی انڈمان کی مشہور پہاڑی ہے، جس کی بلندی ۱۱۹۳ فٹ ہے، اس کا نام انڈمان کے ایک حاکم کرنیل ٹائٹلر (۱۸۶۲-۱۸۶۴) کی بیوی ہیریٹ (HARRIET) کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ جگہ آب و ہوا کے لحاظ سے بہت خوش گوار ہے۔

"لارڈ صاحب بہادر پل ہوپ ٹاؤن پر پہنچے۔ دو مشعل والے لارڈ صاحب کے آگے، سپرنٹنڈنٹ صاحب اور پرائیویٹ سیکرٹری لارڈ صاحب کے داہنے بائیں اور ایک لیفٹیننٹ اور ایک کرنیل تھوڑے فاصلے پر پیچھے کی طرف لارڈ صاحب بہادر کے داہنے بائیں چلتے تھے اور مسلح گارڈ فری پولیس کا دستہ لارڈ صاحب سے پیچھے پاؤں سے پاؤں ملا ہوا چلتا تھا۔۔۔۔۔ لارڈ صاحب بہادر نے مع پرائیویٹ سیکرٹری کے آہستہ آہستہ چل کر گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف جاکر بوٹ میں اُترنا چاہا ــــ اس وقت یک بیک لارڈ صاحب بہادر کی طرف کچھ ضرب کے کھٹکے کی آواز سنی گئی، اور جب اس طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ لارڈ صاحب کی پشت پر کوئی ہاتھ مع چھری کے وار کر رہا ہے اور ایک آدمی لارڈ صاحب کی پشت پر چمٹا ہوا ہے۔"

اب دس بارہ آدمی اس شخص پر گر پڑے۔ ایک قیدی نے جس کا نام ارجن تھا، چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ افراتفری میں شمعیں گل ہو گئی تھیں۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے قیدی کو مار پیٹ سے بچایا۔

لارڈ میو ضرب کھانے کے بعد سمندر میں گر گئے۔ لوگوں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ گھرے پانی میں کھڑے منہ صاف کر رہے تھے۔ پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا، مجھے ضرب لگائی گئی ہے، لیکن فکر کی بات نہیں، ضرب معمولی ہے ــــ اس کے بعد ان کو گاڑی پر بٹھا دیا گیا جو پل پر کھڑی تھی۔ مشعلیں دوبارہ روشن کر دی گئیں۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ پشت پر سے کوٹ کٹ گیا ہے اور جسم میں اتنا بڑا زخم ہو گیا ہے کہ پرنالے کی طرح خون بہہ رہا ہے۔ خون کو رومالوں سے بند کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن بند نہیں ہوا، لارڈ میو ایک دو منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر لڑکھڑاتے اور پیچھے کی طرف گر پڑے۔ آہستہ سے کہا: "میرا سر اُوپر اٹھاؤ" اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔

اب ان کو اٹھا کر جہاز پر پہنچایا گیا۔ وہاں آکر ڈاکٹروں نے دیکھا تو کہا کہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہے ــــ دو شدید زخم کندھے کے قریب سے شروع ہو کر سینے تک جسم کو چیرتے چلے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بھی جان لینے کے لیے کافی تھا۔

وائسرائے کا قاتل

وائسرائے ہند لارڈ میو کے قاتل کا نام شیر علی تھا اور وہ پہلے سے قتل ہی کے مقدمے میں کالے پانی میں عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ یہ اصلاً تیراہ کا آفریدی تھا۔ کسی زمانے میں کمشنر پشاور کے سوار اردلیوں میں بھرتی ہوا تھا۔ اس کے خاندان کے دو گروہوں میں بہت عرصے سے سخت دشمنی چلی آ رہی تھی اور اس سلسلے میں فریقین کے متعدد آدمی قتل ہو چکے تھے۔ شیر علی کو اس کے خاندان کے لوگوں نے کئی دفعہ گھر آنے کے لیے بُلایا تاکہ دشمنوں سے بدلہ لیا جائے۔ لیکن یہ گھر نہیں گیا، پشاور رہی میں ملازمت کرتا رہا۔ ایک دفعہ اُسے پتا چلا کہ مخالف فریق کا ایک شخص پشاور آیا ہوا ہے، چنانچہ اُس نے موقع پا کر پشاور کے ایک باغ میں اُسے قتل کر دیا۔ اس پر قتل کا مقدمہ قائم ہوا، اور ۲ اپریل ۱۸۶۷ء کو پھانسی کا حکم سُنایا گیا۔ لیکن بعد میں سزائے موت کو جبسِ دوام بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔

انڈمان میں شیر علی کا معمول یہ تھا کہ کثرت سے روزے رکھتا۔ تنخواہ اور مزدوری سے جو روپے بچ جاتے، مہینے دو مہینے کے بعد اس رقم سے کھانا پکاتا اور غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتا۔ نیکی اور اچھائی کی وجہ سے سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے اور اس کو اُونچے کردار کا آدمی قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حفاظتی عملہ بھی اس کی زیادہ نگرانی نہ کرتا تھا۔ مشقتی قیدیوں کے لیے اسے حجام بنا دیا گیا تھا۔ لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود ۱۸۶۹ء میں اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی بڑے انگریز کو قتل کرے گا۔ چنانچہ جونہی موقع ملا، اس نے ہندوستان کے وائسرائے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

وائسرائے ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو صبح کے وقت انڈمان پہنچا تھا اور پہنچتے ہی وہاں کے مختلف مقامات کا دورہ شروع کر دیا تھا۔ شیر علی اس کو قتل کرنے کے لیے دن بھر گھات میں رہا، لیکن حملے کا موقع نہ ملا۔ ناامید ہو کر وہ ماؤنٹ ہیریٹ پر جا بیٹھا یعنی تقدیر خود ہی اُسے مقامِ قتل پر لے گئی۔

منقول ہے کہ لارڈ میو طویل القامت اور بھاری بھر کم شخص تھا، اس کے مقابلے

میں شیر علی بہت دُبلا پتلا اور بظاہر کمزور جسم کا آدمی تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اتنا شہ زور اور طاقت ور تھا کہ ایک مرتبہ بھاری بیڑی اور ہتھکڑی توڑ کر بتی بھائی اور گورے پہرے دار کی سنگین چھین کر اُسے زخمی کر دیا تھا۔ تاہم دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ لارڈ میو جیسے لمبے تڑنگے اور جسیم وجیم آدمی کو یہ شخص حملہ کر کے قتل کر سکتا ہے۔

بہرحال شیر علی گرفتار کیا گیا اور اس پر مقدمہ چلا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ حملہ کس کے اشارے سے کیا، تو جواب دیتا، خدا کے حکم سے۔!

عدالتی کارروائی مکمل ہوتی تو اس کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ پھانسی دینے لگے تو اس نے بلند آواز سے کہا: میں نے جب اس کام کا ارادہ کیا تھا تو اپنے آپ کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ مسلمان بھائیو! میں نے تمھارے دشمن کو مار ڈالا۔ اب تم شاہد رہو کہ میں مسلمان ہوں (پھر) کلمہ پڑھا۔ دو دفعہ پورا کلمہ پڑھا تیسری بار پھانسی کی رسی سے گلا گھٹ گیا اور پورا کلمہ ادا نہ ہوا۔[۲۸]

لارڈ میو کے قتل سے ایک مہینہ چار روز بعد ۱۱ مارچ ۱۸۷۲ء کو اسے پھانسی دی گئی۔

قتل کا ردِ عمل وہابی قیدیوں پر

اس قتل کا ردِ عمل وہابی قیدیوں کے لیے نہایت اذیت ناک ثابت ہوا۔ حکومت نے اسے بہت گہری سازش کا نتیجہ قرار دیا۔ وہابیوں کی تمام چھوٹی بڑی مراعات ختم کر دی گئیں اور انھیں الگ الگ دُور دُور جزیروں میں بھیج دیا گیا۔ بلکہ انھیں اس قتل میں ملوث کر کے سخت ترین سزائیں دینے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں تفتیش کے لیے انگریزی حکومت نے ایک تو ڈپٹی کمشنر پولیس کلکتہ کو انڈمان بھیجا۔ دوسرے لالہ الشوری پرشاد کو اس کام پر مامور کیا۔ یہ وہی لالہ الشوری پرشاد ہے جس نے انبالہ اور عظیم آباد کے سازش کے مقدموں میں بہت نمایاں کردار ادا کیا تھا اور مجاہدین کو سزا دلانے کے صلے میں سورج گڑھ کا ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو گیا تھا۔ ان

---

[۲۸] یہ تمام واقعات مولانا محمد جعفر تھانیسری کی "تاریخِ عجیب" میں مرقوم ہیں۔ اس واقعہ کے وہ چشم دید گواہ تھے۔

تفتیشی افسروں اور بعض حکام نے وہابی قیدیوں اور بغاوت کے اسیروں کو وائسرائے کے قتل میں اُلجھانے کی ازحد کوشش کی، لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ وہابی سازش مقدمات میں مجاہدین کو سزائیں دینے والے اور ہیبس کارپس کی دونوں درخواستیں مسترد کر دینے والے چیف جسٹس نارمن پر ایک شخص عبداللہ پنجابی نے احاطۂ عدالت میں قاتلانہ حملہ کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں نارمن ۲۱ ستمبر ۱۸۷۱ء کو وفات پاگیا تھا۔ نارمن پر حملے اور قتل کے بعد وائسرائے ہند لارڈ میو کو بھی صورتِ حال سے مطلع کر دیا گیا تھا اور حفاظت کے انتظامات بڑھا دیے گئے تھے، لیکن لارڈ میو مسکراتے ہوئے کہتا کہ مارنے والے کو یہ انتظامات روک نہ سکیں گے۔

بہرحال لارڈ میو کے قتل کے بعد مجاہدین کو انڈمان میں سخت تکلیفوں اور اذیتوں سے دوچار کیا گیا اور اُنھیں کئی سال مزید وہاں قید میں رہنا پڑا۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ پھانسی کے تختے پر شیر علی نے لارڈ میو کو مسلمانوں کا دشمن اس لیے قرار دیا کہ اس کے زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں بالخصوص "وہابیوں" پر بہت تشدد ہوا تھا اور بغاوت کے مختلف مقدمات میں پھنسا کر سخت سزائیں دی گئی تھیں۔

چند الفاظ اس کتاب کے بارے میں

یہ کتاب جیسا کہ ابتدائے مقدمہ میں بیان کیا گیا صرف حرف ع پر مشتمل ہے۔ اس کے مقدمے میں جو کہ آغاز ہی سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ لکھا جارہا ہے، مختصر طور پر ۱۸۵۷ء سے بعد کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی اور زندگی باقی رہی تو چودھویں صدی ہجری کے اختتام پر یہ سلسلہ ختم ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز ——— اللّٰھم یسر ولا تعسر وتمم بالخیر۔

محمد اسحاق بھٹی

۱۱ رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ۔ ۲۳ جون ۱۹۸۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ع

۱ــ سیّد عالم علی حُسینی نگینوی

مولانا سیّد عالم علی حُسینی نگینوی کے والد کا اسم گرامی سیّد کفایت علی اور دادا کا سید فتح علی تھا۔ اپنے زمانے اور علاقے کے شیخ، محدث اور عالم تھے۔ اکابر فقہائے حنفیہ میں گردانے جاتے تھے۔ بہت اچھے طبیب تھے۔ قرآن کے قاری اور حافظ تھے۔ نگینہ (ضلع بجنور، یوپی) میں ولادت ہوئی، نشوونما بھی وہیں پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصولِ علم کے لیے گھر سے نکلے، مفتی شرف الدین رام پوری اور مولانا غفران بن تائب فقیہ افغانی رام پوری سے کتبِ درسیہ پڑھیں۔ پھر دہلی کا عزم کیا، وہاں مولانا مملوک علی نانوتوی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور ان سے بعض کتابوں کی تکمیل کی۔ علم طب کا شوق پیدا ہوا تو حکیم نصراللہ خاں دہلوی سے طب کی کتابیں پڑھیں اور ماہر اطبا میں شمار کیے گئے۔ اس عہد کی دہلی میں بہت سے فضلائے کرام فروکش تھے، حضرت مولانا محمد اسحاق کا سلسلۂ درس بھی جاری تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کتب حدیث کا درس لیا۔

مجموعی اعتبار سے سید عالم علی حُسینی نگینوی نے متعدد اساتذہ سے فیض حاصل کیا، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا فریدالدین سہارن پوری، مولانا غفران رام پوری، حافظ شبراتی رام پوری، مولانا محمد رام پوری، مفتی شرف الدین رام پوری، مولانا مملوک علی نانوتوی، مولانا محمد اسحاق دہلوی، حکیم نصراللہ خاں دہلوی، حکیم غلام حیدر خاں دہلوی، مولانا نوازش علی نگینوی، مولانا تہور علی نگینوی۔

مولد و منشا چونکہ نگینہ تھا، اس لیے نگینوی کہلاتے۔ بعد کو مراد آباد میں سکونت اختیار

کرلی تھی، لہٰذا مرادآبادی کی نسبت سے شہرت پائی۔

مرادآباد کے زمانۂ قیام میں ان کی دلچسپیوں کا محور صرف دو علوم تھے۔ ایک درسِ حدیث اور دوسرے علمِ طب ــــــ ان دو علوم میں خُوب مہارت پیدا کی اور اپنے وقت کے نامور محدث اور کامیاب طبیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے ــــــ بہت سے اہلِ علم نے ان سے استفادہ کیا اور حلقۂ علما میں مستحقِ تعظیم و تکریم قرار پائے۔

چند کتابیں بھی تصنیف کیں، جن کے نام یہ ہیں: (۱) رسالہ فضائلِ صیام (۲) رسالہ فضائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۳) رسالہ در مخرج ضاد (۴) رسالہ تعدد جمعہ (۵) شرح ضابطۃ التہذیب یزدی۔ یہ ایک مفصل و بسیط شرح ہے (۶) الحجۃ البالغہ (۷) الوثیقۃ الباہرہ۔

مولانا حالؔی نے سرسید احمد خاں کی سوانح عمری "حیات جاوید" میں مولانا عالم علی کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے سلسلے سے تعلق رکھتا ہے، وہ واقعہ مندرجہ ذیل ہے:

"مولانا عالم علی رئیس مرادآباد جو روہیل کھنڈ کے ایک مشہور عالم اور طبیب اور نامور محدث تھے، اُنھوں نے چند یورپین عورتوں اور بچّوں کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا۔ مگر اتفاق سے باغی سپاہیوں کو خبر ہوگئی اور انھوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس کر ان سب کو قتل کر ڈالا۔ موصوف اس خیال سے کہ یہ حادثۂ عظیمہ ان کے مکان میں گزرا تھا اور ان کا کوئی عزیز یا رشتہ دار ان مظلوموں کے ساتھ نہیں مارا گیا تھا، سرکاری (انگریزی) تسلط کے وقت مرادآباد سے کہیں چلے گئے تھے اور حکام ضلع کو ان کی تلاش درپیش تھی، اور اُن کی نسبت یہ گمان تھا کہ باغیوں کے ساتھ اُن کی ضرور سازش تھی، ورنہ ان کے آدمی بھی مقتولوں کے ساتھ یقیناً مارے جاتے۔ مگر سرسید کو معلوم ہوگیا تھا کہ مولوی عالم علی محض بے قصور تھے اور انھوں نے نہایت نیک نیتی سے یورپین عورتوں اور بچّوں کو اپنے گھر میں رکھا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ باغیوں کو مولوی صاحب سے کوئی وجہ عداوت کی نہ تھی کہ وہ اُن کو یا اُن کے رشتہ داروں کو بھی مار ڈالتے اور خود ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ باغی سپاہ کا مقابلہ کرتے چنانچہ سرسید نے مولوی صاحب کی بریت کے لیے صاحبِ ضلع سے، باوجودیکہ وہ نہایت برافروختہ

تھے، بڑی دلیری کے ساتھ گفتگو کی اور یہ کہا کہ مولوی عالم علی کو آپ کے سامنے حاضر کرسکتا ہوں، لیکن جب تک آپ یہ وعدہ نہ کریں کہ ان سے کچھ مواخذہ نہ کیا جائے گا، اُس وقت تک میں ان کو بلانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ آخر صاحبِ ضلع نے ان سے یہ وعدہ کرلیا کہ ہم ضابطے کی تحقیقات تو ضرور کریں گے، لیکن چونکہ تمہارے نزدیک وہ بے قصور ہیں، بعد ضابطے کی کارروائی کے اُن کو بَری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سرسیّد نے مولوی صاحب کو بُلا کر عدالت میں پیش کر دیا اور ضابطے کی کارروائی کے بعد وہ بالکل بَری کر دیے گئے۔"

یہاں "باغیوں" سے وُہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف میدانِ جہاد میں اُترے۔

مولانا عالم علی مرادآبادی سے متعلق یہ واقعہ نجم الغنی نے بھی اپنی مشہور تصنیف "اخبار الصنادید" میں درج کیا ہے لیکن اس میں سرسید کا ذکر نہیں ہے۔ ان کے بقول یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران نواب مجد الدین خاں عرف مجو خاں مرادآباد کا حاکم بنا تھا۔ اُنھوں نے یورپین لوگوں کے قتل کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے، مگر ہمارے موضوع سے متعلق درج ذیل سطور ہیں:

"کچھ عیسائی لوگ اور ایک ڈپٹی کلکٹر جو انگریز افسروں کے ساتھ (مرادآباد سے) بھاگنے سے رہ گئے تھے، مولوی عالم علی صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوکر جان بر ہوئے۔ مولوی صاحب نے ان لوگوں کو آرام سے رکھا اور ان کے واسطے کچھ چندہ بھی کیا گیا۔ ۱۴ جون (۱۸۵۷ء) کو بریلی کا بریگیڈ بخت خاں کی افسری میں مرادآباد میں داخل ہوا۔ مرادآباد کے باغیوں نے مولوی عالم علی صاحب کی نسبت بخت خاں سے شکایت کی کہ اُنھوں نے عیسائیوں کو پناہ دی ہے۔ اس بات پر مولوی صاحب کا گھر لوٹا گیا اور عیسائیوں کو پکڑ کر گاڑیوں سے باندھ کر باغیوں کے لشکر میں لے گئے۔ مسٹر کیجن ڈپٹی مجسٹریٹ اور اس کا سالا مسٹر کاربری اور اس کا ایک لڑکا پندرہ برس کی عمر کا جوان، ایک کائستھ کے گھر میں پکڑے گئے۔ یہ تینوں انگریز رات کے وقت نرپت گنج کے مغربی دروازے کے قریب مسجد کے سامنے قتل کیے گئے۔"

بہرحال مولانا سیّد عالم علی حسینی نگینوی مرادآبادی، تیرھویں صدی ہجری اور اُنیسویں صدی عیسوی کے مشہور عالم اور معروف محدّث و فقیہ تھے، مرادآباد کے رئیس بھی تھے

اور وہاں ان کا سلسلہ درس جاری تھا، جس میں بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ برصغیر کے اس عالم و فاضل بزرگ نے ۷۰ سال کی عمر پائی۔ ۲۰ رمضان المبارک ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) کو جمعرات کے دن عصر اور مغرب کے درمیان سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔[1]

۲ ــــ قاضی عباس علی کلکتوی

قاضی عباس علی کلکتوی، حنفی المسلک تھے اور فنِ ریاضی اور علمِ فقہ میں درک رکھتے تھے۔ شیخ محمد مبین لکھنوی اور مولانا تفضل حسین کشمیری کے شاگرد تھے۔ نہایت ذکی اور ذہین عالم تھے۔ بار عب اور بلند مرتبہ تھے۔ اپنے عہد کے فحول علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

قاضی ممدوح بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ فقہیات میں عبور کا یہ عالم تھا کہ کلکتے کی مسندِ افتا پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں علمی صلاحیتیں مزید اجاگر ہوئیں تو وہاں کے قاضی اکبر بنا دیے گئے۔ پھر پورے ہندوستان کے "قاضی القضاۃ" کا منصب ان کے سپرد کر دیا گیا۔

تصنیف و تالیف اور درسیات میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ پر تعلیقات و حواشی لکھے۔ اور بھی متعدد درسی کتابوں پر حواشی تحریر فرمائے ــــ یہ حواشی اور تعلیقات اس نہج سے لکھے کہ مدرسین اور طلبا ان سے استفادہ کر سکیں اور وضاحت طلب مسائل آسانی سے ان کے ذہن کی گرفت میں آجائیں۔

اس زمانے میں انہی اہل علم کو افتا و قضا کے منصب پر مامور کیا جاتا تھا جو مسائل فقہیہ میں ماہر ہوتے تھے، اس لیے کہ یہ منصب انتہائی نازک ہے اور فقہیات میں مہارت کے بغیر اس سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ قاضی ممدوح چونکہ اس صفت سے بہرہ ور تھے لہٰذا

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۰، ۱۰۱ ــــ ترجمۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۲۹ ــــ حیات جاوید ص ۱۴۱ ــــ اخبار الصنادید ص ۵۵۲، ۵۵۳

یہ اہم ذمے داری ان کے سپرد کی گئی۔ پھر تصنیف و تالیف کا بھی اُنھیں تجربہ تھا اور درس و تدریس میں بھی مصروف رہتے تھے اس وجہ سے کتابوں پر پوری نظر تھی۔ چنانچہ جو فرائض اُن کے سپرد کیے گئے ان کو کامل دیانت و امانت کے ساتھ نبایا۔

برصغیر کے اس جید عالم اور نامور فقیہ نے ۲۳ رمضان المبارک ۱۲۲۰ھ کو کلکتے میں وفات پائی[1]۔

۳۔ قاضی عبدالاحمد سورتی

ہندوستان کے علاقہ گجرات کا شہر سورت اس اعتبار سے خاص شہرت رکھتا ہے کہ یہ متعدد معروف اور عالی قدر علما کا مولد و مسکن ہے۔ یہاں کے بہت سے علما و فقہا کا تذکرہ فقہائے ہند کی پہلی تمام جلدوں میں بیان ہوا ہے۔ اس شہر میں اہل علم اور ارباب فقہ نے ہمیشہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی محفلیں بپا رکھی ہیں تیرھویں صدی ہجری میں جو جلیل القدر علما و فقہا یہاں رونق افروز رہے ہیں ان میں قاضی عبدالاحمد سورتی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔

یہ شافعی المسلک فقیہ تھے اور قبیلہ باعکظ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے لاہور کے ایک جید عالم سید عبداللہ حسینی لاہوری سے علم حاصل کیا جو لاہور کی سکونت ترک کر کے سورت میں جا بسے تھے اور پھر سید عبداللہ حسینی لاہوری سورتی کی نسبت سے مشہور ہو گئے تھے۔ سید ممدوح سے قاضی عبدالاحمد طویل عرصے تک استفادہ کرتے رہے اور ادب و بلاغت، فن شعری اور دیگر علومِ متداولہ میں درجۂ کمال کو پہنچے۔

جب فارغ التحصیل ہو گئے تو علاقہ گجرات کے شہر بھرائچ کے منصب قضا پر متعین ہوئے اور نہایت خلوص و دیانت سے یہ اہم خدمت انجام دی۔

---

[1] قسطاس البلاغۃ ص ——— نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۲۹، ۲۳۰

بہادر بن احمد سورتی نے اپنی تصنیف "حقیقت سورت" میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔
وہ لکھتے ہیں کہ ان کے اصل نام میں اختلاف ہے، احمد تھا یا عبد الاحمد ——؟
اگر عبد الاحمد ہو تو اس میں نسبت عبدیت غیر اللہ کی طرف ہوجاتی ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی احمد کی وجہ سے تادباً لوگ انھیں "عبد الاحمد" کے نام سے پکارتے تھے۔ مگر یہ خود اپنا نام "عبد" کے بغیر فقط "احمد" لکھتے تھے لہٰذا ان کا اصل نام "احمد" ہی تھا۔

بہر حال یہ اپنے عصر میں سورت کے سر برآوردہ علما اور مشہور فقہا میں سے تھے انھوں نے ۱۷ جمادی الاخریٰ ۱۲۲۵ھ کو انتقال کیا۔[۳]

۴ —— مولانا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی لکھنوی

مولانا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی لکھنوی تیرھویں صدی ہجری کے مشاہیر علمائے فرنگی محل میں سے تھے۔ بحر العلوم مولانا عبد العلی کے بیٹے، درس نظامیہ کے بانی مولانا نظام الدین سہالوی کے پوتے اور مولانا قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے پرپوتے تھے۔ کئی پشتوں سے یہ خاندان فضل وکمال اور درس وتدریس میں ممتاز تھا۔ اس خانوادہ بلند مرتبت کا ہر عالم اپنی جگہ خاص اہمیت کا مالک تھا۔ ان میں صاحب ترجمہ مولانا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی لکھنوی بھی مختلف علوم وفنون میں بہت شہرت رکھتے تھے۔

مولانا ممدوح کا مولد ومنشا لکھنؤ ہے۔ اپنے والد گرامی مولانا عبد العلی سے حصولِ علم کیا اور طویل مدت تک ان کی صحبت وملازمت میں رہے۔ جب تمام علوم مروجہ پر عبور حاصل کرلیا تو عازم کلکتہ ہوئے، وہاں کے حکام سے تقرب پیدا کیا اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ لیکن جو توقعات لے کر وہاں گئے تھے وہ پوری نہ ہوئیں اور اپنے علم وفضل

۳۔ حقیقت سورت ص —— نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۳۰۔

کی بنا پر جس منصب پر فائز ہونا چاہتے تھے، وہ حاصل نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ واپس لکھنؤ آگئے۔ کچھ عرصے بعد پھر کلکتے کا قصد کیا، لیکن سوئے اتفاق سے اب بھی اپنے مرتبے کے مطابق حصولِ ملازمت میں ناکام رہے۔ اس زمانے میں ان کے والدِ مکرم بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی مدراس میں اقامت گزیں تھے اور درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اب یہ مدراس پہنچے اور والدِ گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں بیماری کا حملہ ہوا جو خطرناک صورت اختیار کر گیا اور سخت کمزور ہو گئے، مگر حالتِ مرض ہی میں لکھنؤ کے لیے تیار ہو گئے۔ شدتِ مرض کی وجہ سے باپ نے سفر سے روکا اور مدراس میں قیام کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن نہیں رُکے اور مدراس سے لکھنؤ کو روانہ ہو گئے۔ بیماری چونکہ سخت تھی، اس لیے اثنائے سفر ہی میں وفات پا گئے۔

مولانا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی بہت بڑے عالم و فاضل اور فقیہ تھے۔ مختلف علوم پر گہری نظر رکھتے تھے اور اپنے دور کے مشاہیر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف و شارح اور محشی تھے۔ شرحِ فقہ اکبر ان کی معروف تصنیفات میں سے ہے۔ اپنے پردادے کے حالات میں رسالہ قطبیہ تصنیف کیا جو اس خاندان کے رجال سے متعلق حوالے کی کتاب ہے۔ ان کے جدِ امجد مولانا نظام الدین فرنگی محلی دیارِ ہند کے مشہور عالمِ دین تھے اور شاہ عبدالرزاق بانسوی کے مرید تھے۔ ان کے حالات میں فارسی میں مناقبِ رزاقیہ کے نام سے اُنھوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ مولانا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی نے شرحِ مناقبِ رزاقیہ کے نام سے اس کی شرح سپردِ قلم کی۔

مولانا عبدالاعلیٰ علمائے احناف میں اونچے مرتبے کے مالک تھے؛ اور فقہ حنفیہ پر عبور رکھتے تھے۔ درسِ نظامیہ کے سلسلے میں انھوں نے رسالہ قطبیہ میں بعض اہم باتیں بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ درس و تدریس کے بارے میں علما کا ہمیشہ مختلف طریقہ رہا ہے:
اور مدرسین نے درس دیتے وقت اپنے زمانے کے حالات اور طلبا کی ذہنی استعداد کو پیشِ نگاہ رکھا ہے۔ مثلاً مولانا قطب الدین شہید سہالوی ہر فن کی ایک ایک کتاب کا درس دیتے تھے جس میں کامل تحقیق و تدقیق سے کام لیتے تھے۔ ان کے اسلوبِ درس کا یہ کمال تھا کہ

علمائے محققین اور ذہین طلبا جب ان سے ہر فن کی ایک ایک کتاب پڑھ لیتے تھے تو وہ تمام فنون پر حاوی ہو جاتے تھے۔

مولانا قطب الدین شہید کے بیٹے مولانا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی کا طریقہ یہ تھا کہ وہ طلبا کو ہر فن کی دو دو کتابیں پڑھاتے تھے۔ البتہ ذہین و ذکی طلبا کو صرف ایک کتاب پڑھانے اور اس انداز سے ہر مسئلہ ان کے ذہن نشین کراتے تھے کہ متداول علوم و فنون کے بند دروازے اُن کے سامنے کھل جاتے تھے۔

بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی طلبا کی استعداد اور قابلیت کا لحاظ رکھتے تھے۔ بعض طلبا کو ہر فن کی ایک ایک کتاب پڑھاتے تھے، بعض کو دو دو اور بعض کو تین تین۔!

مولانا عبد الاعلیٰ اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ میرا منہج تدریس ان سب سے الگ ہے اور خود اپنا اختراع کردہ ہے۔ وہ یہ کہ طلبا کو صغر سنی ہی میں یعنی حدِ بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی فنون کی تعلیم دینی چاہیے، اس لیے کہ اس دَور میں قوّتِ حفظ تیز ہوتی ہے اور بچّے کا ذہن آسانی سے ہر بات کو اخذ بھی کر لیتا ہے اور اُسے یاد بھی رکھتا ہے۔ اس زمانے کی یاد کی ہوئی بات ہمیشہ ذہن میں محفوظ رہتی ہے۔

مولانا نے اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے تفصیل سے بتایا ہے کہ علومِ معقول و منقول کی کتابیں چھوٹی عمر ہی میں ختم کر لینی چاہییں اور پھر تدریس و تالیف کا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے۔

بہر حال مولانا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی تیرھویں صدی ہجری کے فاضلِ کبیر اور فقیہِ اَجل تھے، اُنھوں نے ۲۸ شعبان ۱۲۰۷ھ کو مدراس سے لکھنؤ جاتے ہوئے راستے میں وفات پائی۔[1]

یہ بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی لکھنوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

۵۔ مولانا عبد الباسط قنوجی

علمائے قنوج میں مولانا عبد الباسط بن رستم علی بن علی اصغر صدیقی قنوجی، فاضل اَجل اور

---

[1] تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۰۵، ۱۰۶ ——— تذکرہ علمائے فرنگی محل۔ ص ۱۳۲۔
نزہۃ الخواطر۔ ج ۷، ص ۲۳۰ تا ۲۳۳۔

عالم کبیر تھے۔ صاحبِ فتاویٰ عمادیہ شیخ عماد الدین کرمانی کی اولاد سے تھے جو کرمان کی سکونت ترک کرکے ہندوستان آئے اور قنوج میں اقامت گزیں ہوئے۔ یہ بہت مشہور اور نامور بزرگ تھے۔ کئی پشتوں سے اس خاندان کے افراد مرتبۂ علم میں ممتاز چلے آرہے تھے۔

مولانا عبدالباسط ۱۱۵۹ھ کو قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ گھر میں علم کا چرچا تھا اور ان کے والد مولانا رستم علی قنوجی اس نواح کے جلیل القدر عالم اور معروف فقیہ تھے۔ لائق بیٹے نے ہوش سنبھالا تو باپ کے حلقۂ درس میں شرکت کی اور عرصے تک ان سے استفادہ کرتے رہے، یہاں تک کہ فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں کمال حاصل کیا اور فنونِ مروّجہ و رسمیہ میں فائق تر گردانے گئے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسندِ تدریس بچھائی اور اپنے آباؤ اجداد کے منصبِ عالی پر فائز ہوئے۔ پھر اللہ نے اس قدر شہرت سے نوازا اور لوگوں میں اس درجے تکریم عطا فرمائی کہ اپنے عہد کے استاذ الاساتذہ اور شیخ المشائخ قرار پائے۔ مختلف بلاد و امصار سے دور دراز کی مسافت طے کرکے طلبا ان کی طرف شدِ رحال کرتے اور ان سے مستفید ہوتے۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے حصولِ علم کیا۔

مولانا ممدوح بہت سے اوصاف و کمالات کے مالک تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ و اصول میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے اور واقعہ یہ ہے کہ معقول و منقول میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ ان تمام علوم کے لیے انھوں نے اپنے والدِ ماجد کے حضور زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔

ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا اور متعدد جیّد علما نے ان سے فیض حاصل کیا، جن میں تفسیر نظم الجواہر کے مصنف مفتی ولی اللہ فرخ آبادی، مولانا فصیح الدین قنوجی کے دو بیٹے مولانا نعیم الدین اور مولانا علیم الدین قنوجی، مولانا قادر بخش ٹلہوری قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام حضرات علم و فضل میں یگانہ اور اصحابِ تصنیف تھے۔

مولانا موصوف کو تصنیف و تالیف میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ بہت سی مفید اور عمدہ کتابوں کے مصنف تھے، جن میں یہ کتابیں شامل ہیں:۔

(۱) تفسیر ذوالفقار خانی (۲) نظم اللآلی فی شرح ثلاثیات البخاری

(۳) زبدۃ الفرائض (۴) انتخاب الحسنات ترجمہ احادیث دلائل الخیرات (۵) حبل المتین فی شرح الاربعین (۶) جواہر خمسہ۔ یہ کتاب علم فرائض میں ہے۔ (۷) عجیب البیان فی اسرار القرآن (۸) شفاء الشافیہ۔ یہ علم صرف کی انتہائی کتاب شافیہ ابن حاجب کی شرح ہے (۹) علم منطق کی شرح تہذیب کی شرح (۱۰) عاملی کی خلاصۃ الحساب کی شرح، یہ باب المساحہ تک ہے (۱۱) سلم العلوم کی شرح یہ مبحث شرطیہ تک ہے۔ (۱۲) المنازل الاثنا عشریہ فی طبقات الاولیا اس میں بارھویں صدی ہجری کے آخر تک کے حالاتِ اولیا مرقوم ہیں۔

مولانا عبدالباسط قنوجی میں ایک خوبی یہ تھی کہ خط نہایت عمدہ تھا اور کتابت و تحریر میں بہت تیز بھی تھے۔ ان کی تصنیفات جو خود اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، شاندار خط میں ہیں — بعض دیگر علما کی چند درسی کتابوں کی بھی اپنے ہاتھ سے کتابت کی۔ طلبا اُنھیں پڑھتے تو بہت خوش ہوتے۔ اِن کا اندازِ کتابت ایسا عمدہ تھا کہ پوری عبارت اس قدر واضح اور صاف ہوتی کہ ذہین طلبا اسے پڑھ کر ہی مطلب کی تہ تک پہنچ جاتے۔

مولانا ممدوح مسلکاً حنفی تھے اور قنوج اور اس کے گرد و نواح میں نہایت عزت و احترام کے حامل تھے۔ علما و طلبا ان کی خدمت میں آتے تو ان کے طریقِ تدریس اور اسلوبِ تفہیم سے انتہائی متاثر ہوتے۔ اس قدر عمدگی سے بات کرتے کہ مشکل سے مشکل مسئلے کے بھی تمام گوشے مخاطب کے سامنے نکھرتے چلے جاتے۔ سمجھنے والے کو کوئی دِقت پیش نہ آتی، اور کوئی اُلجھاؤ باقی نہ رہتا۔

نواب سید محمد صدیق حسن خاں نے ابجد العلوم اور اتحاف النبلا میں بہت ہی عقیدت و احترام کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔

اس جلیل القدر عالم و فقیہ نے ۲ ربیع الثانی ۱۲۲۳ھ کو قنوج میں وفات پائی اور اپنے آبا و اجداد کے پہلو میں دفن ہوئے۔[۵]

---

[۵] ابجد العلوم ص ۹۴۱ ——— اتحاف النبلا ص ۳۰۹، ۳۱۰ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۶۔ مولانا عبدالجلیل شہید علی گڑھی

مولانا عبدالجلیل دیارِ ہند کے اکابر علمائے اہلِ حدیث میں سے تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا ریاض الدین تھا۔ یہ لوگ "بنی اسرائیل" مشہور تھے۔ جس محلے میں یہ مقیم تھے، وہ محلہ "بنی اسرائیل" کہلاتا تھا۔ مولانا عبدالجلیل ۱۲۲۵ھ کو علی گڑھ کے اسی محلے میں پیدا ہوئے۔ معقولات کی تحصیل مولانا بزرگ علی مارہروی سے کی۔ بعض کتابیں دیگر علمائے کرام سے بھی پڑھیں۔ حدیث کے لیے مولانا محمد اسحاق دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے کتبِ حدیث کی تکمیل کی اور سند و اجازہ سے سرفراز ہوئے۔ علمِ فقہ میں بھی عبور حاصل کیا۔ علوم ظاہری کے ساتھ فیوضِ باطنی سے بھی آراستہ تھے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی سے اخذِ طریقت کیا تھا۔ ان کے والد مولانا ریاض الدین علی گڑھ کی جامع مسجد کے خطیب و امام تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مولانا عبدالجلیل کو ان کے علم و فضل کی بنا پر علی گڑھ کی جامع مسجد کا منصبِ امامت و خطابت تفویض کیا گیا جو اس دور کا بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس مسجد میں ان کا حلقۂ درس بھی قائم تھا۔ نہایت نیک، پاک باز، متقی اور باخدا عالم و فقیہ تھے۔ علی گڑھ اور اس کے گردونواح کے باشندے ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور یہ مرجعِ خلائق تھے۔ کتاب و سنت کو سمجھنے اور مسائلِ فقہیہ میں استفسار کے لیے لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے۔ بعض انگریز بھی ملاقات کو آتے مگر وہ انھیں قابلِ اعتنا نہ گردانتے اور بہت ہی کم ملاقات کی اجازت دیتے۔ چونکہ زیادہ تر درس و تدریس اور افتانویسی میں مشغول رہتے اس لیے پیغام بھجوا دیتے کہ اس وقت مصروف ہوں۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ انگریز بہادر کے ساتھ اس کی میم بھی تشریف لائی ہیں تو ملاقات سے قطعی طور پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۳۸۵ تا ۳۸۷ — حدائق الحنفیہ ص ۴۶۴، ۴۶۵ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۳۴ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۷۔

منع فرما دیتے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ہنگامہ شروع ہوا، اور اس کے اثرات علی گڑھ پہنچے تو ۲۰ مئی ۱۸۵۷ء کو شہر پر انقلابیوں نے قبضہ کر لیا۔ ۳ جون کو مولانا عبدالجلیل نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور شہر کی زمامِ قیادت انہی کے حوالے کی گئی۔ کم و بیش دو مہینے تک شہر کا نظم و نسق ان کے سپرد رہا۔ پھر جب انگریزوں نے وسیع پیمانے پر ملک میں قتل و غارت کا سلسلہ شروع کیا تو جولائی یا اگست (۱۸۵۷ء) میں اُن کی تازہ دم فوجیں آگرے کی جانب سے علی گڑھ کی طرف بڑھیں، شہر انگریزی فوج کے محاصرے میں آگیا اور اس پر حملہ کر دیا گیا۔ مولانا اپنے ساتھیوں کی معیت میں میدانِ محاربہ میں اُترے اور دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گئے۔ یہ معرکہ سوناپال کے باغ میں اس شہراہ پر ہوا جو آگرے کو جاتی ہے۔ اُدھر انگریزی فوج ہر قسم کے اسلحے سے مسلح تھی اور اِدھر صرف جذبۂ ایمانی اور جوشِ قربانی تھا، جس کی وجہ سے یہ مجاہد میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہے۔ اس موقعے پر مولانا نے اپنے بہتّر رفقا کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا۔ یہ واقعہ ۲ محرم ۱۲۷۴ھ کو پیش آیا —— ان بہتّر نعشوں کو جامع مسجد میں لایا گیا اور شمالی دروازے کے قریب دفن کیا گیا۔ مولانا ممدوح کی تدفین بھی وہیں ہوئی۔

اس کے بعد انگریزی فوج خون خوار درندوں کی طرح شہر کے گلی کوچوں میں گھومنے لگی۔ جہاں کوئی مسلمان صورت شخص ملا، شہید کر دیا گیا۔ موتی مسجد کے سامنے پھول چوراہہ پر اور چوراہہ عبدالکریم پر پھانسیاں نصب کر دی گئیں۔ جونہی کسی مخالفِ آزادی نے کسی کے بارے میں کہا کہ یہ بھی شریکِ جہاد تھا، اُسے پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ مجاہدین کے بیوی بچوں کو بھی چُن چُن کر قتل کیا گیا۔

شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور ہر طرف قیامت بپا تھی۔ اس ہنگامِ ابتلا میں مولانا کی اہلیہ محترمہ نے اپنے چاروں بچوں کو پکڑا، ان کے منہ پر تو امٹی ملی اور شہر سے جنگل کی طرف بھاگیں اور تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں رسول پور میں جا کر رکیں۔ وہاں تین سال تک ان بچوں کو چھپائے رکھا۔ یہ طویل عرصہ انتہائی تکلیف اور مصیبت کے ساتھ گزرا۔ جب گرفتاریاں کا سلسلہ رُکا اور عام معافی کا اعلان ہوا تو بچوں کو علی گڑھ لے آئیں۔ وہاں پہنچیں تو معلوم ہوا کہ

معاملہ بالکل دگرگوں ہے۔ ان کے مکانات نیلام ہو چکے ہیں اور جائیداد دوسروں کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ اب کوئی مادی سہارا باقی نہیں رہا تھا اور وسائلِ معاش ختم ہو گئے تھے۔

مولانا عبدالجلیل کو ایک زمانے میں چھتاری کا نواب محمود علی خاں اپنے ہاں لے گیا تھا اور وہاں انھیں درس و تدریس پر مامور کر دیا تھا۔ وہ انھیں کچھ وظیفہ بھی دیتا تھا۔ اب یہ وظیفہ پھر ملنے لگا تھا، لیکن یہ وظیفہ کافی نہ تھا۔ ایک مردِ حق عزت علی خاں صاحب نے یہ مہربانی کی کہ نئے مالکوں سے نیلام شدہ مکانات خرید کر اصل مالکوں کو واپس دلائے۔ علی گڑھ کے لوگوں پر بھی اس خاندان کی خدماتِ علمی اور خلوص و وجاہت کا بہت اثر تھا، جس کی وجہ سے دوبارہ سکونت کے مواقع میسر آئے۔

مولانا عبدالجلیل علی گڑھی شہید اپنے دور اور علاقے کے جلیل القدر عالم و فقیہ، نہایت متین، عالی ہمت، بلند حوصلہ اور عمدہ خصال بزرگ تھے۔ بہت سے علما نے ان سے علم حاصل کیا اور نیک نام ہوئے۔ اس عالمِ دین نے ۷، محرم ۱۲۷۳ھ کو درجۂ شہادت پایا۔[۵۶]

ان کے دو بیٹوں میں سے ایک مولانا محمد اسماعیل تھے اور ایک مولانا محمد اسحاق عرشی۔ مولانا محمد اسماعیل نے علم و عمل میں بڑی شہرت پائی اور وہ دیارِ ہند کے نامور عالم ہوئے۔ ۲۷، شوال ۱۳۱۱ھ کو علی گڑھ میں وفات پائی۔ ان کا تذکرہ ان شاء اللہ چودھویں صدی ہجری کے علماء و فقہا میں کیا جائے گا۔

۷۔ مولانا عبدالحق بنارسی

مولانا عبدالحق عثمانی بنارسی اپنے دور کے فحول علما میں سے تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا

---

[۵۶] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۳۸ ـــــ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج ۴ ص ۳۱۶، ۳۱۷ ـــــ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۲۲۳، ۲۲۴ ـــــ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۱۹۳، حاشیہ۔

فضل اللہ عثمانی تھا۔ یہ دراصل ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایک قصبے نیوتن کے باشندے تھے۔ جو ضلع اناؤ میں واقع ہے۔ وہاں کی سکونت ترک کر کے بنارس میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔

مولانا عبدالحق کی ولادت ۱۲۰۶ھ کو نیوتن میں ہوئی اور اپنے والدِ گرامی مولانا فضل اللہ اور چند دیگر علما سے بعض دیگر درسی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں عازمِ دہلی ہوئے، وہاں حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحئی بڑھانوی سے حدیث و فقہ اور دیگر علوم کی تکمیل کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مکہ مکرمہ کا قصد کیا اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ وہاں کے علما سے بعض فقہی مسائل میں مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ مسلکِ اہل حدیث کے پابند اور کتاب و سنت پر عامل تھے، لیکن مکہ مکرمہ کے علمائے کرام متعدد مسائل میں ان سے مختلف رائے رکھتے تھے۔ اس اختلاف نے زیادہ شدت اختیار کر لی تو وہاں کی حکومت نے انھیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ پھر کچھ مدت بعد رہا ہوئے تو واپس ہندوستان آ گئے۔

دوسری مرتبہ سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیل شہید کے قافلے کے ساتھ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ یہ قافلہ سات سو ترپن (۷۵۳) افراد پر مشتمل تھا، جس میں بہت سے علما و زعما شامل تھے۔ بعض خواتین بھی اس قافلے میں شریک تھیں۔ یہ قافلہ ۲۸ شعبان ۱۲۳۷ھ (۲۱ مئی ۱۸۲۲ء) کو مکہ معظمہ میں داخل ہوا تھا۔

مولانا عبدالحق عثمانی حج کے بعد جب مدینہ منورہ پہنچے تو اپنی عادت کے مطابق فقہی نوعیت کے بعض مختلف فیہ مسائل میں وہاں کے علما سے پھر بحثیں شروع ہو گئیں۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد سعید اسلمی مدراسی فروکش تھے۔ یہ ان کے ہم وطن تھے، انھوں نے وہاں کے قاضی سے ان کی شکایت کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا ممدوح مدینہ منورہ سے نکلے اور ایک مقام "جریدہ" جا پہنچے۔ وہاں سے ایک قافلے کے ساتھ "جدہ" گئے اور جدہ سے یمن کا عزم کیا۔ وہاں قاضی محمد بن علی شوکانی، قاضی عبدالرحمٰن بھکلی، شیخ عبداللہ بن محمد بن اسماعیل امیر یمانی اور شیخ محمد عابد سندھی سے ملاقات کی۔ یہ تمام حضرات اپنے دور کے

جلیل القدر علما اور نامور بزرگ تھے۔ ان سب سے سند و اجازہ حاصل کیا۔ یہ ۱۲۳۸ھ کا واقعہ ہے۔ بعد ازاں "مخا" آئے اور پھر ہندوستان پہنچے۔

اس زمانے میں سفر حج کوئی آسان کام نہ تھا۔ آمد و رفت کی سہولتیں میسر نہ تھیں اور بہت کم لوگ یہ سعادت حاصل کر پاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مولانا عبدالحق عثمانی مدراسی نے سات مرتبہ سفر حجاز کیا اور سات حج کیے۔ ان کا حجاز مقدس کا ساتواں سفر آخری سفر تھا اور وہ اس سفر میں منیٰ کے مقام پر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا عبدالحق عثمانی نے مدینہ منورہ سے امام شوکانی کی خدمت میں صنعا (یمن) کا عزم کیا تو راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ کہیں سمندری سفر تھا اور کہیں برّی۔ اثنائے راہ میں کثرتِ باراں نے بھی قدم قدم پر رکاوٹ پیدا کی۔ بالآخر وہ صنعا پہنچے۔ وہاں ایک مکان میں اُتر کر امام شوکانی کی خدمت میں ایک مکتوب ارسال کیا۔ اُنھوں نے اپنے ہاں اُن کو طلب فرمایا اور عزت و اکرام سے پیش آئے۔ عمر دریافت فرمائی کہ کتنی ہے اور علمی کوائف پوچھے۔ پھر اپنی تصنیفات عنایت کیں اور ان کے مطالعے کا حکم دیا۔ اُنھوں نے ان کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ اسی دوران کر لیا۔ ہفتے میں دو دن سوموار اور جمعرات کو امام شوکانی کی زیارت کا شرف حاصل ہوتا اور ان سے سماعِ علم کرتے۔ امام انتہائی توجہ اور انہماک سے پڑھاتے اور مشکل و پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی کرتے۔ اسی اثنا میں مولانا بیمار پڑ گئے اور کافی عرصے تک بخار میں مبتلا رہے۔ صحت یاب ہوئے تو امام ممدوح کی خدمت میں حاضری دی۔ وہ اس وقت صنعا سے کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ بہ درجہ غایت تلطف و شفقت سے پیش آئے۔ یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا، اور ۱۰ جمادی الاخریٰ ۱۲۳۸ھ تھی۔ اپنے مبارک ہاتھ سے اُنھوں نے سند و اجازہ لکھ کر دی، جسے وہ "اتحاف الاکابر فی اسنا د الد فاتر" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ سند کو نقل کرنے کے لیے فرمایا، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یقول محمد بن علی الشوکانی غفر اللہ لهما حامداً للہ تعالیٰ ومصلیاً علی رسولہ وآلہ وصحبہ، انی قد اجزت الشیخ العلامۃ ابا الفضل عبد الحق بن الشیخ العلامۃ

محمد فضل اللہ المحمدی الہندی کثر اللہ فوائدہ بمنہ وکرمہ ونفع بمعارفہ ما اشتمل علیہ ھٰذا الثبت الذی جمعتہ وسمیتہ "اتحاف الاکابر باسناد الدفاتر" فلیرو عنی ما اشتمل علیہ من کتب الاسلام علی اختلاف انواعھا کما برا ھنیہ دھو اھل لما ھنالک ولم اشترط علیہ شرطا فھو اجل من ذلک واعلی راخذت علیہ ان یصلنی بالدعوۃ المستقلۃ فی حیاتی ولبعد مماتی ——— حررتہ یوم الجمعۃ بتاریخ عاشر جمادی الاخری سنۃ ۱۲۳۸ من الھجرۃ النبویۃ علی صاحبھا افضل الصلوٰۃ والتحیۃ۔

شیخ محمد عابد سندھی نے بھی ان کو سند و اجازہ سے مفتخر فرمایا۔ سبل السلام کے معنف شہیر کے پوتے شیخ عبداللہ یمانی نے بھی اپنے حلقۂ درس میں بیٹھنے کی اجازت دی۔ شیخ سے صحیح بخاری، قرآن مجید کی تفسیر جامع البیان اور بعض دیگر اہم کتابوں کے تبرکاً و تیمناً کچھ حصے پڑھے اور سند عطا ہوئی۔ قاضی عبدالرحمٰن بن احمد بن حسن بھکلی نے بھی ان کو سند و اجازہ سے سرفراز کیا۔

یہ تمام حضرات اپنے وقت کے جید علما اور بہت بڑے ائمۂ دین تھے مولانا عبدالحق نہایت خوش قسمت اور بلند بخت عالم تھے کہ ان کو ان حضرات سے شرفِ لقا کے مواقع میسر آئے اور سعادتِ سند و اجازہ حاصل ہوئی۔

مولانا عبدالحق عثمانی بنارسی مسائل فقہ میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ وہ کسی خاص امام کے مقلد نہ تھے، بلکہ نصوصِ کتاب و سنت پر عامل تھے۔ ان کے دور میں برِ صغیر کے علما و عوام زیادہ تر تقلید کے حامی تھے اور مولانا ممدوح کا نقطۂ نظر متعدد مسائل میں ان سے مختلف تھا۔ اسی لیے اجتہاد و تقلید کے موضوع پر علمائے احناف اور ان کے درمیان مباحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس ضمن میں اُنھوں نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں "الدر الفرید فی المنع عن التقلید" زیادہ مشہور ہے۔

بنارس میں ان کا اپنا حلقۂ درس بھی قائم تھا ان کے تلامذہ میں قاضی محمد مچھلی شہری، سید جلال الدین بنارسی، سید سعید الدین، محمد

سیّد حمید الدین احمد اور سیّد شہید الدین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مولانا ممدوح نے حالتِ احرام میں ۲ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ کو ستر سال کی عمر میں منیٰ کے مقام پر داعیِ اجل کو لبیک کہا اور جمعۃ المبارک کی رات کو مسجد خیف کے دروازے کے قریب مدفون ہوئے۔[۱]

۸۔ مولانا عبد الحکیم لکھنوی

مولانا عبد الحکیم انصاری فرنگی محلی لکھنوی، تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر علما میں سے تھے۔ مولانا عبد الرب فرنگی محلی کے بیٹے، بحر العلوم مولانا عبد العلی کے پوتے اور درسِ نظامیہ کے بانی مولانا نظام الدین انصاری فرنگی محلی کے پرپوتے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی گود میں پرورش پائی۔ ابتدائی اور متوسط کتابیں مولانا محمد دائم اور اپنے والا محترم مولانا عبد الرب سے پڑھیں۔ مطولات کی تکمیل مولانا نور الحق لکھنوی سے کی۔ تحصیلِ علم کے بعد درس و تدریس کی مسند بچھائی اور فتویٰ نویسی میں مشغول ہوئے۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ جس طرح ان کے آبا و اجداد تدریسی خدمات انجام دیتے رہے تھے، انھوں نے بھی اسی انداز میں یہ اہم خدمت انجام دی۔ اوقاتِ درس کے پابند تھے اور شب و روز اسی میں مصروف رہتے تھے۔ طلبا کا بہت خیال رکھتے تھے اور ان کے لیے خود ہی طعام و قیام کا انتظام فرماتے اور کتابیں مہیا کرتے۔ صلاح و تقویٰ سے آراستہ اور متدین بزرگ تھے۔ نیک اور قائم اللیل عالم دین تھے۔ علم فقہ اور دیگر علوم پر گہری نظر تھی۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ میں ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوا۔ ان کو بہت بلند اخلاق اور

---

[۱] تذکرہ مشائخ بنارس، ص ۵۸، ۵۹ ـــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۰، ۱۱ ـــــ سیرت سید احمد شہید، ص ۴۴۵، ۴۴۶ ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۲۹ تا ۲۲۵ ـــــ تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۳۴۴، ۳۴۵۔

مسافرنواز پایا۔ ان کے بیٹے مولانا عبدالحلیم اور مولانا محمد نعیم بھی عالم و فاضل اور اپنے اسلاف کے صحیح جانشین تھے۔

مولانا عبدالحکیم متعدد کتابوں کے شارح، محشی اور مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات و حواشی میں یہ کتابیں شامل ہیں: (۱) شرح کافی، یہ کتاب فارسی میں ہے۔ (۲) تفسیر بسم اللہ: فارسی میں (۳) ترجمہ دقائق الحقائق، فارسی میں (۴) حاشیہ شرح سلم مولانا حمداللہ عربی میں (۵) شرح دائر الوصول الی علم الاصول، عربی میں (۶) شرح ہدایہ اخرین عربی میں (۷) شرح چہل کاف، فارسی میں (۸) شرح رسالہ نظامیہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے بیان میں ہے۔ (۹) مجدد علم صرف میں ہے (۱۰) زبدۃ النحو، علم نحو میں (۱۱) حاشیہ تفسیر بیضاوی عربی میں (۱۲) شرح رسائل الارکان (۱۳) حاشیہ بر حاشیہ زاہدیہ بر شرح تہذیب ملا جلال الدین دوانی، عربی میں (۱۴) حاشیہ بر حاشیہ کمالیہ شرح عقائد جلالیہ (۱۵) جدول الصرف فارسی میں (۱۶) جدول النحو: فارسی میں۔ یہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

مولانا عبدالحکیم انصاری فرنگی محلی نے ۲۴ صفر ۱۲۸۶ھ کو وفات پائی [1]۔

۹۔ مولانا عبدالحلیم انصاری لکھنوی

برصغیر کے علمائے احناف میں مولانا عبدالحلیم انصاری فرنگی محلی لکھنوی کا اسم گرامی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالحلیم بن امین اللہ بن محمد اکبر بن مفتی احمد ابوالرحم بن مفتی محمد یعقوب بن عبدالعزیز بن محمد سعید بن قطب الدین شہید سہالوی! اس سلسلۂ نسب کی تمام کڑیاں نہایت منضبط ہیں اور یہ تمام افراد علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔

---

[1] احوال علمائے فرنگی محل ص ۶۷، ۶۸ — تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۳۷ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۱، ۱۱۲ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۴۵، ۲۴۶۔

مولانا عبدالحلیم کی تاریخ ولادت ۲۱ شعبان ۱۲۳۹ھ ہے اور مقام ولادت بلدۂ فضل و تحقیق لکھنؤ ——— اگھر میں علم کی نہر جاری تھی، اس سے خوب سیراب ہوئے اور ہر گوشۂ علم اور نوعِ فن میں کامل دسترس حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں قرآنِ مجید حفظ کیا۔ پھر علوم درسیہ کی تحصیل کے لیے کمر ہمت باندھی۔ صرف و نحو کی کتابیں اپنے والدِ ماجد مولانا امین اللہ سے پڑھیں، لیکن افسوس ہے وہ اپنے لائق بیٹے کی علمی رفعت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ بیٹا ابھی ان کے زیرِ درس تھا کہ خود سفرِ آخرت اختیار کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد اپنے محترم نانا مفتی ظہور اللہ کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے۔ ان کے علاوہ دیگر علمائے فرنگی محلی مثلاً مفتی محمد اصغر، مولانا نعمت اللہ اور مفتی محمد یوسف سے اکتسابِ فیض کیا اور سولہ برس کی عمر میں درس نظامیہ کے مروجہ نصاب سے فراغت حاصل کر لی۔ اپنے زمانہ کے باکمال فاضل، متبحر، جامع علومِ عقلی و نقلی، حاوی فنونِ فرعی و اصلی اور بہت ذہین فطین عالم تھے ——— فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسندِ درس آراستہ کی اور بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور علمی دنیا میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔

مولانا عبدالحلیم ممدوح ۱۲۶۰ھ میں نواب ذوالفقار الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ سے باندہ تشریف لے گئے۔ نواب مذکور اہلِ علم اور اصحابِ فضل کا بہت قدر دان تھا، وہ نہایت تکریم سے پیش آیا اور اپنے مدرسے کی مسندِ تدریس پیش کی۔ ایک عرصے تک اس خدمت پر مامور رہے۔ بعد ازاں لکھنؤ واپس آگئے اور ایک سال وہاں مقیم رہے۔ پھر جون پور کا عزم کیا۔ وہاں ایک شخص حاجی امام بخش مرحوم تھے، جو شہر کے رئیس تھے۔ انھوں نے مدرسہ امامیہ حنفیہ کے نام سے جون پور میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اس مدرسے کا مولانا ممدوح کو مدرس مقرر کر دیا۔ نو سال اس منصب پر فائز رہے اور بے شمار لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ۱۲۷۶ھ میں جون پور سے وطن واپس آئے اور شیخ عبدالوالی قادری فرنگی محلی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ ۱۲۷۷ھ میں حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں حیدر آباد کے مدار المہام سید تراب علی سالار جنگ تھے۔ وہ بہت نیک طینت اور عمدہ اوصاف شخص تھے۔ انھوں نے وہاں مدرسہ نظامیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ مولانا وہاں پہنچے تو مدار المہام موصوف

نے ان کی انتہائی توقیر کی اور انھیں اپنے مدرسے کی مسندِ تدریس پر فائز کیا۔ حیدر آباد کے دوران سفر میں جب وہ "ریوان" کے مقام پر پہنچے تو تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی کے ہاں بھی قیام پذیر ہوئے تھے۔ اس زمانے میں ان کے فرزندِ ارجمند مولانا عبدالحی فرنگی محلی صغیر السن تھے اور منطق کی کتاب قطبی پڑھتے تھے۔

حیدر آباد میں مولانا عبدالحلیم دو سال مقیم رہے۔ ۱۲۷۹ھ میں وہاں سے اجازت لے کر حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ حرمین شریفین کے علمائے کرام ان سے نہایت احترام سے پیش آئے۔ ان سے مولانا نے خوب استفادہ کیا۔ مکہ مکرمہ میں مفتیِ احناف شیخ محمد جمال مکیؒ اور مفتیِ شافعیہ شیخ سید احمد دحلان تھے، ان سے حدیث کی سند حاصل کی۔ ان کے علاوہ شیخ علی حریری مدنی سے اجازۂ حدیث سے سرفراز ہوئے۔ مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی اور مولانا عبدالرشید مجددی بھی مدینہ شریف میں فروکش تھے، ان سے بھی سند و اجازۂ حدیث کی سعادت حاصل کی۔ اس سے پہلے وہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلمیذِ رشید مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی سے بھی سندِ حدیث حاصل کر چکے تھے۔ حجازِ مقدس کے مذکورہ بالا علما سے حدیث کے علاوہ تفسیر، فقہ اور دیگر علومِ عقلیہ و نقلیہ کی سند بھی لی۔

۱۲۸۰ھ میں حج سے فارغ ہو کر واپس حیدر آباد تشریف لائے اور مدار المہام سید تراب علی سالار جنگ نے ان کو حیدر آباد کی عدالتِ دیوانی کا منصبِ نظامت تفویض کیا۔ یہ خدمت انھوں نے حسن و خوبی سے انجام دی اور بہترین طریقے سے مقدمات کے فیصلے کیے۔ تاحینِ حیات اس منصب پر فائز رہے۔

مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی جلیل القدر عالم و فقیہ اور بہت بڑے مصنف اور شارح تھے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے مشہور تصنیفات یہ ہیں:

(۱) رسالہ در مسئلہ اشارۂ سبابہ (۲) حاشیہ شرح عقائد جلالی المسماۃ رجل المعاقد (۳) نظم الدرر فی سلک شق القمر (۴) معان النظر لبصارۃ

شق القمر (۵) التحلیہ شرح التسویہ: یہ شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کی التسویہ کی شرح ہے (۶) الاملاء فی تحقیق الدعاء (۷) القاد المصابیح فی التراویح (۸) غایۃ الکلام فی بیان الحلال والحرام (۹) خیر الکلام فی مسائل الصیام (۱۰) قول الحسن فیما یتعلق بالنوافل والسنن (۱۱) عمدۃ التحریر فی مسائل اللون واللباس والحریر (۱۲) السقایہ شرح الہدایہ: ہدایہ کی یہ شرح نامکمل رہی۔ (۱۳) نور الایمان فی آثار حبیب الرحمٰن (۱۴) قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار (۱۵) رسالہ در مسئلہ رحلتِ حرمین (۱۶) التعلیق الفاضل فی مسئلۃ الطہر المتخلل (۱۷) حاشیہ شرح وقایہ۔ یہ حاشیہ نامکمل رہا (۱۸) ایک رسالہ ان تمام فتووں کے بارے میں ہے جو ان سے پوچھے گئے (۱۹) رسالہ تراجم علمائے ہند کے بارے میں: یہ مکمل نہ ہو سکا۔ (۲۰) تحقیقات المرضیہ لحل حاشیہ سید زاھد علی رسالۃ القطبیہ (۲۱) القول الاسلم لحل شرح السلم: ملا حسن کی شرح سلم پر حاشیہ (۲۲) اقوال الاربعہ (۲۳) کشف المکتوم لحل حاشیہ بحر العلوم (۲۴) قول المحیط فیما یتعلق بالجعل المؤلف والبسیط (۲۵) معین الغائصین فی رد المغالطین (۲۶) ایضاحات لمبحث المختلطات (۲۷) کشف الاشتباہ فی شرح السلم لحمد اللہ (۲۸) بیان العجیب فی شرح ضابطۃ التہذیب (۲۹) کاشف الظلمہ فی بیان اقسام الحکمہ (۳۰) العرفان فی المنطق (۳۱) حاشیہ شرح موجز از نفیسی (۳۲) حاشیہ قدیمہ: نامکمل (۳۳) شرح تجرید قوشجی (۳۴) حاشیہ بدیع الزمان: نامکمل (۳۵) حاشیہ مصباح۔

مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی اپنے عصر اور علاقے کے یگانۂ روزگار عالم تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں کامل تھے۔ حیدر آباد میں مقیم تھے کہ اپنے لائق فرزند مولانا ابو الحسنات عبد الحی فرنگی محلی کی شادی کے لیے لکھنؤ تشریف لائے۔ اس سے فارغ ہو کر جمادی الاخریٰ ۱۲۸۴ھ میں واپس حیدر آباد گئے۔ وہاں ماہ صفر ۱۲۸۵ھ میں اچانک مرضِ سل اور دق

کا حملہ ہوا۔ اسی مرض سے ۲۹ شعبان ۱۲۸۵ھ کو دوشنبہ کے روز حیدرآباد میں انتقال کر گئے اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔ اُن کی وصیت کے مطابق انھیں شاہ یوسف قادری کی قبر کے، جو دکن کے کبار اولیاء اللہ میں سے تھے، پائیں میں دفن کیا گیا۔[9]

۱۰۔ مولانا عبدالحی بُڑھانوی

مولانا عبدالحی صدیقی بُڑھانوی دیارِ ہند کے مشہور فقہا اور نامور علما میں سے تھے۔ بُڑھانہ ضلع مظفر نگر (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسمِ گرامی ہبۃ اللہ اور جدِ امجد کا مولانا نور اللہ تھا۔ مولانا نور اللہ صدیقی بُڑھانوی اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں سے تھے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ طویل عرصے تک استاد سے صحبت و لزوم کا شرف حاصل رہا اور ان کی زندگی ہی میں کبار علمائے ہند میں گردانے گئے۔ ۱۱۸۷ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔

مولانا نور اللہ کے شاگردوں کی فہرست بڑی وسیع ہے جس میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ مولانا ممدوح نے اپنی بیٹی بھی شاہ عبدالعزیز کے عقدِ نکاح میں دے دی تھی۔

مولانا عبدالحی کچھ بڑے ہوئے تو حصولِ علم کے لیے دہلی آئے اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے حلقۂ درس میں شرکت کی۔ ان سے کتبِ درسیہ کی تکمیل کی اور مرتبۂ عالی کو پہنچے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے بھی شرفِ شاگردی حاصل تھا اور ان سے سند و

---

[9] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۱۲ تا ۱۱۴ ــــ احوال علمائے فرنگی محل، ص ۹۸ ــــ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۴ تا ۴۸۶ ــــ تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۲۹ تا ۱۳۱ ــــ نزھۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۴۷، ۲۴۸ ــــ الفوائد البھیہ فی تراجم الحنفیہ مع التعلیقات السنیہ علی الفوائد البھیہ ص ۱۰۴ (حاشیہ)۔

اجازہ سے بھی مفتخر ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز اپنے اس شاگرد پر بہت خوش تھے اور ان کے تدین و صالحیت اور فطانت و ذہانت کی وجہ سے ان پر شفقت فرماتے تھے۔ شاہ صاحب نے اپنی صاحبزادی کی شادی بھی مولانا سے کر دی تھی۔ لیکن اس خاتون سے مولانا کی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور کچھ عرصے بعد وفات پا گئیں۔ ان کی وفات کے بعد اپنے چچا کی لڑکی سے شادی کی، جن سے عبدالقیوم پیدا ہوئے جو تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم و فقیہ گزرے ہیں۔ ان کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جا رہا ہے۔

جب سید احمد شہیدؒ نے نکاح بیوگان کی سنت تازہ کی تو مولانا محمد اسماعیلؒ شہید دہلوی نے محض احیائے سنّت کی غرض سے اپنی بیوہ ہمشیرہ کا نکاح مولانا عبدالحی صدیقی سے کر دیا تھا۔ انتقال کے وقت مولانا نے یہ دو بیوائیں چھوڑیں۔

مولانا عبدالحی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں یہ سب سے زیادہ فقہ حنفی کے عالم اور درسیات میں ماہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھیں میرٹھ میں مفتیِ عدالت کا عہدہ پیش کیا گیا اور انھوں نے شاہ صاحب سے اجازت لے کر یہ عہدہ قبول فرمایا۔ یہ اس زمانے میں بہت بڑا منصب تھا، جس پر اسی عالم کو متعین کیا جاتا تھا جو فقہیات میں عبور و مہارت رکھتا ہو۔ کچھ مدت تک مولانا عبدالحی یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔

حضرت سید احمد شہید بریلوی جب نواب امیر خاں سے علیحدگی اختیار کر کے وارد دہلی ہوئے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ایک مستقل جماعت کی تاسیس و تنظیم کا سلسلہ شروع کیا، اس زمانے میں مولانا عبدالحی بھی دہلی میں مقیم تھے۔ اسی اثنا میں انھیں سید صاحب سے کسبِ فیض کا موقع ملا اور ان سے بیعت ہوئے۔

سید صاحب سے مولانا کی بیعت کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن انھوں نے شاہ عبدالعزیز سے اسرارِ نماز اور حضورِ قلب کے بارے میں استفسار کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ کتبِ اخلاق و تصوف میں اس کی تفصیل مرقوم ہے۔ امام غزالیؒ کی احیاء علوم الدین کا مطالعہ اس ضمن میں ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ مرشد کامل

کے بغیر حصولِ مرام مشکل ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے ان کو سید احمد بریلوی سے رجوع کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ اس اہم کام کے لیے وہ زیادہ موزوں ہیں۔ چنانچہ مولانا ممدوح نے سید صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور وہی سوال کیا جو شاہ صاحب سے کیا تھا۔ سید صاحب نے جواب میں اس کی پوری کیفیت بیان کر کے فرمایا:

مولانا صاحب! حصولِ ایں مقصد بہ گفتگو راست نمی آید۔ ہمیں نماز است کہ دربدءِ نبوت سید الانبیا (صلی اللہ علیہ وسلم) را حضرت جبرئیل امین بحکم رب العالمین برائے تعلیم آں امامت فرمودہ اند۔ بیا، برخیز و تحریمہ دو رکعت نماز بہ اقتدایم بربند۔ مولانا علیہ الرحمۃ حسب المامور بہ عمل آوردہ، تحریمہ دو رکعت نماز بہ اقتدائے آں عالی جناب بربستند۔ دریں مقام اکثر آں عالی مقام (یعنی مولانا عبدالحی) بیان می فرمودند کہ آنچہ درآں دو رکعت یافتہ ام ہیچ گاہ در عمرِ خود نیافتہ ام۔[1]

مولانا صاحب! یہ مقصد بات چیت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی نماز ہے جو حضرت جبریل امین نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے خود امام بن کر سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کو آغازِ نبوت میں پڑھائی تھی۔ اُٹھیے اور دو رکعت نماز میری اقتدا میں پڑھیے۔ چنانچہ مولانا نے حسبِ ارشاد سید صاحب کی اقتدا میں دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی ــــ مولانا اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان دو رکعتوں میں جو نعمتیں حاصل ہوئیں، وہ عمر بھر مجھے کہیں نہ مل سکیں۔

بلاشبہ مولانا عبدالحئی بہت بڑے عابد و زاہد اور جلیل القدر عالم و فقیہ تھے۔ خود شاہ عبدالعزیز، مولانا موصوف کو "شیخ الاسلام" اور مولانا محمد اسماعیل کو "حجۃ الاسلام" کے پرشکوہ القاب سے یاد فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ شاہ صاحب نے فرمایا کہ "تفسیر قرآن مجید میں عبدالحی میرا نمونہ ہے اور تحریر میں رشید الدین، حدیث میں مرزا حسن علی اور فقہ میں اسحاق۔" مولانا محمد اسماعیل کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا "اسماعیل کا علم کسی خاص شعبے میں محدود نہیں۔ جن لوگوں

---

[1] مخزن احمدی، ص ۳۵۔

نے میرے عہدِ شباب کا علم دیکھا ہے، اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو اسماعیل کو دیکھ لیں[۱۱]۔"

نواب وزیر الدولہ نے بھی "وصایا" میں نماز سے متعلق سید احمد شہید سے مولانا عبدالحیی کی گفتگو کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا نے سید صاحب سے صحابہ کرام کی نماز کا اشتیاق ظاہر کیا تو سید صاحب نے اس کا طریقہ بیان کر دیا۔ مولانا نے نمازِ عشا کے بعد اسی طریقے کے مطابق دو رکعت نفل کی نیت باندھی۔ سید صاحب حجرے کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ مولانا نے پوری رات ان ہی دو نفلوں میں گزار دی۔ بس اُس وقت سے سید صاحب کے ساتھ ایسی عقیدت اور راہِ ایمان پر ایسی استقامت نصیب ہوئی کہ اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا[۱۲]۔

مولانا کو سید صاحب سے انتہائی محبت تھی اور وہ آخر دم تک ان کے دامن عقیدت سے وابستہ رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خدا نے ایسے شیخ طریقت کی خدمت تک پہنچایا ہے جیسے حضرت خضر کی زیارت سے بہرہ مند ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنے لیے اُن سے دعائے خیر کی التجا کے سوا کوئی دنیوی غرض نہیں۔

وقتِ ارادت و بیعت سے لے کر ہمیشہ سید صاحب کے ساتھ رہے۔ ۱۲۳۷ھ میں فریضۂ حج بھی انہی کے ساتھ ادا کیا اور یہ مبارک سفر اسی جہاز میں کیا جس میں سید صاحب سوار تھے۔ سفرِ حج ہی کے دوران یمن کے نامور محدث قاضی محمد بن علی شوکانی سے مکاتبتاً حدیث کی سند لی۔ ان کی کتاب الموضوعات بھی مولانا ہی ہندوستان لائے، اس سے قبل برِصغیر میں یہ کتاب موجود نہ تھی۔ قاضی شوکانی نے ان کو بعض دیگر تصنیفات بھی مرحمت فرمائیں اور ان کی روایت کی اجازت سے بھی سرفراز کیا۔

مولانا بہت اچھے واعظ اور مقرر تھے۔ بدعات کے رد، سنت کے احیا اور جہاد کی ترغیب میں نہایت مؤثر وعظ کہتے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا۔ وعظ کی ابتدا مدرسے کی چار دیواری سے ہوئی۔ جب لوگ زیادہ تعداد میں آنے لگے اور سامعین کا حلقہ بہت بڑھ گیا تو مجالسِ وعظ دہلی کی جامع مسجد میں منعقد ہونے لگیں۔

مولانا بہت بڑے مناظر بھی تھے۔ جہاں اپنے نقطۂ نظر سے کوئی چیز کتاب و سنت کے کسی حکم کے خلاف پاتے، میدان میں نکل آتے اور اس میں کوئی مصلحت ان کا راستہ

---

۱۱ سید احمد شہید ص ۱۱۸

۱۲ وصایا الوزیر علیٰ طریقۃ البشیر والنذیر۔ ج ۲ ص ۱۰۷۔

نہ روک سکتی۔ پوری کوشش فرماتے کہ تمام معاملات احکام شریعت کے مطابق طے ہوں۔ایک مرتبہ بعض مسائل میں مولانا رشید الدین دہلوی مرحوم سے اختلاف پیدا ہو گیا۔مولانا رشید الدین کا شمار بھی فحول علمائے برِ صغیر میں ہوتا تھا اور مولانا عبدالحی بھی علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔مولانا اسماعیل شہید دہلوی بھی زیرِ بحث مسائل میں مولانا عبدالحی کے حامی تھے۔ مولانا رشید الدین اور مولانا عبدالحی کے درمیان تحریری مناظرہ ہوا، جو انھوں نے ایک رسالے کی صورت میں مرتب کر دیا تھا۔[۱۳]

کہا جاتا ہے کہ معترضین کی طرف سے مولانا رشید الدین سترہ سوال مرتب کر کے لائے تھے۔وہ سامنے آئے تو مولانا عبدالحی نے فرمایا:

ملائے محض نیستم، سپاہ گری ہم دانم۔اگر باساز و تفنگ گراں بار قطع یک منزل راہ پیادہ نمودہ باشم و تعب آں دامن گیر حالِ من باشد، درآں وقت نیز اگر سوالات پیش خواہید نمود، بہ تائید تعالیٰ جواب باصواب خواہید یافت۔[۱۴]

میں نرا ملا نہیں، سپاہ گری بھی جانتا ہوں۔اگر بھاری بندوق اور گولہ بارود لے کر ایک منزل پیادہ پا طے کر کے آؤں اور تکان کے باعث چور ہو جاؤں،اس وقت بھی آپ جو سوالات پیش کریں گے، خدا کی مدد سے ان کا ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا۔

مولانا عبدالحی چونکہ بہت بڑے فقیہ عالم دین تھے، اس لیے لوگ ان سے فقہی مسائل کثرت سے دریافت کرتے تھے اور ان کے فتوے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔[۱۵]

مولانا ممدوح اپنی فراوانیٔ علم اور بیماری و نقاہت کے باوجود نہایت جفاکش اور ہمت ور تھے۔امیر المجاہدین سید احمد شہید جہاد کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے مگر سید صاحب نے ان کو روک دیا۔اور دو اور بزرگوں ——— مولانا

---

۱۳ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۵۰۔

۱۴ جماعت مجاہدین، ص ۱۱۲۔

۱۵ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۵۰۔

عبدالقدوس اور حاجی احمد — کو ارادت مندوں کی تعلیم و تربیت اور بعض ضروری انتظامات کی تکمیل پر مامور فرمایا۔ مولانا کو سید صاحب کی یہ مفارقت گوارا نہ تھی، لیکن تعمیلِ حکم ضروری تھا۔ شدید خواہش کے باوجود ان کے ساتھ نہیں جا سکے۔ تاہم حکمِ ثانی کا اِنتظار رہا۔ پانچ مہینے کے بعد نامۂ طلب صادر ہوا۔ جلدی جلدی سامانِ سفر تیار کیا اور روانہ ہو گئے۔ اگرچہ بیماری کی وجہ سے نقاہت کا غلبہ تھا، مگر اپنے رفقائے سفر کی معیت میں تھانیسر، مالیر کوٹلہ، ممدوٹ اور بہاول پور کے راستے سے سرحد پار پہنچے۔ راستے میں سخت بیمار بھی ہوئے، لیکن عزم اور ارادے کی پختگی برقرار رہی اور سید صاحب اور مجاہدین سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

سید صاحب کی کتاب "صراطِ مستقیم" کی ترتیب میں بھی مولانا شریک تھے۔ سید صاحب اپنی مجالس میں جو حقائق و معارف ارشاد فرماتے، مولانا محمد اسماعیل شہید اُنھیں فارسی میں قلم بند کر کے سید صاحب کو سُناتے تھے۔ کتاب کا اکثر حصّہ مولانا اسماعیل نے مرتب کیا اور دو باب مولانا عبدالحی نے لکھے۔

قیامِ حرمین کے زمانے میں مولانا عبدالحی نے "صراطِ مستقیم" کا عربی میں ترجمہ کر دیا تھا تاکہ عرب کے اہلِ علم بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ مولانا عبدالحی نے نکاحِ بیوگان کے مسئلے پر بھی ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔ لیکن اس کے متعلق مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں: "یہ (رسالہ) خود سید صاحب کا ہے اس لیے کہ اس کے تمام مطالب سید صاحب نے ارشاد فرمائے تھے۔ میں نے اس کے جتنے قلمی نسخے دیکھے، ان میں اس کا انتساب سید صاحب ہی سے کیا گیا تھا۔"[۱۶]

بہر حال مولانا عبدالحی علم و فضل میں بہت اُونچا مقام رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں خود شاہ عبدالعزیز ان کی تعریف فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ کہا کہ علمِ تفسیر میں عبدالحی میرا نمونہ ہیں۔ ایک خط میں اُنھوں نے مولانا عبدالحی اور مولانا اسماعیل کو "تاج المفسرین"

۱۶؎ جماعت مجاہدین ص ۱۱۷

فخر المحدثین اور سر آمدِ علمائے محققین" لکھا۔ یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، منطق وغیرہ میں مجھ سے کم نہیں۔ دونوں کو علمائے ربانی میں شمار کیا۔

مولانا عبدالحی بہت نرم مزاج اور حلیم الطبع تھے۔ عمل و کردار، علوِ اخلاق، تاثیرِ وعظ، عذوبتِ لسان، تقلیلِ غذا، پاکیزگیٔ قلب اور قناعتِ لباس و غذا میں اپنی مثال آپ تھے۔ کم گوئی، توکل علی اللہ اور تمکنت و وقار ان کا شیوہ تھا۔ سنتِ رسول ؐ سے محبت و انسلاک، بدعات و رسوم سے تنفر اور عباداتِ الٰہی میں انہماک میں خاص طور سے مشہور تھے۔ کوئی نصیحت کرتا تو خوش ہوتے اور اپنی تعریف سنتے تو ناراضی فرماتے۔ جامع الصفات بزرگ تھے اور تقویٰ و صالحیت کے نشان ان کے چہرے پر نمایاں تھے۔

مولانا ممدوح کبرسنی کو پہنچ گئے تھے اور کئی عوارض انہیں لاحق ہو گئے تھے۔ بواسیر کا بھی شدید عارضہ تھا۔ اس کے درد نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا، اور بیماری بڑھتی گئی، یہاں تک کہ نزع کا عالم طاری ہو گیا۔ کسی وقت بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی اور کسی وقت ہوش میں آ جاتے۔ سید احمد شہید کو پتا چلا تو تشریف لائے۔ جب ہوش آیا اور سید صاحب کو دیکھا اور پہچانا تو آپ نے پوچھا، اب کیا حال ہے؟ کہا بہت تکلیف ہے، آپ میرے لیے دعا کریں اور میرے سینے پر اپنے قدم رکھیں کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے مجھ کو نجات دے۔ سید صاحب نے فرمایا، مولانا صاحب! آپ کا سینہ علوم قرآن و حدیث کا گنجینہ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ میں اس پر قدم رکھوں۔ پھر بسم اللہ پڑھ کر دستِ مبارک سینے پر رکھا۔ مولانا کو کچھ تسکین ہوئی اور "اللّٰھم الحقنی بالرفیق الاعلیٰ" کے الفاظ زبان پر جاری ہوئے اور یہی الفاظ کہتے کہتے انتقال فرمایا۔[۱]

۸ شعبان ۱۲۴۳ھ (۲۴ فروری ۱۸۲۸ء) کی شب کو آزاد علاقے میں بمقام خم ان کی وفات ہوئی۔

---

[۱] جماعت مجاہدین صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵ بحوالہ وقائع احمدی ص ۵۲۵

دوسرے دن صبح کے وقت مولانا محمد اسماعیل دہلوی، مولانا محمد حسن رام پوری، قاضی علاءالدین بھگردی، میاں نظام الدین چشتی اور میاں جی محی الدین نے غسل دیا اور اس دوران سید صاحب مولانا کے فضائل و محاسن بیان کرتے رہے۔ فرمایا، مولانا عبدالحی دینِ اسلام کے ایک رکن تھے اور بہت بابرکت شخص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنے ہاں بُلالیا۔ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

سید صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ حزن و ملال میں مبتلا تھے۔ جنازہ اُٹھانے والوں میں وہ خود بھی شامل تھے۔ نماز جنازہ انہی نے پڑھائی باشندگانِ خر کے علاوہ تقریباً سات سو مجاہدین شریکِ جنازہ تھے۔ مقام خر کے جنوب مشرق میں ایک نہر کے فاصلے پر قبرستان تھا، جس میں جماعتِ مجاہدین کے اس مایۂ ناز شیخ الاسلام کو سپردِ خاک کیا گیا۔ آج کل ان کا مرقد "دلجی بابا" کا مزار کہلاتا ہے۔

مولانا عبدالحی نے وفات سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھوایا تھا جس میں تمام چیزیں اپنی اہلیہ محترمہ (والدۂ مولانا عبدالقیوم) کے حوالے کردی تھیں۔ مولانا عبدالقیوم کی عمر اس زمانے میں تیرہ چودہ سال ہوگی۔ وہ سید صاحب کے ساتھ سرحد پار چلے گئے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد سید صاحب کا یہ معمول تھا کہ عبدالقیوم کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے۔ بعد میں اس خیال سے اُنھیں ہندوستان واپس بھیج دیا کہ ان کی والدہ کو مولانا کے انتقال کی خبر پہنچے گی تو لازماً مغموم ہوں گی۔ ان کا غم غلط کرنے کے لیے بیٹے کو ان کے پاس رہنا چاہیے۔ عبدالقیوم کے دو حقیقی ماموں —— شیخ جلال الدین اور شیخ صلاح الدین —— بھی جو سید صاحب کی رکاب میں سرحد پار پہنچے تھے اور جماعتِ مجاہدین میں شریک تھے، ان کے ساتھ ہندوستان آئے۔[۱۸]

---

[۱۸] فتاویٰ عزیزی، ج ۱ ص ۸۶ —— ابجد العلوم ص ۹۱۵، ۹۱۶ —— الیانع الجنی ص ۷۶ —— تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۱۴ —— سید احمد شہید ص ۱۱۶، ۱۱۷ —— سیرت سید احمد شہید، ص ۳۶۵ تا ۳۷۳ —— (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

۱۱ ـــ سید عبدالسلام حسینی ہسوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ایک مقام ہسوہ ہے، جو اعمالِ فتح پور میں واقع ہے اِس میں تیرھویں صدی ہجری اور اُنیسویں صدی عیسوی میں ایک بزرگ مولانا عبدالسلام ہسوی گزرے ہیں، جو اپنے علاقے اور عہد کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ والد کا اسمِ گرامی شاہ ابوالقاسم نقشبندی تھا۔

مولانا عبدالسلام ۱۲۲۴ھ کو موضع ہسوہ میں پیدا ہوئے اور کچھ ہوش سنبھالا تو حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر ابتدائی اور متوسط درجے کی درسی کتابیں اپنے عمِ محترم سید سراج الدین احمد حسینی واسطی سے پڑھیں۔ بعد ازاں عازمِ لکھنؤ ہوئے، وہاں شیخ معین الدین کڑوی، مولانا محمد معین لکھنوی اور بعض دیگر اساتذہ سے کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر وطن واپس لوٹے اور اپنے والدِ محترم شاہ ابوالقاسم حسینی واسطی سے جو اپنے عصر کے کبار مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے، اخذِ طریقت کیا اور ایک مدت تک اُن سے مشغولِ استفاضہ رہے۔ شاہ ابوالقاسم نے ۶ ربیع الاوّل ۱۲۶۶ھ کو اپنے وطن ہسوہ میں وفات پائی۔ والد کی وفات کے بعد لائق بیٹے نے دہلی کے لیے شدِ رحال کیا۔ اس زمانے میں دہلی میں شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی کا غلغلۂ درسِ حدیث بلند تھا، سید عبدالسلام نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور تفسیر و حدیث کی تحصیل کی۔ اسی زمانے میں شیخ عبدالغنی ممدوح کے برادرِ مکرم شیخ احمد سعید مجددی دہلوی سے تصوف و طریقت میں حصولِ فیض کیا اور تین سال ان کی صحبت میں رہے۔ ۱۲۶۱ھ میں علومِ مروجہ سے فارغ ہوئے۔ جب علوم میں مہارت حاصل ہو گئی اور مرتبۂ شیخیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ـــ جماعت مجاہدین ص ۱۱۱ تا ۱۱۸ ـــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۴۹، ۲۵۰۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۲۵ تا ۱۲۸ ـــ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۴۱۰ ـــ آثار الصنادید ص ۲۷۰ ـــ سوانح احمدی ص ۱۶ تا ۱۹۔

کو پہنچ گئے تو مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ عرصے تک وطن میں رہ کر لوگوں کو فیض پہنچایا۔
۱۲۸۲ھ میں سفرِ حجاز پر روانہ ہوئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ قیامِ حجاز کے دوران میں شیخ احمد دحلان شافعی مکی سے سندِ حدیث لی اور شیخ علی بن یوسف ملک باشلی حریری سے "دلائل الخیرات" کی سند سے بہرہ ور ہوئے۔

مولانا عبدالسلام ہسوی زہد و تقویٰ اور عبادت و ورع میں اپنی مثال آپ تھے۔ جامع علم و عمل اور کتاب و سنت کے شیدائی تھے۔ بے مقصد بات سے پرہیز کرتے اور اپنے معاصرین پر تنقید و تشنیع سے دامن کشاں رہتے۔ حفظِ لسان ان کا شیوہ تھا۔ سکوت، قناعت، عفت، ایثار اور استغنا کے اوصافِ حسنہ سے متصف تھے۔ معرفت و سلوک کے دروازے اللہ نے ان کے لیے وا کر دیے تھے اور راسخین فی العلم میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نہایت پاکیزہ اخلاق بزرگ تھے۔ نہ اپنے سے بغض رکھنے والوں کی پروا کرتے اور نہ تعریف کرنے والوں سے خوش ہوتے۔ کسی کو مطعون قرار دینا یا کسی کو لائقِ ملامت ٹھہرانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ سچی اور صحیح بات کہنے سے کوئی انھیں روک نہیں سکتا تھا۔ ان سے شرعی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وضاحت سے بتاتے۔ اگر کسی مسئلے میں انھیں تردد ہوتا تو صاف لفظوں میں کہہ دیتے کہ مجھے اس کا علم نہیں، کسی دوسرے عالم سے پوچھو۔ یہ ان میں بہت بڑی صفت تھی، ورنہ عام طور پر علما کو دیکھا گیا ہے کہ اپنی علمی کمزوری کا اظہار نہیں کرتے، غلط ہو یا صحیح کہتے چلے جاتے ہیں۔

ان کا معمول تھا کہ نصف رات کو اٹھتے اور نمازِ تہجد میں مشغول ہو جاتے۔ ذکرِ الٰہی اور خوفِ خدا کا غلبہ اُن پر طاری رہتا۔ فجر کی نماز مسجد میں جا کر باجماعت غلس میں ادا کرتے۔ پھر اشراق تک وظائف و اوراد میں مصروف رہتے۔ نمازِ اشراق کے بعد لوگوں کو تلقینِ اذکار فرماتے۔ پھر قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے۔ بعد ازاں گھر جاتے اور اہلِ خانہ کو ضروری مسائل بتاتے۔ پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرتے۔

ان کا تمام وقت عبادت، طلبا کے درس و افادہ، مطالعۂ کتب اور فتویٰ نویسی میں گزرتا۔ بے شمار لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے جو مختلف فقہی مسائل بھی دریافت کرتے۔

فتوے بھی لکھواتے اور وظائف بھی پوچھتے۔ ان کا دروازہ ہر شخص کے لیے ہر آن کھلا رہتا۔ کسی سے ایسی بات نہ کہتے جو دل شکنی کا باعث ہو۔

اس زمانے میں جو مسائل علما کے زیر بحث رہتے، ان میں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ دیہات میں نمازِ جمعہ پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ صاحب ترجمہ مولانا ممدوح دیہات میں نمازِ جمعہ کے قائل تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں نمازِ جمعہ ادا کرنی فرض ہے۔ اس مسئلے میں متعدد علمائے مشاہیر سے ان کے مباحثوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، جن میں مفتی محمد یوسف انصاری لکھنوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد امیر فتح پوری کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات علما دیہات میں نمازِ جمعہ کے قائل نہ تھے اور مولانا اُن سے مخالف رائے رکھتے تھے۔ اس موضوع سے متعلق اُنھوں نے چند رسالے بھی تحریر فرمائے۔ مثلاً ایک رسالے کا نام تذکرۃ الجمعہ، ایک کا اشاعتہ الجمعہ اور ایک کا نام تبصرۃ الجمعہ ہے۔

اِن رسائل کے علاوہ اُنھوں نے جوازِ تقلید کے بارے میں بھی ایک رسالہ لکھا جس کو "التمہید فی اثبات التقلید" کے نام سے موسوم کیا۔

ردِ شیعہ سے متعلق بھی اُنھوں نے متعدد رسائل تصنیف کیے، جن میں تذکرہ اثنا عشریہ اور تفضیح الشیعہ زیادہ مشہور ہیں۔

فقہی مسائل سے متعلق اُنھوں نے بہت سے فتوے بھی جاری کیے۔

مولانا عبدالسلام ہسوی نے ۴ شوال ۱۲۹۹ھ کو لعارضہ دُنبل وفات پائی۔[۱۹]

۱۲ — قاضی عبدالسّلام عباسی بدایونی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر بدایوں کی سرزمین علم وفضل کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز و شاداب

---

[۱۹] نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۲۶۳ تا ۲۶۵ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۰، ۱۲۱۔

رہی ہے۔ اس میں بے شمار اصحابِ کمال اور اربابِ فضیلت پیدا ہوئے اور ان کی خدماتِ گوناگوں کا دائرہ دُور دور تک پھیلا۔ تیرھویں صدی ہجری اور اُنیسویں عیسوی میں اس شہر کی زرخیز مٹی سے جن بزرگوں نے جنم لیا، ان میں صاحبِ ترجمہ قاضی عبد السلام عباسی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ان کے والد کا اسمِ گرامی عطاء الحق عباسی تھا۔

قاضی عبد السلام کی ولادت ۱۲۰۱ھ میں بدایوں میں ہوئی اور اسی شہر میں نشو و نما کی منزلیں طے کیں۔ اپنے عم محترم قاضی بہاء الحق قاسمی سے جو بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی لکھنوی کے تلمیذ تھے، حصولِ علم کیا اور فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ماہرین میں شمار کیے گئے۔ اخذِ طریقت کا شرف سید آلِ احمد حسینی مارہروی سے حاصل کیا۔

جب علوم فقہ میں مہارت پیدا کر لی، دیگر علوم متداولہ سے بھی فارغ ہو گئے اور طریقت کی منزلیں بھی طے کر لیں تو رام پور شہر کے قاضی مقرر کیے گئے اور عرصے تک محکمۂ قضا پر متعین رہے۔

قاضی عبد السلام بدایونی، بڑے ذہین و فطین بزرگ تھے۔ مختلف علوم پر عمیق نگاہ رکھتے تھے اور اس سلسلے میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی بہت تیز تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ زاد الآخرت:۔ یہ قرآنِ مجید کی تفسیر ہے، جو اردو زبان میں ہے اور منظوم ہے۔ یہ تفسیر انہوں نے ۱۲۴۴ھ میں لکھی۔ تقریباً دو لاکھ اردو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا نام بھی تاریخی ہے۔

۲۔ الشراحات العالیہ: یہ اصولِ فقہ میں ہے اور المنار کی شرح ہے۔

۳۔ علم الفرائض: یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور میراث سے متعلق ہے۔

۴۔ اخبار الابرار: یہ علم تصوف میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۵۔ شرح دلائل الخیرات: یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور دلائل الخیرات کی شرح ہے۔

۶۔ مثنوی طوفانِ عشق: یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور مثنوی ہے۔

قاضی عبد السلام عباسی بدایونی بہت سے اوصاف کے مالک تھے۔ مفسر بھی تھے، فقیہ بھی تھے اور شاعر بھی ـــــ! ۵ ذیقعدہ ۱۲۸۹ھ کو ان کا

انتقال ہوا۔[20] خزینۃ الاصفیا اور حدائق الحنفیہ میں سنِ وفات ۱۲۵۰ھ اور تذکرہ علمائے ہند میں ۱۲۵۵ھ لکھا ہے جو غلط ہے۔

۱۳۱۔ سیّد عبدالشکور بریلوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں رائے بریلی ایک مشہور شہر ہے اور یہ وہی شہر ہے جس میں سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے اور برِصغیر پاک و ہند میں غیر اسلامی حکومت کے خلاف جہاد کیا۔ پھر ان کے ارادت مند ۱۹۴۷ء تک انگریزی اقتدار کو للکارتے رہے۔ یہ شہر صدیوں سے علم و علما اور اصحابِ فضل و کمال کا مسکن ہے اور اب تک اس کی یہ شہرت قائم ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس بلدۂ علم میں جو حضرات پیدا ہوئے اُن میں سیّد عبدالشکور حسنی حسینی بریلوی کا نام نامی لائقِ تذکرہ ہے۔ ان کے والد کا اسمِ گرامی سیّد محی الدین اور جدِّ امجد کا سیّد عبدالمقتدر تھا۔

سیّد عبدالشکور بریلوی کی ولادت ۱۲۲۴ھ میں ہوئی۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو سیّد محمد طاہر بریلوی اور دیگر علما کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور علومِ متداولہ کی تحصیل کی۔ نہایت ذکی، ذہین اور قوی حافظ تھے۔ فقہ، میراث، حساب، سِیَر و رجال اور انساب کے ماہر تھے۔ تمام علومِ عربیہ میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔

آخر عمر میں بریلی سے ٹونک چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

---

[20] تذکرۃ الواصلین۔ ص ۲۶۶، ۲۶۷ — قاموس المشاہیر۔ ج ۲۔ ص ۶۲، ۶۳۔ خزینۃ الاصفیاء۔ ج ۲ ص ۳۹۱، ۳۹۲ — حدائق الحنفیہ ص ۴۷۳ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۰ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۷۔ ص ۲۶۵ — اکمل التاریخ حصہ اوّل ص ۷۱ — عین الانسان ص ۴۳ — تذکرہ علمائے ہند (اُردو ترجمہ) ص ۲۹۸، ۲۹۹۔

علمِ انساب ایک نہایت اہم علم ہے، اس میں انھیں دسترس حاصل تھی۔ اس موضوع سے متعلق "گلشنِ محمودی" کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی جو اپنے موضوع میں مفصل و مبسوط کتاب ہے۔

سیّد عبدالشکور بریلوی نے منگل کے روز ۱۴ ربیع الثانی ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی۔[۲۱]

۱۴۔ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی

شیخِ وقت، امامِ عصر، عالمِ کبیر حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی علم و فضل میں نہایت اونچے مرتبے کے مالک تھے۔ علمائے کرام انھیں "سراج الہند" اور "حجۃ اللہ" کے پُرشکوہ القاب سے ملقب کرتے ہیں۔ وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سب سے بڑے بیٹے اور حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کے پوتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز ۲۲ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غلام حلیم تھا۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر اکثر درسی کتابیں اپنے والدِ گرامی شاہ ولی اللہ سے پڑھیں۔ سولہ سال کی عمر کو پہنچے تو ماہِ محرم کی آخری تاریخ ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میں والدِ مکرم وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا نور اللہ بڈھانوی، شیخ محمد امین کشمیری اور شیخ محمد عاشق پھلتی کے حلقہائے درس میں شامل ہوئے اور جو کتابیں والدِ محترم سے نہیں پڑھ سکے تھے وہ ان بزرگوں سے پڑھیں۔ سترہ سال کی عمر میں تحصیلِ علم سے فارغ ہوئے اور باپ کی مسندِ درس سنبھالی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ادبیاتِ عربی، صرف و نحو اور منطق و فلسفہ میں عبور حاصل تھا۔ خط نہایت عمدہ تھا اور خطِ نسخ اور خطِ رقاع میں مرتبۂ کمال پر فائز تھے۔ تیر اندازی اور گھڑ سواری میں بھی ماہر تھے۔ علمِ موسیقی میں بھی درک رکھتے تھے۔ ذکاوت و فطانت میں یگانہ، فہم و فراست میں منفرد اور حفظ و ذہانت میں بے مثال تھے۔ مسندِ درس

---

[۲۱] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۶۶۔

پر بیٹھتے ہی ان کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی تھی اور دُور دراز سے علما و طلبا حاضرِ خدمت ہونے اور استفادہ کرنے لگے تھے۔

تلامذۂ کرام

شاہ صاحب ساٹھ سال تک درس حدیث دیتے رہے۔ ان کے فضل و کمال کی وجہ سے علامہ تفضل حسین کی وساطت سے انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسۂ کلکتہ میں دعوتِ درس و تدریس دی گئی۔ دہلی میں اگرچہ ان کے روزگار کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا، تاہم انھوں نے دہلی کی سکونت ترک نہ کی اور سادہ زندگی بسر کرنے اور علوم دینی کی نشر و اشاعت کو ہر شے پر مقدم رکھا۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ پورے برصغیر میں ان کے علم و فضل کی دھوم تھی۔ ملک کے ہر علاقے اور ہر حصے سے تشنگانِ علوم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے۔ جو حضرات بعض دیگر علمائے عصر سے مستفید ہو چکے تھے، وہ بھی اُن کی خدمت میں آتے اور سند و اجازہ سے بہرہ مند ہوتے۔ بے شمار لوگوں نے ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ جس طرح ان کے والدِ گرامی حضرت شاہ ولی اللہ کے تلامذہ کی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں، اسی طرح ان کے شاگردوں کی تعداد بھی حدِ شمار سے باہر ہے۔ پھر جن لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا، وہ آگے چل کر علم و کمال، تقویٰ و تدین، تحقیق و تدقیق، تدریس و تعلیم، تصنیف و تالیف، نشر و اشاعتِ دین، وعظ و تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ میں بلند مرتبے کو پہنچے۔ ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں: شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، مولانا محمد اسماعیل شہید، شاہ محمد اسحاق، شاہ محمد یعقوب، شاہ غلام علی، مفتی صدرالدین، سید احمد شہید بریلوی، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا عبدالحی بڑھانوی، میر محبوب علی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، شاہ عبدالغنی، مولانا حسین احمد ملیح آبادی، نواب صدیق حسن خاں کے والدِ مکرم سید اولاد حسن قنوجی، مولانا حسن علی لکھنوی، شاہ ابوسعید مجددی، مولانا رؤف احمد مجددی، شاہ احمد سعید مجددی۔

ان کے شاگردوں میں سے یہ ان چند حضرات کے نام ہیں، جن میں سے ہر بزرگ علم و فضل میں یکتا تھا اور ہر ایک نے تحقیق و کاوش کے مختلف میدانوں میں جو کارنامے انجام دیے وہ تذکرہ و رجال کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ شاگردوں کے مقام و مرتبے کی رفعت سے استاد کی عظمت کا بخوبی پتا چل سکتا ہے۔

مختلف زبانوں پر عبور

شاہ صاحب بوقلموں اوصاف کے مالک تھے۔ وہ جہاں علوم عربی میں ممتاز تھے، وہاں بہت سی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی زبانوں کے تو ماہر تھے ہی، اُردو اور عبرانی میں بھی اُنھیں آگاہی حاصل تھی۔ اُردو زبان ان کے عہد میں خاصی مقبول و مروج ہوچکی تھی اور اس زمانے کے متعدد نامور شعرا جن میں خان آرزو، سودا، میر، درد اور مرزا مظہر جان جاناں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اپنے کلام بلاغت نظام سے گیسوئے اُردو کو سنوار چکے تھے۔ خود شاہ ولی اللہ کو بھی اُردو کی عام پذیرائی اور ملک گیر مقبولیت کا بہت احساس تھا اور وہ اپنے فرزندانِ گرامی کو اُردو سیکھنے کی تلقین کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق شاہ عبدالعزیز اُردو زبان کی تعلیم کے لیے خواجہ میر درد کی خدمت میں جاتے، انہماک و توجہ سے خواجہ صاحب کی تقریر سنتے تھے اور اُردو محاورات کو سمجھنے کی بالخصوص کوشش کرتے۔ شاہ ولی اللہ اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ مستقل فن ہیں، اسی طرح اصولِ زبان بھی ایک باقاعدہ فن ہے۔ اُردو زبان کے موجد اور اس میں کامل درک رکھنے والے خواجہ میر درد ہیں، اس فن کے حصول کے لیے ان کی صحبت کو غنیمت سمجھو کیونکہ خواجہ صاحب چراغِ سحری ہیں۔[۲۲]

شاہ عبدالعزیز کے بھائی شاہ عبدالقادر بھی خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے بھی اُردو زبان خواجہ صاحب ممدوح سے سیکھی تھی۔

شاہ عبدالعزیز کو اُردو زبان پر اس درجے عبور تھا کہ مشہور شاعر ابراہیم ذوق نے ایک مرتبہ اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا اور اُسے شاہ صاحب کے پاس لے گئے کہ وہ اس کی صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں۔ اُنھوں نے قصیدہ سن کر پڑھنے کی اجازت دی۔ اس کے بعد ولی عہد بہادر شاہ ظفر نے اپنے شُقّہ (رقعہ) کے ساتھ اُسے

۲۲؎ ملفوظات شاہ عبدالعزیز (اُردو ترجمہ)، ص ۱۱۔

پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ اُنھوں نے جو کچھ ذوق مرحوم سے کہا تھا وہی ولی عہد کو جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا:

بو د بگفتۂ من حرفِ اعتراض چناں — کسے بدیدۂ بینا فرو برد انگشت

یعنی میری بات پر اعتراض کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنی دیدۂ بینا میں اُنگلی ڈال لے۔

شاہ صاحب کے اِس جواب سے ذوقؔ کا حوصلہ اور بڑھا اور دل کو اتنی تقویت پہنچی کہ دربارِ شاہی میں جاکر قصیدہ سُنایا اور اس کے بڑے چرچے ہوئے۔[۲۳]

شاہ صاحب اپنے دَور کے نہایت باخبر عالم دین تھے، عبرانی زبان سے بھی اُنھیں دلچسپی تھی۔ یہ زبان اُنھوں نے باقاعدہ سیکھی تھی اور تورات کا علم اسی زبان میں حاصل کیا تھا۔ فرماتے ہیں:

فاضلے از اکابر علما از تحقیق توریت بلسانِ عبرانی می کردم[۲۴]

یعنی میں تورات کے ایک فاضل شخص سے جس کا شمار اس کے اکابر علما میں ہوتا ہے، عبرانی زبان میں اس کے متعلق تحقیق کرتا رہا۔

قرآن اور حدیث سے شغف و تعلق

شاہ صاحب کو یوں تو تمام مروجہ علوم و فنون پر دسترس تھی، لیکن قرآن مجید اور حدیث رسُول صلی اللہ علیہ وسلم سے اُنھیں بالخصوص انتہائی شغف اور بہ درجہ غایت تعلق تھا۔ اُنھوں نے اپنی حیاتِ مُبارکہ کا زیادہ تر حصہ حدیثِ نبوی کی ترویج و اشاعت اور تبلیغ و تدریس میں صَرف کیا۔ حدیث کی خدمت کو وُہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی متاع قرار دیتے تھے۔ طلبائے علم اور اصحاب ارادت کو بھی اتباع حدیث کی تلقین اور احیائے سنت کی تاکید فرماتے۔ قرآن مجید کی تفسیر احادیث کی روشنی میں کرتے اور اس کے مطالب و معانی

۲۳؎ آبِ حیات۔ ص ۴۴۳۔

۲۴؎ ملفوظات شاہ عبدالعزیز، ص ۲۷۔

کی شرح و وضاحت میں حدیثِ نبوی ہی کو پیشِ نگاہ رکھتے۔

قوّتِ حافظہ

شاہ صاحب جن کمالات اور خوبیوں سے مالا مال تھے، ان میں ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کی قوتِ حافظہ نہایت تیز تھی اور یادداشتوں کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے نہاں خانۂ ذہن میں محفوظ تھا۔ ان کو بعض وہ باتیں بھی یاد تھیں جن کا تعلق ان کی عمر کے بالکل ابتدائی دور اور عہدِ طفلی سے تھا۔ اس کا ثبوت ان کے ملفوظات کی ایک تحریر سے ملتا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں پانچ چھ سال کا تھا کہ والدِ ماجد نے ایک شخص کو ایک مسئلہ بتایا جو شافعی مذہب کے مطابق تھا۔"[۲۵]

طالب علمی کے زمانے میں اُنھوں نے جو کچھ لکھا یا پڑھا تھا، وہ پوری طرح یاد تھا۔ "تحفۂ اثنا عشریہ" میں کتبِ شیعہ کے جو حوالے درج ہیں، وہ زیادہ تر حافظے کی مدد سے دیے گئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ سب حوالے صحیح ہیں اور ان کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کی تمام کتابیں ان کے سامنے کھلی پڑی ہیں اور ہر کتاب کو دیکھ کر قلم کو حرکت دیتے ہیں۔

جب وہ مسندِ درس پر رونق افروز ہوتے اور طلبا کی جماعت ان سے مشغولِ استفادہ ہوتی تو ان کے حافظے کی قوتیں خوب جولانیاں دکھاتیں اور وہ دورانِ تقریر میں استشہاد و استدلال کے لیے غیر درسی کتابوں کی طول طویل عبارتیں محض اپنی یادداشت کے بل پر طلبا کو لکھا دیتے۔ قوتِ حافظہ اور ذکاوتِ ذہن کی یہ کیفیت آخرِ عمر تک قائم رہی — زندگی کے کسی حصے، یہاں تک کہ شدید حوادث و آلام کے دور میں بھی اس میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ دقیق سے دقیق علمی مسائل اور نازک سے نازک شرعی نکات کو اس اسلوب سے زیرِ بحث لاتے کہ سامعین تصویرِ حیرت بن جاتے۔ جب اُن سے کوئی علمی سوال کیا جاتا تو بڑے بڑے اہلِ فضل اور اربابِ علم ان کے ہونٹوں کی جنبش کا بے تابی سے انتظار کرتے اور زبان کو حرکت دیتے تو معلومات کا دریا بہنے لگتا۔ وہ اپنے دور کے برِصغیر کی عظیم الشان ہستی تھے اور ان کے فضل و کمال

---

[۲۵] ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیز، ص ۹۸۔

کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

اندازِ خطابت و تقریر

شاہ صاحب جہاں اقلیم علم میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے وہاں تقریر و خطابت اور انداز وعظ و نصیحت میں بھی ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ تقریر کی صلاحیتیں اللہ نے اوائلِ عمر ہی میں ان میں ودیعت کر دی تھیں اور اس ضمن میں اُن کا شہرہ دُور دور تک پھیل گیا تھا۔ ملک کے مختلف علاقوں اور شہروں سے طالبانِ علوم اور متلاشیان حق اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے۔ ایسے دلنشین اور عمدہ طریقے سے وعظ کہتے کہ لوگ انتہائی متاثر ہوتے۔ گفتگو کا ڈھنگ کچھ ایسا تھا کہ مشکل ترین مسائل کی گرہیں خود بخود اُن کے سامنے کھلتی چلی جاتیں۔ ویسے تو محفلِ تبلیغ اور مجلسِ وعظ ہر وقت گرم رہتی، لیکن ہفتے میں دو دن منگل اور جمعے کو بالخصوص دہلی کے کوچہ چیلاں میں مجمع عام میں وعظ کہتے، جس میں دُور دراز کے لوگ انتہائی شوق سے حاضر ہوتے اور فیض حاصل کرتے۔ وعظ خالص قرآن و حدیث کی روشنی میں کہتے جو فصاحت و بلاغت سے بھی مزین ہوتا اور تاریخی حقائق و واقعات کے اعتبار سے بھی اس کی مثال نہ ملتی۔

طلبا سے شفقت

طلبائے علم سے ان کا برتاؤ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ ان کی ضروریات کی کفالت کرتے اور نہایت ہی اُلفت و محبت سے پیش آتے۔ ان کے سوالات کامل توجہ سے سنتے اور اس طرح دلائل و براہین سے جواب دیتے کہ ان کے تمام شکوک رفع ہو جاتے اور وہ مطمئن ہو کر حلقۂ درس سے رخصت ہوتے۔ ان کے قیام و طعام میں بھی حتی الامکان ان کی مدد کرتے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد حصولِ معاش میں بھی اُن سے پورا تعاون فرماتے۔ مفتی صدر الدین ان کے حلقۂ درس سے فارغ ہو کر نکلے تو حصولِ معاش کے لیے عازمِ کلکتہ ہونے کا ارادہ کیا۔ اس کا ذکر شاہ صاحب سے ہوا تو انھوں نے کمالِ شفقت و مہربانی سے وہاں کے مدرسے کے مہتمم مولانا امین اللہ کے نام خط لکھ کر مفتی صاحب ممدوح کو دیا۔ اس خط میں مفتی صاحب کی بہت تعریف کی اور لکھا کہ ان کا شمار دہلی کے فضلائے نامدار میں ہوتا ہے۔ فقہ و اصول، علوم عربیہ اور فنونِ عقلی و نقلی میں ان کا مقام بہت بلند ہے اور یہ کلکتے میں

آپ سے ملیں گے، ان سے اعزاز واکرام کا برتاؤ کریں۔[۲۶]

یہ پورا خط نہایت شان والا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ شاہ صاحب اپنے تلامذہ سے انتہائی شفقت اور مہربانی کا سلوک کرتے تھے۔

اسی طرح اپنے شاگردوں کے اعتراضات بھی بلند حوصلگی سے سنتے اور انھیں طمانیت بخش جواب سے نوازتے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ تذکرہ غوثیہ میں نقل کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی، شاہ صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور شاہ صاحب ان سے بہت تلطف وکرم کا اظہار کرتے تھے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب کی خدمت میں مولانا فضل امام اور مولانا فضل حق (دونوں باپ بیٹا) اور غوث علی شاہ قلندر حاضر تھے۔ مولانا فضل حق نے اپنا ایک قصیدہ شاہ صاحب کو سنایا۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر ٹوکا تو مولانا فضل حق نے شعرائے عرب کے اشعار بطور استشہاد اپنی تائید میں پیش کیے، اس پر مولانا فضل امام نے بیٹے سے کہا "پاس ادب!" مولانا فضل حق نے کہا "یہ تو ادبی گفتگو ہے۔" شاہ صاحب نے فرمایا "تم مجھ سے جو پوچھنا چاہتے ہو کھل کر پوچھو" یعنی اس طرح انھوں نے اپنے لائق شاگرد مولانا فضل حق کی حوصلہ افزائی کی۔[۲۷]

عادات واطوار

شاہ عبدالعزیز نہایت بلند مرتبت خاندان کے فرد تھے اور عالم طفولیت کی منزلیں اونچے ماحول میں طے کی تھیں یہی وجہ ہے کہ وہ عادات واطوار اور اخلاق وکردار کے لحاظ سے ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے تھے۔ امرا کی محفلوں اور رؤسا کی مجلسوں سے انھیں شدید نفرت تھی۔ اس کے برعکس غربا ومساکین، یتامیٰ اور طلبائے علم سے محبت والفت کا برتاؤ کرتے تھے۔ بیماروں کی عیادت، بیواؤں کی امداد، مہمانوں کی تواضع اور مسافروں کی خاطر داری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہر شخص سے خوش ہو کر ملتے اور عجز وانکساری سے پیش آتے۔ عالمانہ غرور ان میں بالکل نہ تھا۔ نفرت و تکبر سے نفور تھے۔ بچپن سے لے کر آخر عمر تک نہایت صاف ستھری زندگی بسر کی۔ تواضع، خلوص اور ہمدردی ان کی نمایاں

---

[۲۶] اتحاف النبلا، ص ۲۶۱۔

[۲۷] مقدمہ ملفوظات شاہ عبدالعزیز (اردو ترجمہ) ص ۱۱

خصوصیات تھیں۔ تقویٰ وللہیت کا پیکر حسین تھے اور ان کی حیاتِ مستعار کا ہر پہلو اپنی مثال آپ تھا۔ دینِ اسلام کو پھیلانے اور احکامِ شرعیہ کو عام کرنے کے لیے انھوں نے جو کوششیں کیں وہ لائقِ صد احترام ہیں۔ ان کی جد وجہد سے دہلی کو مرکزِ دین کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، مسجدیں نمازیوں سے بھر جاتی تھیں، دہلی کی جامع مسجد بڑی وسیع مسجد ہے لیکن نمازیوں کی کثرت سے اپنی وسعت کے باوجود تنگ معلوم ہوتی تھی۔ رمضان المبارک میں بالخصوص مسجدوں میں بے پناہ ہجوم ہوتا تھا۔

شاہ صاحب کے زمانے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو تفسیر، حدیث اور فقہ کے علوم پر زیادہ زور دیتے تھے اور دیگر علوم و فنون کی تحصیل کو غیر مستحسن قرار دیتے تھے، لیکن شاہ صاحب نے کچھ ایسی حکمتِ عملی اختیار کی کہ لوگ دیگر فنون بھی حاصل کرنے لگے۔ ان فنون سے دلچسپی رکھنے والے لوگ شاہ صاحب کی خدمت میں آتے تو وہ انھیں خود پڑھاتے اور اس انداز سے پڑھاتے کہ ان فنون سے طلبا کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوتا۔

حاضر جوابی

شاہ صاحب کوئی خشک عالم نہ تھے، یبوست اور عبوست جو عام طور پر علمائے دین میں پائی جاتی ہے ان میں قطعی طور پر نہ تھی۔ یہ بہت حاضر جواب اور زندہ دل تھے، غیر مذاہب کے اہلِ علم سے مناظرے بھی کرتے اور ہلکے پھلکے انداز میں جس میں لطیفے کا پہلو بھی ہوتا، حریف کو خاموش کرا دیتے۔ عیسائیوں سے ان کی بالخصوص بحثیں رہتیں۔ ہندوستان میں عیسائی پادریوں سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ عہدِ اکبری میں شروع ہوا تھا۔ دورِ اکبری کے مشہور مناظروں میں مولانا سعد اللہ خاں، مولانا عبد اللہ اور شیخ قطب الدین کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے بعد مناظرات کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ شاہ عبد العزیز کے زمانے میں اس میں اور تیزی آگئی تھی، اس لیے کہ اس زمانے میں انگریزوں کی حکومت تقریباً پورے ملک میں قائم ہوگئی تھی اور انگریز اپنے ساتھ عیسائی پادریوں کو بھی لائے تھے تاکہ یہاں عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو دائرۂ عیسائیت میں شامل کرنے کی مہم شروع کی جائے۔ شاہ صاحب اس صورتِ حال سے پوری طرح باخبر تھے اور عیسائیوں کا باقاعدہ مقابلہ کرتے تھے۔

شاہ صاحب کا عیسائیوں سے پہلا مناظرہ ہندوستان کے دار السلطنت دہلی کی جامع مسجد میں ہوا۔ وہ قرآن مجید کا درس دے رہے تھے کہ دورانِ درس میں ایک پادری نے ان سے کہا کہ آگے بڑھنے سے پہلے میرے سوال کا جواب دیجیے۔ شاہ صاحب نے فرمایا، آپ کیا سوال کرنا چاہتے ہیں؟ پادری نے کہا آپ کے پیغمبر زمین میں دفن کیے گئے ہیں اور ہمارے پیغمبر حضرت عیسیٰ کو خدا نے آسمان پہ جگہ دی، لہٰذا ہمارے پیغمبر کا مرتبہ آپ کے پیغمبر سے بڑا ہے۔ شاہ صاحب نے اس اعتراض اور سوال کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کو فارسی کے ان دو شعروں میں بیان کیا گیا ہے:

کسے بگفت کہ عیسیٰ زِ مصطفےٰ اعلیٰ است کہ ایں بہ زیرِ زمیں دفن او بہ اوجِ سما است

بگفتمش کہ نہ ایں حجت قوی باشد حباب بر سرِ دریا گہر بتہِ دریا است[۲۸]

یعنی ایک شخص نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے اونچا مرتبہ رکھتے ہیں، اس لیے کہ رسولِ اکرم تہہِ زمین مدفون ہیں اور حضرت عیسیٰ آسمان کی بلندیوں پر ہیں۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ دلیل قوی نہیں ہے جھاگ ہمیشہ دریا کے اوپر ہوتا ہے اور موتی دریا کی تہہ میں ہوتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور پادری ان کی خدمت میں آیا اور سوال کیا کہ کیا "آپ کے پیغمبر اللہ کے حبیب ہیں؟" فرمایا "ہاں۔!" وہ بولا "تو پھر انھوں نے حضرت حسین کے قتل کے وقت اللہ سے فریاد نہ کی یا ان کی اللہ کے حضور فریاد سنی نہ گئی؟" شاہ صاحب نے جواب دیا "ہمارے نبی نے فریاد تو کی، لیکن اللہ کی طرف سے انھیں جواب ملا کہ تمھارے نواسے کو قوم نے ظلم سے شہید کیا ہے، لیکن ہمیں اس وقت اپنے بیٹے عیسیٰ کا صلیب پر چڑھنا یاد آرہا ہے۔"

یہ جواب سن کر پادری خاموش ہو گیا۔

ایک مرتبہ ایک شخص ان کے پاس کسی مصوّر کی بنائی ہوئی ایک تصویر لایا اور کہا کہ "یہ تصویر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔" انھوں نے کہا "حضرت رسولِ اکرم باقاعدہ غسل کرتے تھے، تم بھی اس تصویر کو غسل دے کر دھو ڈالو۔"

ایک دفعہ ایک ہندو گاڑی بان شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا

۲۸؎ فرنگیوں کا جال، ص ۱۳۷۔

"مجھے یہ بتائیے کہ خدا ہندو ہے یا مسلمان؟" آپ نے فرمایا، "جو میں جواب دوں اُسے خوب سمجھ لینا، وہ یہ ہے کہ اگر خدا ہندو ہوتا تو گئو ہتیا کبھی نہ ہوتی۔"

ایک شخص نے ان سے سوال کیا کہ "کسبی عورتوں کی نمازِ جنازہ پڑھنی درست ہے یا نہیں؟" آپ نے فرمایا "ان کے آشنا مرد ان کی نمازِ جنازہ پڑھ لیا کریں۔"

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ خواجہ میر درد اور شاہ صاحب کا خاندان دہلی کے ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ خواجہ میر درد کے ہاں محفل گرم تھی، شاہ صاحب بھی وہیں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ خواجہ صاحب کی مرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں اور چونکہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں اس لیے سب کے سامنے حاضر تھیں۔ باوجودیکہ شاہ صاحب اس وقت بچے تھے مگر ان کا تبسم اور طرزِ نظر دیکھ کر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے اور کہا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں۔ شاہ صاحب نے کہا کہ ماں بہنوں کو عوام الناس میں لے کر بیٹھنا کیا مناسب ہے؟ خواجہ صاحب خاموش رہے۔[29]

غرض شاہ صاحب بہت حاضر جواب، زندہ دل اور عمدہ خصائل عالم تھے۔ ہر قسم کے لوگ ان کی خدمت میں آتے اور محظوظ ہوتے۔

انگریزوں کے خلاف فتویٰ

شاہ صاحب کا زمانہ سیاسی اعتبار سے نہایت پرآشوب زمانہ تھا، مغل حکومت دم توڑ رہی تھی اور انگریز پورے ملک پر قبضہ جما رہے تھے۔ ان حالات میں شاہ صاحب نے ایک طرف تو درس و تدریس کے ذریعے شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحی بڑھانوی اور سید احمد شہید جیسے نامور مجاہد پیدا کیے جنھوں نے اپنی زندگیاں برصغیر سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنے اور اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے کے لیے وقف کر دیں، دوسری طرف تحریر کا سلسلہ شروع کیا جو نہایت مضبوط اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اس سے لوگ ہر دور میں مستفید ہوتے رہیں گے۔ تحریر کے اس شاندار ذخیرے میں ایک فتویٰ بھی ہے جو انھوں نے انگریزوں کے خلاف جاری کیا۔ اس فتوے کے

۲۹۔ آبِ حیات ص ۱۳۶

الفاظ یہ ہیں :-

دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست وحکم رؤسائے نصاریٰ بے دغدغہ جاری است، ومراد از اجراءِ احکامِ کفر ایں ست کہ درمقدمہ ملک داری وبندوبست رعایا واخذ خراج وباج وعشور، اموالِ تجارت وسیاستِ قطاع الطریق وسراق وفیصل خصومات وسزائے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند آرے اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ وعیدین واذان وذبح بقر تعرض نہ کنند نہ کردہ باشند۔ لیکن اصل الاصول ایں چیزہا نزد ایشاں ہباو ہدر است زیراکہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند وہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و لواح آں نمی تواند آمد برائے منفعتِ خود واردین ومسافرین وتجار مخالفت نمی نمایند، اعیانِ دیگر مثل شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد، وازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد است۔ آرے درچپ وراست مثل حیدر آباد ولکھنؤ رام پور احکام خود جاری نہ کردہ اند بسبب مصالحہ واطاعت مالکان آں ملک [۳۰]

یہاں عیسائی افسروں کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے۔ ان کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، انتظامات رعیت، خراج، باج، عشر و مال گزاری، اموال تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات، مقدمات کے فیصلے اور جرائم کی سزاؤں وغیرہ میں یہ لوگ بطورِ خود حاکم اور مختارِ مطلق ہیں۔ اگرچہ یہ نمازِ جمعہ، عیدین، اذان اور ذبیحہ گاؤ جیسے احکام میں رکاوٹ نہیں ڈالتے، لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور حریت کی بنیاد ہے، وہ یہاں بالکل بے حقیقت اور پامال ہو گئی ہے۔ چنانچہ یہ (عیسائی حکمران) بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں، عوام کی شہری آزادی ختم ہو چکی ہے، یہاں تک کہ کوئی مسلمان یا ہندو ان کی اجازت کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف وجوانب میں نہیں آسکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی جو اجازت دی جاتی ہے، وہ بھی ملکی مفاد یا شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے۔ اس کے مقابلے میں خاص خاص اور نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک کے شہروں میں

---

[۳۰] فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۳۰، ۳۱ -

داخل نہیں ہو سکتے۔ دہلی سے کلکتے تک انہی کی عمل داری ہے۔ بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ اور رام پور میں، ان کے فرماں رواؤں کے اطاعت قبول کر لینے کی وجہ سے براہِ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے (باقی ہر حصّۂ ملک میں ان کے احکام چلتے ہیں)۔

اسی فتوے اور شاہ صاحب کی انگریز دشمنی کا نتیجہ تھا کہ مجاہدین کی ایک زبردست جماعت تیار ہو گئی جس نے انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا۔ جہاد کے لیے جو لوگ عملاً میدان میں نکلے وہ مولانا اسماعیل دہلوی، سید احمد بریلوی اور ان کے رفقائے کرام تھے۔ ان حضرات کی مساعیِ جمیلہ نے اس قدر وسعت اختیار کی کہ آزادیِ برِصغیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

انگریزی حکومت کی ملازمت کے بارے میں بھی شاہ عبدالعزیز سے فتویٰ طلب کیا گیا تھا، اس کا انھوں نے جو جواب دیا اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

نصاریٰ بلکہ کافروں کی ملازمت کئی قسم کی ہے۔ اس میں بعض ملازمتیں مباح ہیں، بعض مستحب، بعض حرام، بعض مکروہ اور بعض گناہِ کبیرہ اور مفضی الی الکفر ہیں۔ اگر کافر کسی مسلمان کو نیک رسمیں پھیلانے اور اچھے کام انجام دینے کے لیے ملازم رکھے تو یہ ملازمت جائز ہے، مثلاً چوروں اور رہزنوں کو ختم کرنے، شریعت کے مطابق فتوے دینے کے لیے۔ پل اور سرائے وغیرہ بنانے کے لیے ملازم رکھے تو یہ ملازمت مستحب ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خزانوں کا انتظام بہتر بنانے کی ملازمت کی اور عدل و انصاف کا دائرہ وسیع کرنے کی درخواست کی یا حضرت موسیٰ کی والدہ نے اپنے بیٹے موسیٰ کو دودھ پلانے کے لیے (فرعون کی) ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اگر بری رسمیں اور غلط چیزیں ملازمت میں نظر آئیں، مثلاً سپہ گری، خدمت گاری اور منشی گیری میں قلم سے کافر اور نصاریٰ کی امداد کرنی پڑے یا تعظیم و تکریم کے لیے بار بار اٹھنے کی ذلت برداشت کرنا پڑے، یا مسلمانوں کو قتل اور ان کی ریاست کو درہم برہم کرنے یا کفر کو رواج دینے یا دینِ اسلام میں عیب نکالنے کا فریضہ انجام دینا پڑے تو یہ ایسا گناہِ کبیرہ ہے جو کفر کی سرحد کے قریب لے جاتا ہے[۳۱]

---

[۳۱] ملفوظات شاہ عبدالعزیز (مقدمہ)، ص ۲۵ بحوالہ فتاویٰ عزیزیہ، ج ۲ ص ۱۱۹

شاہ عبدالعزیز نہایت دُور رس نگاہ رکھتے تھے اور حالات کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کے زمانے میں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تقریباً تمام ہندوستان میں قائم ہو چکی تھی۔ ان کو اس بات کا پورا اندازہ تھا کہ انگریز اس ملک پر چھا جائیں گے اور ان کی زبان، تہذیب اور ثقافت یہاں آ کر رہے گی۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب دہلی کالج قائم کیا اور لوگ اس میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق تامل کرنے لگے تو انھوں نے لوگوں کے شبہات کو دُور کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا۔[۳۲]

اذیت و مُصیبت

شاہ صاحب کو حق گوئی اور صاف بیانی کی وجہ سے شدید اذیتوں اور مصیبتوں میں بھی مبتلا کیا گیا۔ نجف خاں نے جو متعصب شیعہ اور مغل حکومت میں اچھا خاصا منصب دار تھا، شاہ صاحب کو ان کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین اور تمام اہل و عیال کے ساتھ دہلی سے نکل جانے کا حکم دیا۔ شاہ صاحب اُس زمانے میں بیمار تھے اور زیادہ چلنے پھرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ لیکن اس کی کوئی پروا نہیں کی گئی اور پورے خاندان کو شہر بدر کر دیا گیا۔ شاہ صاحب اور شاہ رفیع الدین کے نام خاص طور سے احکام جاری کیے گئے کہ وہ پیدل اور ننگے پاؤں سفر کریں۔ سخت گرمی کے دن، چلچلاتی دھوپ، بیماری کا عالم، اس پر مزید ظلم یہ کہ دونوں بھائیوں کو پیدل اور برہنہ پا چلنے کا حکم —— دہلی سے جون پور تک کی طویل مسافت انتہائی تکلیف اور صعوبت سے طے کی۔ راستے میں ایسی ایسی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا کہ شاہ عبدالعزیز کی بینائی بھی جاتی رہی اور کئی قسم کی بیماریاں بھی لاحق ہو گئیں۔

جلاوطنی کی مدت پوری کر کے دہلی واپس آئے تو شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا، عملاً ریذیڈنٹ کی حکومت تھی اور مغل بادشاہ اثر و اقتدار سے تقریباً محروم ہو گیا تھا۔ ملک کی اکثر ریاستیں انگریزی اقتدار کے سامنے جھک گئی تھیں اور ان کے حکمرانوں نے

---

[۳۲] رودِ کوثر ص ۵۹۱ ۔

تملق اور چاپلوسی کو شعار بنالیا تھا اور اسی کو اپنی بقا اور حفاظت کا اصل ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔ شاہ اس صورتِ حال سے انتہائی پریشان اور آزردہ خاطر ہوتے اور فتویٰ جاری کیا کہ ہندوستان دار الحرب ہوگیا ہے، کیونکہ یہاں شعائرِ اسلام کی بے حرمتی کی جارہی ہے اور عیسائی حکومت کے احکام جاری و نافذ ہیں۔ اس فتوے کا لوگوں پر یہ اثر پڑا کہ آگے چل کر انگریزی حکومت کے خلاف مستقل جہاد کا سلسلہ شروع ہوگیا اور جماعتِ مجاہدین نے وہ نمایاں کارنامے انجام دیے جو برِصغیر کی تاریخ حریت کا ایک زرّیں باب بن گئے۔

تصنیفات

شاہ صاحب متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ تفسیر فتح العزیز (معروف بہ تفسیر عزیزی) فارسی میں ہے اور سوا تین پاروں پر مشتمل ہے۔ سورہ فاتحہ سے پارہ دوم کے ربع تک اور پارہ ۲۹ اور ۳۰ کی تفسیر۔ یہ تفسیر شاہ صاحب کی آخر عمر کی تصنیف ہے، جب کہ ان کی قوتِ بصارت باقی نہیں رہی تھی۔ اپنے ایک شاگرد کو بٹھا کر املا کراتے تھے۔ اپنی نوعیت کی یہ ایک منفرد تفسیر ہے۔
مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ یہ تفسیر کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی (وھو فی مجلدات کبار) لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہوگئی اور پہلی اور آخری صرف دو جلدیں باقی رہ گئیں۔[۳۳]

۲۔ بستان المحدثین: محدثین کے حالات و کوائف پر محیط ہے اور فارسی زبان میں ہے۔ بارھویں صدی ہجری کے بعد اس موضوع سے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں، بیان سب کا ماخذ ہے۔

۳۔ سر الشہادتین: عربی میں ہے اور حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے حالات میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ شاہ صاحب کے شاگرد اور مشہور عالم مولانا خرم علی بلہوری نے کیا اور ان کے دوسرے شاگرد مولانا سلامت اللہ کشفی نے

---

[۳۳] نزہتہ الخواطر، ج ۷، ص ۲۷۳۔

"تحریر الشہادتین" کے نام سے اس کی شرح لکھی۔

۴۔ فتاویٰ عزیزی: فارسی میں ہے اور دو جلدوں میں ہے۔ نہایت عمدہ کتاب ہے اور مختلف عنوانات کے بہت سے فتووں کو اپنے دامنِ صفحات میں لیے ہوئے ہے۔

۵۔ عجالۂ نافعہ: اصولِ حدیث پر فارسی میں یہ ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔

۶۔ عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس: خلفائے راشدین کے حالات میں یہ ایک محققانہ تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے۔

۷۔ شرح میزان المنطق: عربی میں یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو میزان المنطق کی شرح ہے۔

۸۔ حواشی بدیع المیزان: عربی میں ہے اور بدیع المیزان کی ایسی عمدہ شرح ہے کہ اس کے مطالعہ سے مسائلِ منطق کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

۹۔ حواشی بر شرح عقائد: عربی میں ہے اور شرح عقائد کے مشکل مسائل اس کے مطالعہ سے آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ تحفہ اثنا عشریہ: فارسی میں ہے اور شاہ صاحب کی یہ بہت ہی اہم تصنیف ہے۔ شیعہ کے رد میں ہے اور بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول شیعہ مذہب کی ابتدا اور اس کے مختلف فرقوں کے آغاز کے بارے میں ہے۔ باب دوم میں جو ایک طویل باب ہے، ان حیلوں اور طریقوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، جن سے لوگوں کو غلط راہ پر لگایا جاتا اور اپنے افکار و عقائد کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ باب سوم میں اسلافِ شیعہ اور ان کی کتابوں کا تذکرہ ہے۔ پانچویں، چھٹے اور ساتویں ابواب میں علی الترتیب الٰہیات، نبوت اور امامت سے متعلق تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ دسویں باب میں خلفائے ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام پر جو الزامات عائد کیے جاتے ہیں، ان کو معرضِ تحریر میں لایا گیا ہے اور ان کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ گیارھویں باب میں شیعہ فرقوں اور ان کے اطوار و خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخری باب جو

دراصل بارھواں باب ہے، تولّی و تبرّی سے متعلق ہے۔

شیعہ سُنّی مباحث کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ نے بھی دو کتابیں تصنیف کیں، ایک "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" اور دوسری "ازالۃ الخفا"۔ ان کتابوں کے علاوہ اُنھوں نے بعض رسائل میں بھی ان مسائل کو موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے جن میں شیعہ اور اہلِ سنت کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز کی "تحفہ اثنا عشریہ" اس موضوع کے بارے میں ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۲۰۰ھ (نومبر ۱۷۸۵ء) کے بعد تصنیف کی۔ یہ اس قدر جامع اور مبسوط کتاب ہے کہ اسے شیعہ اور اہلِ سنت کے مسائل کا دائرۃ المعارف کہنا چاہیے۔ اس کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صحیح اور مستند روایات بیان کی گئی ہیں جو شیعہ کتب میں مندرج ہیں یا جن پر شیعہ اور اہلِ سنت دونوں متفق ہیں۔ پیرایۂ بیان معروضی اور سنجیدہ ہے۔

آغازِ کتاب میں مصنفِ نامدار نے اس کی وجہِ تصنیف بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ ہمارے عہد اور بلاد و امصار میں، شیعیت نے اس قدر فروغ حاصل کر لیا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو گا جس میں ایک یا دو آدمی اس مذہب کے حامی اور افکارِ شیعہ سے اثر پذیر نہ ہوں۔ اس کا اصل سبب مسائل سے عدم واقفیت ہے اور اسی سے ذہن و فکر میں غلط فہمیاں اُبھرتی ہیں۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ عام پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے اور بحث و مناظرے میں کوئی دِقّت پیش نہ آئے۔

یہ کتاب چونکہ بڑی جان دار اور معلومات افزا ہے اس لیے شیعہ حلقوں میں اس سے ایک تہلکہ بپا ہو گیا اور متعدد نامور علمائے شیعہ نے اس کا جواب دینے اور اثر زائل کرنے کی کوشش کی۔ لکھنؤ کے شیعہ علما میں مولانا دلدار علی مجتہدِ اوّل ایک مشہور اور ممتاز عالم تھے۔ اُنھوں نے تحفہ اثنا عشریہ کے جواب اور تردید میں چھ کتابیں اور رسالے تحریر کیے۔ صوارم الالٰہیات، حسام الاسلام اور احیاء السنہ میں تحفہ اثنا عشریہ کے ان ابواب کا جواب دیا ہے جو علی الترتیب الٰہیات، نبوت اور معاد و رجعت سے متعلق ہیں۔ ایک رسالہ ذوالفقار کے نام سے لکھا، جو تحفہ اثنا عشریہ کے گیارھویں باب کے

جواب میں ہے۔ صوادم الالٰہیات کے آخر میں اثباتِ امامت کا ذکر کیا ہے۔ ایک رسالہ غیبت ہے، جس میں شاہ صاحب کے ان اقوال وافکار کی تردید کی گئی ہے جو مسئلہ غیبت سے تعلق رکھتے ہیں۔

علامہ حکیم محمد کامل دہلوی نے تحفہ اثنا عشریہ کے جواب میں "نزھت اثنا عشریہ" کے نام سے کتاب لکھی اور پھر تمام عمر تقریروں اور مضمونوں کے ذریعے بھی اس کی تردید کرتے رہے۔

مفتی محمد قلی خاں کنتوری معروف شیعہ عالم تھے اور مولانا دلدار علی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ کافی عرصے تک میرٹھ میں مفتی عدالت کے منصب پر فائز رہے۔ بعد میں ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اور تصنیف و تالیف کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ بقول شیخ محمد اکرام کے "ان کا وظیفۂ حیات تحفۂ اثنا عشریہ کی تردید معلوم ہوتا ہے[۳۴] انھوں نے "تحفۂ اثنا عشریہ" کے آٹھویں باب کے جواب میں دو بڑی بڑی جلدوں میں ایک مبسوط و مفصل کتاب لکھی، جس کا نام "تشئید المطاعن وکشف الضغائن" ہے۔ علاوہ ازیں "تحفہ اثنا عشریہ" کے جواب میں "سیف ناصری" تصنیف کی۔ پھر دوسرے باب کے رد میں "تقلید المکائد" اور ساتویں باب کے جواب میں "برہان سعادت" لکھی۔ گیارھویں باب کی تردید "مصارع الافہام" میں کی۔

مولانا دلدار علی لکھنوی کے لائق بیٹے مولانا سید محمد لکھنوی نے بھی "تحفہ اثنا عشریہ" کے رد میں کئی رسالے تحریر کیے۔

شیخ محمد اکرام نے "رودِ کوثر" میں "آسودگانِ ڈھاکہ" کے حوالے سے حکیم حبیب الرحمٰن کی یہ تحریر درج کی ہے کہ جب کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" ڈھاکہ پہنچی تو وہاں کے ایک رئیس) میر اشرف علی نے دس ہزار روپیہ اس کا جواب لکھنے کے لیے عراق بھیجا تھا۔[۳۵]

---

[۳۴] رودِ کوثر ص ۵۹۲ ۔

[۳۵] ایضاً

میر اشرف علی فارسی کے مشہور شاعر سید محمد آزاد جہاں گیری اور اُردو کے ممتاز ادیب نواب سید محمد کے پردادا تھے۔ لیکن حکیم حبیب الرحمٰن کے بیان کے مطابق ان دونوں صاحبان نے مسلک اہل سنت اختیار کر لیا تھا۔[۲۶]

بہر حال تحفہ اثنا عشریہ اپنے دور کی ایک اہم تصنیف ہے اور اس زمانے میں اس قسم کی کتاب لکھنا بڑا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ شاہ صاحب نے یہ کتاب لکھ کر بہت بڑا علمی اور تحقیقی کارنامہ انجام دیا۔

شعر و شاعری

شاہ صاحب عربی کے شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے عربی میں بہت سی نظمیں اور نعتیں کہیں۔ اپنے چچا شاہ اہل اللہ کے نام عربی نظم میں ایک خط لکھا، جس میں اپنے زمانے کے سیاسی حالات اور مرہٹوں اور سکھوں کی جنگی چالوں اور ان کے ظلم و ستم کی داستان بیان کی ہے۔ ایک عربی نظم دہلی کی تعریف میں ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ ایک قصیدہ سوڈان کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی جامع الحیثیات شخص تھے۔ وہ بہ یک وقت جلیل القدر عالم، رفیع المرتبت مفسر، نامور محدث، وسیع النظر فقیہ، شعلہ بیان مقرر، بہت بڑے مناظر، عظیم مصنف، منجھے ہوئے مدرس، صاحب طرز ادیب اور ممتاز شاعر تھے۔

مرض اور وفات

شاہ صاحب کے مرض الموت کا آغاز بخار سے ہوا، پھر بخار بہت شدت اختیار کر گیا۔ جب حالت نازک ہو گئی تو اعزہ و اقارب کو بلایا، اپنا سامان جمع کیا اور شریعت کے مطابق تقسیم کیا۔ پھر یہ آیت پڑھی:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (بنی اسرائیل: ۲۶)

(اور قرابت داروں اور محتاج اور مسافر کو اس کا حق دو)

پھر حاضرین کو وصیت کی کہ غسل پورے احترام سے دیا جائے، البتہ کفن کا وہی

---

[۲۶] رود کوثر ص ۵۹۳۔

معمولی اور سادہ کپڑا ہونا چاہیے جو میں پہنتا ہوں۔ شہر سے دور جنگل میں جنازہ پڑھا جائے۔ سلطانِ وقت کو جنازے میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے ۔۔۔ اس کے بعد اوراد و وظائف میں مصروف ہو گئے اور آخر وقت میں یہ آیت پڑھی :

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (یوسف : ۱۰۱)

(اے اللہ) مجھے مسلمان کی حیثیت سے موت دینا اور نیک لوگوں سے مجھے ملانا۔)

اس کے بعد رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور وصیت کے مطابق تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ ۵۵ دفعہ جنازہ پڑھا گیا۔ ساٹھ سال درسِ حدیث دیا۔ ۷۹ سال کی عمر پائی۔ ۷ شوال ۱۲۳۸ھ (۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء) کو انتقال کیا۔ یک شنبہ کا دن تھا اور صبح کا وقت۔ بہت سے لوگوں نے تاریخ وفات کہی۔ مومن نے، جنھوں نے اپنے اصلی نام "حبیب اللہ" سے نہیں، بلکہ شاہ صاحب کے دیے ہوئے نام "مومن خاں" سے شہرت پائی، اس شعر سے تاریخ نکالی۔

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عدل

حُلیہ

شاہ صاحب نہایت خوش مزاج اور عمدہ خصال بزرگ تھے۔ دراز قامت، لاغر اندام، گندم گوں، موٹی موٹی آنکھیں اور جسم صاف، لیکن بعض ایسی شدید بیماریاں لاحق ہو گئی تھیں کہ بینائی جاتی رہی تھی۔ پچیس سال کی عمر میں چودہ بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے، لیکن اس کے باوجود طلبا کو باقاعدہ درس دیتے تھے۔ ساتھ ہی اپنے چھوٹے بھائیوں ۔۔۔۔۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر ۔۔۔۔۔ کو بھی درس و تدریس پر مامور کر دیا تھا ۔۔۔۔۔ فتویٰ نویسی، وعظ و ارشاد، تصنیف و تالیف اور تدریس و تعلیم کا سلسلہ شدتِ مرض میں بھی جاری رہا اور زندگی کے آخری سانس تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

اولاد

شاہ صاحب کی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف تین بیٹیاں تھیں۔ ایک کی شادی حضرت شاہ رفیع الدین کے صاحب زادے مولانا محمد عیسیٰ سے ہوئی۔ دوسری شیخ محمد افضل کے

عقد میں آئیں، جن سے شاہ محمد اسحاق دہلوی اور شاہ محمد یعقوب پیدا ہوئے۔ تیسری کا نکاح مولانا عبدالحی بڑھانوی سے ہوا، جن سے مولانا عبدالقیوم بھوپالی ظہور میں آئے۔[۳۷]

۱۵- مولانا عبدالعزیز قریشی پرہیاروی

مولانا عبدالعزیز قریشی پرہیاروی کے والد کا نام احمد اور دادا کا حامد تھا۔ ابوعبدالرحمن کنیت تھی۔ ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری میں خطۂ پنجاب کے کبار علما میں سے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مقام ولادت کے بارے میں تذکرہ نگاروں کا اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے مقام ولادت کوٹ ادو قرار دیا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ درحقیقت افغانستان سے وارد پنجاب ہوئے تھے اور ولادت غزنی کے محلہ حکیم سنائی میں ہوئی تھی۔ اس میں بہر حال کوئی شبہ نہیں کہ کوٹ ادو (ضلع مظفر گڑھ) کے نواحی قصبہ پرہاراں میں ان کی سکونت تھی اور وہیں ان کی کچی قبر ہے۔ یعنی مسکن اور مدفن ایک ہی قصبہ ہے۔

---

[۳۷] حالات کے لیے دیکھیے: اتحاف النبلا ص ۲۹۶، ۲۹۷ ــــ مقدمہ فتاوی عزیزی (فارسی)، ص ۷ تا ۱۷ ــــ مقدمہ ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۸ تا ۳۵ ــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۲ ــــ ابجد العلوم، ص ۹۱۴ ــــ حیات ولی ص ۵۸۶ تا ۶۲۸ ــــ تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۴۹ تا ۶۲ ــــ واقعات دارالحکومت دہلی، ج ۲، ص ۵۸۶ تا ۵۸۸ ــــ آثار الصنادید، ص ۲۴۸ تا ۲۵۱ ــــ تراجم الفضلا، ص ۱ تا ۱۰ ــــ رود کوثر، ص ۵۸۷ تا ۵۹۵ ــــ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج ۲، ص ۳۸ تا ۴۷ و ۹۷ تا ۸۳ ــــ حدائق الحنفیہ، ص ۴۷۰ ــــ الیانع الجنی، ص ۳۷ تا ۷۵ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۶۸ تا ۲۷۶ ــــ مفتاح التواریخ، ۳۸۱، ۳۸۲ ــــ تذکرہ کاملان رام پور، ص ۲۰۳ تا ۲۱۲ ــــ علم و عمل ج ۱ ص ۲۴۵ تا ۲۲۷ ــــ تاریخی مقالات، ص ۴۳ تا ۲۴۵۔

خواجہ نور محمد مہاروی ایک نامور بزرگ تھے اور ان کے خلیفہ حافظ جمال ملتانی تھے۔ مولانا عبدالعزیز پرہاروی اِنھی حافظ جمال ملتانی کے مرید تھے۔ حافظ صاحب بہت نیک اور پارسا بزرگ تھے۔ مولانا عبدالعزیز کو ان سے اتنی عقیدت تھی کہ ان کی وفات کے بعد فضائل رضیہ اور اسرارِ جمالیہ کے نام سے ان کے بارے میں دو رسالے لکھے۔ فضائل رضیہ اب نایاب ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا عبدالعزیز جلیل القدر عالم دین تھے۔ علوم معقول و منقول میں گہری نگاہ تھی مصنف بھی تھے اور بہت سی اہم علمی کتابیں ان کی یادگار رہیں۔ ہمیشہ مطالعۂ کتب میں مشغول رہتے۔ یہی ان کا دن رات کا کام تھا۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اُنھوں نے کس عالم کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا، کس اُستاد سے کون کون سی کتابیں پڑھیں اور کن کن مدارس میں پڑھیں۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانے کے بعض علما بھی، جوان سے حسد کرتے تھے، برملا کہتے تھے کہ اُنھوں نے علم کہاں حاصل کیا اور کس سے حاصل کیا؟ مولانا نے اس اعتراض یا سوال کا جواب اشعار میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا علم وہبی اور اشراقی ہے، اکتسابی نہیں۔ اس ضمن میں ان کے چند فارسی شعر "ایمان کامل" (ص ۲۴) سے ملاحظہ ہوں۔

احمقانے چند بے عقل و خرد	عیب می گیرند برمن از حسد
ایں نمی دانند ایں قوم حسود	کایں حسد برفضل ربانی چہ سود
علم ایشاں نظری و کسبی بود	علم ما اشراقی و وہبی بود
نسبتے با من ندارند ایں خساں	بر زمین اند و منم بر آسماں

یعنی چند بے عقل لوگ بربنائے حسد میری عیب جوئی کرتے ہیں۔ یہ حاسد نہیں جانتے کہ اللہ کے فضل کے مقابلے میں ان کا حسد کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کا علم نظری اور اکتسابی ہے، لیکن میرا علم اشراقی اور وہبی ہے۔ یہ ذلیل لوگ مجھ سے کوئی نسبت نہیں رکھتے، یہ زمین پر ہیں اور میں آسمان پر ہوں۔ یعنی یہ مجھ سے حقیر اور پست درجے کے ہیں اور میرا مرتبہ بہت اُونچا ہے۔

مولانا عبدالعزیز بہت اچھے طبیب بھی تھے اور حاکمِ ملتان نواب مظفر خاں نے ان کو اپنا خاص طبیب مقرر کیا تھا۔ فنِ طب میں اُنھوں نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔

بلند اخلاق اور عمدہ خصائل تھے۔ اتباعِ سنّت میں بہت سخت تھے، اس میں کسی کی ملامت یا

طعن و تشنیع کی کوئی پروا نہ کرتے۔

زہد و عبادت میں یگانہ تھے۔ متوکل علی اللہ اور راضی برضائے الٰہی تھے۔ حدیثِ رسول ہی کو ہدفِ عمل ٹھہراتے اور اس کے مقابلے میں کسی امام کے قول کو اہمیت نہ دیتے۔ بہت بڑے واعظ اور مبلغ دین تھے۔ امرا و حکام کے دروازے پر جانے سے نفرت تھی۔ اس قدر خوددار اور عالی نفس تھے کہ نہ دولت مند لوگوں سے ملتے، نہ کسی سے نذر و نیاز قبول کرتے اور نہ کوئی چیز لیتے۔ ہر معاملے میں اللہ پر بھروسا رکھتے۔ تقلید کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

ان کی ایک تصنیف "الاکسیر" ہے جو تین جلدوں میں ہے۔ ایک عالم شمس الدین نے اس کا ترجمہ کیا ہے، وہ اس کے دفترِ ثالث کے صفحہ ۲۲۳ پر لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالعزیز نے ہر مسئلے میں پابندیٔ شریعت کو ملحوظ رکھا اور بتایا کہ یہ مسئلہ شریعت محمدیؐ کے خلاف ہے اور یہ موافق، اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ فلاں مسئلے میں شریعت نے سکوت اختیار کیا ہے۔

ان کی کتاب "الیاقوت" تقلید کے رد میں ہے اور عربی میں ہے۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"قصہ کوتاہ کسی مسلمان کے لیے اللہ کے حکم کی اطاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی اتباع سے سرتابی کی قطعاً گنجائش نہیں۔ یقین کو چھوڑ کر شک کے درپے نہیں ہونا چاہیے، اس پر ہمیں کوئی ملامت کرتا ہے تو بے شک کرتا رہے۔ ہمیں بہر حال اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرنی چاہیے۔"

ماہ نامہ "اسرارِ حکمت" علم طب سے متعلق ایک رسالہ ہے، اس کے اگست ۱۹۶۲ء کے شمارے میں جناب محمد حسین صاحب کا مولانا کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون شائع ہوا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "بے باکی اور صاف گوئی آپ کی فطرت تھی۔ حضرت حافظ جمال ملتانی آپ کی نسبت کہا کرتے تھے کہ یہ نوجوان کس قدر ذہین اور فصیح اللسان ہے۔ میں اپنے زمانے میں کسی کو اس کا مثل نہیں پاتا۔ لیکن اس کی جرأت اور بے باکی سے مجھے یہ خوف ہے کہ یہ چیز اس کی ہلاکت کا سبب نہ بن جائے۔"

نہایت ذکی، ذہین اور نکتہ رس تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے جو "مناقب المحبوبین" میں درج ہے۔ مولانا فرماتے ہیں: "ایک دفعہ میں اور حضرت حافظ

جمال ملتانی اکٹھے کشتی میں سوار تھے۔ ملاح نے گہرائی معلوم کرنے کے لیے اپنا لمبا بانس دریا میں ڈالا۔ دریا بہت گہرا تھا۔ ملاح کی زبان سے حیرت میں لفظ "اللہ" نکلا۔ حافظ صاحب نے میری طرف دیکھا اور فرمایا، اس کا مطلب سمجھے؟ میں نے عرض کیا، جی ہاں! اللہ تعالیٰ کی گہرائی کی پیمائش عقل کا کوئی پیمانہ نہیں کر سکتا۔ فرمایا، ہاں، صحیح ہے۔"

مولانا عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ "وہ حضرت حافظ جمال ملتانی کے خطوط لکھا کرتے تھے، لیکن ان کا خط پیچیدہ اور شکستہ تھا۔ حافظ صاحب انھیں صاف اور واضح لکھنے کی تلقین کرتے، اور فرماتے کہ کاتب کو یہی گناہ ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے کہ پڑھنے والا اس کے مشکل مکتوب کے پڑھنے کی تکلیف سے دوچار ہو یعنی اس کی بدخطی کی وجہ سے پڑھنے میں دقت محسوس کرے۔

مولانا عبدالعزیز متعدد اوصاف کے مالک تھے۔ وہ جہاں تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم کے ماہر تھے، وہاں بہت اچھے شاعر اور طبیب بھی تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ الصمصام :۔ ردِ تاویل میں ہے اور تفسیر اور اس کے متعلقات کے بارے میں عربی زبان میں ہے۔ فاروقی کتب خانہ ملتان نے شائع کی۔

۲۔ البحرالمحیط :۔ اس کا تعلق بھی تفسیر اور متعلقاتِ تفسیر سے ہے۔ یہ بھی عربی میں ہے۔

۳۔ السلسبیل :۔ اس کا موضوع بھی یہی ہے اور عربی میں ہے۔

۴۔ وحی مقدس :۔ یہ بھی تفسیر سے متعلق ہے۔ "الاکبیر" کے مترجم شمس الدین لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ان کے مطالعہ سے گزری ہے، قلمی ہے۔

۵۔ کوثرالنبی :۔ مصطلحاتِ حدیث سے متعلق ہے اور عربی میں ہے۔ مکتبہ قاسمیہ چوک فوارہ ملتان نے شائع کی۔

۶۔ رسالہ فی اثبات رفع السبابۃ :۔ عربی نظم میں ایک مختصر سا رسالہ ہے، جس میں از روئے حدیث تشہد میں انگشتِ شہادت اُٹھانے کا ثبوت دیا گیا ہے۔

۷۔ النبراس فی شرح العقائد :۔ عربی میں ہے۔ ۱۲۳۹ھ میں تصنیف ہوئی۔

۸۔ سدرۃ المنتھٰی :۔ فارسی زبان میں ہے۔

۹۔ مرام الکلام فی عقائد الاسلام :۔ عقائد اسلام سے متعلق ہے اور عربی میں ہے۔ فاروقی کتب خانہ ملتان نے شائع کی۔ اس کا قلمی نسخہ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور میں محفوظ ہے۔

۱۰۔ ایمان کامل :۔ فارسی نظم میں ہے۔ فاروقی کتب خانہ ملتان کی طرف سے شائع ہوئی۔

۱۱۔ الناھیہ عن ذم معاویہ :۔ یہ ایک مطبوعہ رسالہ ہے جو شیعہ کے رد میں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت میں ہے۔ اس میں ان اعتراضات کا مفصل جواب دیا گیا ہے جو شیعہ حضرات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامور صحابی اور کاتب وحی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر وارد کرتے ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ جناب اسد نظامی (جہانیاں منڈی) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

۱۲۔ الحاشیۃ العزیزیہ :۔ منطق کے مشہور رسالے "ایساغوجی" پر حاشیہ۔ اس کا قلمی نسخہ جناب اسد نظامی کے پاس جہانیاں منڈی میں محفوظ ہے۔

۱۳۔ الاکسیر :۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔ طب سے متعلق ہے۔

۱۴۔ زمرد اخضر :۔ طب سے متعلق ہے۔ ۱۲۳۷ھ میں تصنیف کی۔ شیخ الٰہی بخش جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور نے شائع کی۔

۱۵۔ العنبر الاشھب :۔ عربی میں ہے اور علم طب کے بارے میں ہے۔ شیخ الٰہی بخش جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور نے شائع کی۔

۱۶۔ یاقوتِ احمر :۔ یہ بھی طب کے موضوع پر ہے۔ شیخ الٰہی بخش جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور نے شائع کی۔

۱۷۔ فرہنگ مصطلحات طبیہ :۔ فارسی میں ہے اور علم طب کے بارے میں ہے۔

۱۸۔ الیاقوت :۔ یہ رسالہ ردِ تقلید میں ہے اور عربی میں ہے۔

۱۹۔ تریاق :۔ طب کے موضوع پر ہے۔ لائبریری تونسہ میں قلمی نسخہ محفوظ ہے۔

۲۰ - العتیق :-

۲۱ - صراط المستقیم :- دینیات سے متعلق -

۲۲ - لوح محفوظ :- دینی معاملات میں -

۲۳ - ستر المعاد :- دینی مسائل و معاملات سے متعلق -

۲۴ - تکمیل العرفان :-

۲۵ - صلوٰۃ المسافر :- مسافر کی نماز سے متعلق -

۲۶ - منتھی الکمال :- دینی مسائل سے متعلق - قلمی نسخہ اسد نظامی کے پاس محفوظ ہے -

۲۷ - مخزن العوارف :- تصوف کے بارے میں -

۲۸ - حاشیہ مسلم الثبوت :- اصولِ فقہ کی کتاب مسلم الثبوت پر حاشیہ - اس کا قلمی نسخہ اسد نظامی (جہانیاں منڈی) کے پاس موجود ہے -

۲۹ - مسائل السماع :- اس کا قلمی نسخہ بھی جناب اسد نظامی کے پاس محفوظ ہے -

۳۰ - سرِ مکتوم :- عملیات اور تعویذات وغیرہ سے متعلق ہے -

۳۱ - نہایت الاعمال :- یہ بھی عملیات کے بارے میں ہے -

۳۲ - رسالہ الجفر الجامع :- عملیات سے متعلق -

۳۳ - الدر المکنون :- عملیات سے متعلق -

۳۴ - زیج :- عملیات سے متعلق ہے اور "الاکسیر" کے مترجم شمس الدین کے مطالعہ میں رہی ہے -

۳۵ - کسوف :- طبیعیات کے بارے میں -

۳۶ - خسوف :- طبیعیات کے بارے میں -

۳۷ - الیواقیت فی علم المواقیت :- طبیعیات کے بارے میں -

۳۸ - حاشیہ شرح جامی :- علمِ نحو کی انتہائی کتاب شرح جامی پر حاشیہ - اس کا قلمی نسخہ جناب اسد نظامی کے کتب خانے میں محفوظ ہے -

۳۹ - نعم الوجیز :-

۴۰ - فضائل رضیہ :-

۴۱۔ سر السماء۔

۴۲۔ اسرارِ جمالیہ۔ اس کا ترجمہ گلزارِ جمالیہ کے نام سے ہوا پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی نسخہ موجود ہے۔

۴۳۔ مِیزناب۔

۴۴۔ المرفوعات۔

۴۵۔ معجون الجواھر۔

۴۶۔ النبطاسیا؟۔

۴۷۔ جامع العلوم الناموسیہ والعقلیہ:

۴۸۔ مولانا عبدالعزیز کے چند اوراق جن پر اُن کے دستخط ثبت ہیں۔ محمد شفیع (ڈیرہ غازی خاں) کے پاس محفوظ ہیں۔

ان کے علاوہ اُنھوں نے اور بھی چھوٹے بڑے رسائل تحریر فرمائے۔ ان کتب و رسائل میں سے کچھ مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ۔ کچھ اصحاب علم کے پاس محفوظ ہیں اور بعض دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔

مولانا عبدالعزیز پرہیاروی بہت بڑے عالم و فقیہ اور مقرر و مصنف تھے افسوس ہے، اُنھوں نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ صرف تینتیس سال کی عمر میں ۱۲۳۹ھ کو انتقال کر گئے۔ پرہیاراں (ضلع مظفر گڑھ) میں مدفون ہیں[۳۸]۔

۱۶۔ مولانا حافظ عبد العلی نگرامی

مولانا حافظ عبدالعلی نگرامی کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر فقہائے حنفیہ

۳۸ے۔ نزھۃ الخواطر ج۷، ص ۲۷۶ تا ۲۷۸ — ماھنامہ اسرارِ حکمت لاھور: اگست ۱۹۶۴ء — "المعارف" بابت ماہ جون ۱۹۸۳ء مضمون پروفیسر جعفر بلوچ گورنمنٹ کالج لاہور — ہفت روزہ "الھام" بہاول پور، اگست ۱۹۷۶ء، مضمون جناب اسد نظامی۔

ہیں ہوتا ہے۔ ۱۲۳۱ھ کو نگرام میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں مضافاتِ لکھنؤ میں ایک قصبہ تھا۔ اس قصبے کو علمی لحاظ سے ہمیشہ اہمیت حاصل رہی اور بڑے بڑے علما یہاں پیدا ہوتے، جنھوں نے برِصغیر میں بہت شہرت پائی۔

حافظ عبدالعلی نگرامی نے ابتدائی درسی کتابیں اپنے ماموں مولانا حافظ علیم اللہ نگرامی سے پڑھیں۔ بعد ازاں لکھنؤ گئے، جو اس دور میں مرکزِ علم و علما تھا، وہاں سید انور علی مراد آبادی، مولانا اوحدالدین بلگرامی، مولانا عبدالحکیم لکھنوی اور بعض دیگر علمائے کرام سے استفادہ کیا۔ قاضی عبدالکریم نگرامی سے اخذِ طریقت کیا۔ پھر ان کے خلیفہ شاہ گلزار علی کشنتوی سے تلقین و اجازت سے مشرف ہوئے۔

صاحبِ ترجمہ مولانا حافظ عبدالعلی نگرامی متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:۔

۱۔ تفسیر آیات الاحکام: ایک جلد میں۔

۲۔ رد المبتدعین: بدعات اور اصحابِ بدعت کے رد میں۔

۳۔ تحقیق الامور فی حدوث الفاتحۃ والنذور: فاتحہ اور نذر وغیرہ کے سلسلے میں ہے۔ اس کتاب میں مروجہ فاتحہ اور نذر و نیاز کو بدعات و محدثات میں قرار دیا گیا ہے۔

۴۔ التحریر فی حرمۃ المزامیر: مزامیر کی حرمت میں۔

۵۔ السکین المسلول علیٰ من انکر کون مسح الرقبۃ من سنت الرسول۔

۶۔ التحقیق فی المولد والقیام: عربی میں ہے۔

۷۔ نور الایمان فی تائید مذہب النعمان: امام ابوحنیفہ کے فقہی نقطۂ نظر کی تائید میں ہے۔

۸۔ الیواقیت اللطیفہ فی تائید مذہب ابی حنیفہ: یہ بھی حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی مسائل کی تائید میں ہے۔

۹۔ ایک رسالہ حفاظ شیعہ کے بارے میں۔

۱۰۔ ھدایۃ الانام الیٰ خرقۃ المشائخ العظام: تصوف اور صوفیا کے

سلسلے میں۔

۱۱۔ رسالہ تقریر حق :

۱۲۔ رسالہ مولد شریف :

مولانا عبدالعلی نگرامی منکسر المزاج، بلند اخلاق اور بہت ملنسار عالم و فقیہ تھے بُدھ کے روز ۲۸ شوال ۱۲۹۶ھ کو اپنے وطن نگرام میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔[۳۹]

۱۷۔ مولانا عبدالعلی انصاری فرنگی محلی

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل کی تاریخ علم و عمل، تصنیف و تدریس اور فضل و کمال کے اعتبار سے نہایت شاندار ہے۔ اس خانوادۂ بلند مرتبت نے جو خدمات بوقلموں انجام دیں، ان کا دائرہ فقط برِصغیر پاک و ہند تک محدود نہیں رہا، عالمِ عرب کے شائقینِ علم بھی ان سے مستفید ہوئے۔ اس خاندان کی شہرتِ علمی کا آغاز بارھویں صدی ہجری کے عشرۂ اوّل سے ہوا، جب کہ ۱۱۰۳ھ میں اس کے رکنِ اعظم ملا قطب الدین سہالوی نے جامِ شہادت نوش کیا۔ وہ لکھنؤ کے نواح میں ایک قصبہ "سہالی" کے رہنے والے تھے اور وہاں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ عثمانی خاندان کے لوگوں نے زمین کے جھگڑے کی بنا پر حملہ کر کے ان کو شہید کر دیا اور وہ "قطب الدین شہید سہالوی" کے نام سے مشہور ہوئے۔[۴۰] اس وقت سے لے کر آج تک تین سو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس خاندان کے نقوشِ فضل و عرفان نمایاں ہیں اور لوگوں کے فکر و عمل کی گہرائیوں میں مرتسم ہیں۔ علمائے فرنگی محل کے متعدد حضرات کا تذکرہ سلسلہ فقہائے ہند

۳۹ھ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۴ ــــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۷۸، ۲۷۹۔

۴۰ھ تفصیل کے لیے دیکھیے "فقہائے ہند"، ج ۵ حصہ اوّل ص ۳۲۲ تا ۳۳۵۔

کی پہلی جلدوں میں کیا گیا ہے، اور اس جلد میں بھی مرقوم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علمی و تدریسی لحاظ سے جو عمر دراز اس خاندان نے پائی، برِ صغیر کے کسی خاندان کو نصیب نہ ہوئی۔ صاحبِ ترجمہ مولانا عبدالعلی، اسی خاندان کے فردِ فرید اور دنیائے تحقیق و ادراک کے جوہرِ قابل تھے، باپ کا اسمِ گرامی مولانا نظام الدین[1] اور جدِ امجد کا قطب الدین شہید تھا۔

مولانا عبدالعلی انصاری فرنگی محلی تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں برِصغیر کے عالمِ کبیر، علامۂ دوراں اور شیخ و امام تھے۔ اپنے عصر میں انھیں بجا طور پر بحرالعلوم اور ملک العلما کے القاب سے ملقب کیا گیا۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، لغت و ادب، معانی و بیان، مناظرہ و کلام، غرض جملہ علوم و فنون پر عبور و استحضار میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔

ولادت اور تعلیم و تربیت

یہاں یہ واقعہ قابلِ تذکرہ ہے کہ مولانا نظام الدین کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ لوگ دوسری شادی کے لیے کہتے تھے لیکن وہ اس پر رضامند نہ تھے، اور فرماتے تھے کہ میں اس جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ لیکن جب سب نے مجبور کیا اور شادی کے لیے مصر ہوئے تو فرمایا میں ذاتی طور پر اس کے لیے تیار نہیں ہوں، البتہ کسی بزرگ کا ارشاد ہوگا تو مجبوراً یہ کام کرنا پڑے گا۔ آپ نے شیخ اسماعیل بلگرامی (متوفی ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ) سے فیضِ باطنی حاصل کیا تھا۔ اُنھوں نے کہلا بھیجا کہ مجھے القا کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ دوسری شادی سے تمھارے اولاد ہوگی۔ چنانچہ آخر عمر میں قصبہ سنڈیلہ میں دوسری شادی کی جس سے وہ دُرِتاب دار پیدا ہوا، جس کے علم و فضل کی روشنی سے پورا ہندوستان چمک اُٹھا اور جو بحرالعلوم کے پُرشکوہ لقب سے مشہور ہوا۔ ذیل کی سطور میں اسی عالمِ اجل کا علمی و الخمہ تذکرہ کرنا مقصود ہے۔

مولانا عبدالعلی ۱۱۴۳ھ کے آخر یا ۱۱۴۴ھ کے آغاز میں لکھنؤ میں

---

[1] مولانا نظام الدین فرنگی محلی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند ج ۵ حصہ دوم ص ۲۷۵ تا ۳۰۰

پیدا ہوئے[۴۲] تمام درسی کتابیں اپنے والدِ ماجد مولانا نظام الدین سے پڑھیں۔ سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اسی زمانے میں والد نے ان کی شادی قصبہ کاکوری میں کر دی۔ اس سے چھ ماہ بعد والدِ مکرم وفات پا گئے۔ لیکن والد کی وفات کے بعد بھی اُنھوں نے حصولِ علم وفیض کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب وہ اپنے والد کے تلمیذِ خاص اور اس دَور کے جلیل القدر فاضل مولانا کمال الدین فتح پوری کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔

ذہانت وفطانت

مولانا عبد العلی آغازِ عمر ہی میں بحث ومناظرے کے عادی تھے اور اس میں اس درجے تیز تھے کہ زبان کو حرکت دیتے وقت کسی کی پروا نہ کرتے اور بڑے بڑوں کے مقابلے میں اُتر آتے۔ یہاں تک کہ اپنے اُستادِ مکرم مولانا کمال الدین فتح پوری سے بھی سلسلۂ بحث جاری رکھتے۔ لوگ مولانا کمال الدین سے کہتے کہ یہ لڑکا گفتگو میں حدِّ ادب کو پھلانگ جاتا ہے، اسے روکنا اور سمجھانا چاہیے اور بتانا چاہیے کہ اُستاد اور اہلِ علم سے مخاطب ہونے کا یہ طریق نہیں جو اس نے اختیار کر رکھا ہے۔ مولانا جواب دیتے کہ ایک تو یہ اُستاد زادہ ہے، دوسرے ذہانت وفطانت سے بہرہ مند ہے اور تیسری خوبی اس میں یہ ہے کہ اوائلِ عمر ہی میں مروجہ علوم درسیہ میں اس نے مہارت حاصل کر لی ہے، لہٰذا اگر یہ بڑھ چڑھ کر باتیں کرتا اور اسلوبِ کلام میں حدودِ ادب سے باہر قدم رکھ لیتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، اس سے استاد کی اہانت نہیں ہوتی بلکہ اس نوجوان کے علم وفضل کا اظہار ہوتا ہے اور میرے لیے یہ عین باعثِ مسرت ہے۔ یہ اگرچہ کم عمر ہے مگر اس میں تحقیق وکاوش کے وہی جوہر پائے جاتے ہیں جو علامہ صدر الدین شیرازی اور محقق جلال الدین دوانی کے حصے میں آئے تھے۔ جو شخص عالمِ شباب ہی میں، خالص علمی اور فنی مباحث میں اپنے دور کے

---

۴۲ ان کا سالِ ولادت کہیں صراحت سے مرقوم نہیں۔ ان کے والد مولانا نظام الدین کی وفات ۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ کو ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ساڑھے سترہ سال کی تھی۔ اس حساب سے سالِ ولادت ۱۱۴۳ھ کا آخر یا ۱۱۴۴ھ کا آغاز بنتا ہے۔

اکابر علما اور نامور اساتذہ سے مناظرہ و مجادلہ کر سکتا ہو، وہ آگے چل کر بلاشبہ اپنا ایک مقام پیدا کرے گا۔ چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ مولانا عبدالعلی نے دنیائے علم میں امامت کا درجہ حاصل کیا اور مشکل ترین مسائل کی عقدہ کشائی میں سب سے بازی لے گئے۔

مسندِ تدریس اور لکھنؤ کی ترکِ سکونت

حصولِ علم سے فراغت کے بعد باپ کی مسندِ تدریس سنبھالی اور باقاعدگی و انہماک سے طلبا کو درس دینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کی شہرتِ علمی دور دور تک پہنچ گئی اور تشنگانِ علوم کا بہت بڑا ہجوم ان کے گرد جمع ہو گیا۔ مدت تک لکھنؤ کے مدرسہ فرنگی محل میں خدمتِ درس انجام دیتے رہے اور اس اثنا میں بہت سے اہل علم نے ان سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد ایک ایسا عظیم اور ناگوار سانحہ پیش آیا کہ اپنے آبائی مدرسے اور شہر کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہو گئے اور پھر حالات ایسی کروٹ بدلتے رہے کہ زندگی بھر اس جگہ کا رخ نہ کر سکے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شیعہ بزرگ سید نور الحسن بلگرامی لکھنؤ آئے۔ وہ بیمار تھے اور مولانا محب اللہ لکھنوی کے ہاں فرنگی محل میں مقیم تھے۔ محرم کا مہینہ آیا تو شدتِ مرض کی وجہ سے تعزیے کی زیارت کو نہ جا سکے اور پیغام بھجوا دیا کہ تعزیہ ان کی قیام گاہ کی طرف سے لے جایا جائے تاکہ وہ وہیں سے زیارت کر سکیں۔ مولانا عبدالعلی کا مدرسہ اسی راستے میں پڑتا تھا، جس سے تعزیے کا جلوس گزرنا تھا۔ جب تعزیہ آیا مولانا تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ انھیں اصل واقعہ کا علم نہ تھا، وہ سمجھے کہ یہ لوگ راستہ بھول گئے ہیں۔ چونکہ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے اس لیے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ تعزیہ بردار لوگوں کو پیچھے ہٹا دیں اور صحیح راستہ بتا دیں۔ وہ سمجھے کہ مولانا نے تعزیہ توڑنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ وہ آگے بڑھے اور تعزیہ توڑ ڈالا۔ یہ نوابانِ اودھ کا زمانہ تھا جو شیعہ تھے اور ان کی وجہ سے لکھنؤ میں شیعیت کا زور تھا۔ نواب شجاع الدولہ برسرِ حکومت تھا۔ شہر میں شور مچ گیا کہ مولانا عبدالعلی باغی ہو گئے ہیں اور تعزیہ توڑ کر شیعہ مذہب اور اس کے ماننے والوں کی توہین کی ہے۔ قاضی غلام مصطفےٰ جو شیعانِ لکھنؤ میں بہت اثر و رسوخ کے مالک تھے، مولانا کی مخالفت میں خاص طور پر آگے آگے تھے۔

وہ ایک بڑے ہجوم کے ساتھ مولانا کے گھر پر حملہ آور ہوئے۔ مولانا بھی بہت دلیر اور تیز تھے، اُنھوں نے اپنے شاگردوں اور اِرادت مندوں کو جمع کیا اور مقابلے پر اُتر آئے۔ جب شیعہ حضرات نے دیکھا کہ وہ مولانا سے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تو صلح کی درخواست کی اور معاملہ ختم ہو گیا۔ لیکن یہ صلح بربنائے مصلحت تھی۔ اس کے بعد شیعہ حضرات نے قاضی غلام مصطفیٰ کی انگیخت پر مولانا کو دھوکے سے قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ مولانا کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے چچازاد بھائیوں اور دیگر اہلِ خاندان سے مشورہ کیا۔

اب معاملہ انتہائی نازک اور سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ ایک طرف مولانا کے شاگرد اور اصحابِ عقیدت تھے جو مصر تھے کہ وہ اپنے والدِ مکرم مولانا نظام الدین کے مدرسے ہی میں رہیں، لکھنؤ سے باہر نہ نکلیں۔ اگر کسی موقعے پر حالات نے خطرناک رُخ اختیار کیا تو مقابلہ کیا جائے گا۔ دوسری جانب مولانا کے اعزہ و اقارب تھے جو ان کے علمی عروج اور شہرت سے خوش نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا یہاں سے چلے جائیں اور کسی دوسری جگہ اپنا ٹھکانہ بنالیں۔ ان کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ یہاں کی شیعہ حکومت بھی ان کی مخالف ہے اور شیعہ عوام بھی۔ ان دو طاقتوں کا مقابلہ ممکن نہیں۔ اگر وہ یہاں رہیں گے تو خود بھی مشکل میں پھنس جائیں گے اور رشتے داروں کو بھی مصیبت میں ڈالیں گے۔ جب مولانا نے دیکھا کہ رشتے داروں ہی کا رویہ بدل گیا ہے تو چھپ کر گھر سے نکلے اور شاہ جہان پور چلے گئے۔

شاہ جہان پور میں قیام

اس زمانے میں شاہ جہان پور کا حکمران حافظ رحمت خاں تھا، جو بہت علم دوست اور متدین آدمی تھا۔ مولانا وہاں پہنچے تو حافظ رحمت خاں نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آیا، ان کے مصارف کے لیے معقول رقم مقرر کی اور طلبا کو مناسب وظائف دینا شروع کیے۔ مولانا کے قیام کا انتظام شاہ جہان پور کے رئیس نواب عبداللہ خاں کے مکان میں کیا گیا جو قلعے میں تھا۔ وہاں اُنھوں نے اپنے آپ کو درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا اور ان کا نام سن کر طلبا کی بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی۔ اب شاہ جہان پور میں

ایک عظیم درس گاہ قائم ہو چکی تھی جس میں کثرت سے طلبائے علم آتے اور فیض حاصل کرتے تھے۔ وہاں وہ بیس سال مقیم رہے اور اس اثنا میں متعدد اصحابِ علم ان کی درس گاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ مولانا نے تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی وہاں جاری رکھا۔ یہ سلسلہ حافظ رحمت خاں کی شہادت (۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ — ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء) تک قائم رہا۔ اس کے بعد یہ علاقہ اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے قبضے میں آگیا جو شیعہ تھا اور مولانا کا مخالف تھا۔

رام پور کا عزم

اس کے بعد مولانا نے رام پور کا عزم کیا۔ اس عہد میں ریاست رام پور کا حاکم نواب فیض اللہ خاں تھا۔ اس نے رام پور میں مولانا کی آمد کو اپنی خوش بختی قرار دیا اور ان سے انتہائی عزت و اکرام کا برتاؤ کیا۔ مولانا اور ان کے طلبا کے لیے معقول وظائف مقرر ہوئے اور تعلیم و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا نے قیام رام پور کے دوران میں بعض کتابیں بھی تصنیف کیں اور جو تعلیقات و حواشی لکھنؤ اور شاہ جہان پور میں معرضِ تحریر میں آ چکے تھے، ان کی تکمیل و تصحیح بھی کی۔ رام پور میں علما و طلبا کی کثیر جماعت ان سے مستفید ہوئی اور دُور و نزدیک کے بہت سے لوگوں نے ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ وہاں وہ چار سال قیام فرما رہے۔ اس اثنا میں طلبا کی جماعت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا اور مصارف بہت بڑھ گئے تھے، اس لیے نواب رام پور ان کی کفالت سے عاجز آگیا اور ان کو مجبوراً وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔

قصبہ بوہار

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں ملک کے کھاتے پیتے لوگوں نے ترویج دین اور اشاعتِ علم کے لیے مدارس قائم کر رکھے تھے۔ ان مدارس میں ایک مدرسہ کلکتہ کے نواح میں "بوہار" کے مقام پر منشی صدر الدین خاں نے قائم کیا تھا۔ یہ ایک شان دار مدرسہ تھا جس میں طلبا کا گروہِ کثیر نامور اساتذہ سے تحصیل علم میں مشغول تھا۔ اس کے بانی منشی صدر الدین خاں چاہتے تھے کہ مولانا عبد العلی فرنگی محلی ان کے

مدرسے میں تشریف لے آئیں۔ اس کے لیے اُنھوں نے مولانا سے بھی اصرار کیا، نواب رام پور پر بھی زور دیا اور بعض انگریز حکام سے بھی ملے اور نواب فیض اللہ خاں (والیِ رام پور) کے پاس ان کی سفارشیں بھجوائیں کہ وہ مولانا کو بوہار جانے کی اجازت دے دیں۔ بہرحال منشی صدر الدین خاں اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے اور مولانا پانچ سال رام پور میں گزار کر ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) کو اپنے علما و طلبا کے ساتھ بوہار تشریف لے گئے۔ رام پور سے بوہار جاتے ہوئے وہ رائے بریلی سے گزرے، وہاں تکیۂ سید علم اللہ شاہ میں قیام پذیر ہوئے اور سید علم اللہ کے پوتے سید محمد عدل کو ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ اُس وقت ان کے داماد مولانا ازہار الحق انصاری لکھنوی بھی ان کے رفیقِ سفر تھے۔

بوہار پہنچے تو منشی صدر الدین خاں نے شان دار استقبال کیا اور نہایت احترام سے پیش آیا۔ مولانا کی چار سو روپے اور مولانا ازہار الحق کی سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ایک سو طالب علم ان کے درس میں شامل تھے، ان کے ماہانہ وظائف مقرر ہوئے۔ بارہ سال بوہار میں مقیم رہے اور اس اثنا میں شائقینِ علم نے ان سے خوب استفادہ کیا۔ اس کے بعد صدر الدین خاں سے تعلقات بگڑ گئے اور مزید قیام کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

مدراس کا عزم اور والہانہ استقبال

اس زمانے میں مدراس کا حکمران والاجاہ نواب محمد خاں والیِ ارکاٹ تھا۔ وہ صوبہ یوپی کے ایک مقام گوپامئو کا رہنے والا تھا اور اس لحاظ سے مولانا عبد العلی فرنگی محلی کا ہم وطن تھا۔ اس کو منشی صدر الدین خاں سے مولانا کی دل برداشتگی کا پتا چلا تو مدراس تشریف لانے کی درخواست بھیجی۔ مولانا بوہار سے عازمِ مدراس ہوئے۔ چھ سو علما و طلبا ان کے ہم رکاب تھے۔ مدراس کے قریب پہنچے تو نواب محمد علی خاں نے امرائے دربار، خاندان کے معززین اور خود اپنے بیٹوں کو ایک منزل آگے استقبال کے لیے بھیجا۔ مولانا اور ان کے رفقا پورے اعزاز کے ساتھ ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ کو شہر مدراس میں داخل ہوئے۔ مولانا کی پالکی نواب کے محل کے قریب پہنچی تو نواب ارکانِ دولت اور اعزہ کے ساتھ پیادہ پا دروازے پر کھڑا تھا۔ مولانا نے پالکی سے اُترنا چاہا تو نواب نے دوڑ کر پالکی کو کندھا دیا اور اسی طرح صحنِ محل میں داخل ہوا۔ دربار

میں اپنی مسندِ خاص پر بٹھایا، ان کے قدم چومے اور انتہائی اکرام کا برتاؤ کیا۔ رہنے کو ایک شان دار محل ان کے لیے مخصوص کیا۔ وہ ہمیشہ صبح و شام اپنے باورچی خانے سے بہترین کھانا پیش کرتا تھا۔ مولانا جب بھی اس کی ملاقات کو محل میں جاتے، اسی طرح استقبال اور تعظیم کرتا جس طرح کہ پہلے دن کیا تھا۔

مولانا کے مدراس تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد نواب نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا، جس کا شمار ہندوستان کے مشہور اور بڑے مدارس میں ہوتا تھا۔ مولانا اور ان کے رفقا اور تلامذہ کے لیے معقول وظائف مقرر کیے اور درس و تدریس کا وسعت پذیر سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا محل سے منتقل ہو کر مدرسے کی عمارت میں آگئے اور طلبا کے ساتھ رہنے لگے۔ مدراس کے قرب و جوار اور ملک کے دُور دراز حصوں سے کثیر تعداد میں شائقینِ علم ان کی خدمت میں آتے اور فیض حاصل کرتے تھے۔ طویل عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ نواب محمد علی نے انھیں "بحر العلوم" کا خطاب عطا کیا۔

نواب محمد علی خاں کی وفات کے بعد اس کے بیٹے عمدۃ الامرا نے باپ کی مسند سنبھالی۔ یہ سیاسی اعتبار سے ایک نازک موڑ تھا اور تخت نشینی کے مسئلے پر حکمران خاندان میں جھگڑے کا احتمال تھا، لیکن مولانا نے جب عمدۃ الامرا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے مسندِ حکومت پر بٹھایا تو سب کی گردنیں جھک گئیں اور یہ خطرناک منزل نہایت آسانی سے طے ہو گئی۔ عمدۃ الامرا نے باپ سے بھی زیادہ ان کی عزت و حرمت کی۔ مولانا کے علاوہ ان کے اہلِ قرابت کے لیے الگ ماہانہ رقم مختص کی گئی۔ عمدۃ الامرا نے مسند نشینی کے دس دن بعد ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۱۰ھ (۲۲ دسمبر ۹۵ ۱۷ء) کو خطابات تقسیم کیے تو مولانا ممدوح کو "ملک العلما" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

عمدۃ الامرا کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس کے بیٹے تاج الامرا علی حسین خاں کو مسند نشین کیا، لیکن مولانا اس کے عقیدہ و مذہب سے مطمئن نہ تھے، لہٰذا اس تقریب میں شریک نہیں ہوئے۔ اپنے خاندان کے افراد سے بھی اس کا طرزِ عمل اچھا نہ تھا اور لوگ انگریز حکام سے اس کی شکایت کرتے تھے، اس لیے انگریزوں نے اس کو حکومت

سے معزول کر دیا۔ وہ صرف چھ مہینے برسرِ اقتدار رہا۔

عظیم الدولہ نواب محمد علی خاں کا نبیرہ تھا۔ تاج الامرا کی معزولی کے بعد اس کو حکومت دی گئی۔ یہ مولانا کا شاگردِ خاص تھا۔ لیکن اس کی حکومت اور نوابی برائے نام تھی، انگریزوں نے اس کے زمانے میں مدراس پر قبضہ کر لیا اور اس کا وظیفہ مقرر کر دیا، لیکن اس معزول نواب نے مولانا اور دیگر علما و طلبا کے ماہانہ وظائف سابق دستور کے مطابق جاری رکھے۔

عادات و خصائص

مولانا عبد العلی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ نہایت فیاض اور سخی تھے۔ جو کچھ آتا فقرا و مستحقین اور احباب و رفقا میں بانٹ دیتے۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے اہل و عیال عام طور پر تنگ دست رہتے، لیکن کسی سے اس کا اظہار نہ کرتے۔ مولانا سے اس کی شکایت کی جاتی تو پروا نہ کرتے۔ البتہ اگر نواب کو معلوم ہو جاتا تو وہ اہل خانہ کو کچھ مزید رقم بھیج دیتا۔

مولانا کے والدِ گرامی مولانا نظام الدین بہت نرم طبیعت اور منکسر مزاج تھے، اس کے برعکس بیٹے کے مزاج میں تشدد اور ادعا کا عنصر غالب تھا، جمال کے بجائے جلال اور عجز کے بجائے تمکنت پائی جاتی تھی، کسی کے سامنے خاموش رہنے اور مسائل میں دبنے کے عادی نہ تھے۔ جو علمائے کرام سن و سال میں ان سے بہت بڑے تھے، ان کے مقابلے میں بھی اکڑ آتے۔ مجادلہ و مباحثہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مسائل بیان کرتے وقت بھی یہ انداز برقرار رہتا، تصنیفات میں بھی طبیعت کی سختی نمایاں نظر آتی ہے۔

تصنیفات اور حواشی و تعلیقات

تیرھویں صدی ہجری کے حلقۂ احناف کے علمائے ہند میں مولانا عبد العلی کا مرتبہ علمی بہت بلند تھا، مسائل میں دقتِ نظر کی جو خوبی ان میں پائی جاتی ہے وہ کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ وسعتِ نظر اور اظہار و بیان میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے، جلیل القدر مصنف بھی تھے۔ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، عقائد و کلام اور فلسفہ و حکمت وغیرہ ہر موضوع پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں اور حواشی و تعلیقات

بھی سپردِ قلم کیے، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے :۔

۱۔ رسالہ فی تفسیر الحدیث :۔ یہ ایک قلمی رسالہ ہے جو رضا لائبریری رام پور (ہندوستان) میں محفوظ ہے۔

۲۔ رسالہ اصول الحدیث :۔ یہ بھی قلمی ہے اور ندوۃ العلما لکھنؤ کی لائبریری میں موجود ہے۔

۳۔ الارکان الاربعہ :۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور اس میں حنفی نقطۂ نظر سے فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مطبوعہ کتاب ہے۔

۴۔ فاتح الرحموت فی شرح مسلم الثبوت :۔ یہ کتاب ۱۱۸۰ھ میں تصنیف کی، مطبوعہ ہے۔

۵۔ مسائل متعلقہ حقہ وحرمت نان پاؤ وافیون وجوز وبنگ :۔ یہ درحقیقت ایک استفتا کے جوابات ہیں جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین اور بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی نے دیے تھے۔ یہ جوابات مطبع مصطفائی کان پور سے عربی میں مع بین السطور فارسی ترجمے کے شائع ہوئے۔

۶۔ تنویر المنار شرح منار الانوار :۔ یہ اصولِ فقہ سے متعلق ہے۔ فارسی میں ہے اور مطبوعہ ہے۔

۷۔ تکملہ شرح تحریر الاصول :۔ فتح التقدیر کے مصنف ابن الہمام نے اصولِ فقہ سے متعلق "تحریر الاصول" کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے حلقۂ اہلِ علم میں بہت اہمیت دی گئی۔ متعدد اہلِ علم نے اس کتاب کو ہدفِ التفات ٹھہرایا اور اس کی شرحیں سپردِ قلم کیں۔ مولانا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی نے بھی اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی، لیکن پیغامِ اجل آگیا اور شرح مکمل نہ ہو سکی، ان کے بیٹے مولانا عبدالعلی نے "تکملہ شرح تحریر الاصول" کے نام سے اس کی تکمیل کی۔

۸۔ شرح الدائر فی الاصول :۔ یہ اصول فقہ کے بارے میں ہے۔

۹۔ احوالِ قیامت :- یہ عقائد و کلام کے بارے میں ہے اور فارسی میں ہے۔ غیر مطبوعہ ہے۔

۱۰۔ شرح فقہ اکبر :- یہ مطبوعہ ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۱۱۔ رسالہ توحید :- یہ رسالہ مسئلۂ توحید سے متعلق ہے۔

۱۲۔ الحاشیہ علی حاشیۃ میرزاھد علی شرح المواقف :- یہ عقائد و کلام سے متعلق ہے اور مطبوعہ ہے۔

۱۳۔ الرسالۃ الصغریٰ فی السلوک :- یہ رسالہ تصوف کے موضوع پر ہے۔ اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔

۱۴۔ شرح فصِ نوح من فصوص الحکم :- ابن عربی کی فصوص الحکم میں ایک "فص نوح" ہے، مولانا عبدالعلی نے اس فص کی شرح لکھی۔ یہ بھی تصوف کے موضوع پر ہے۔

۱۵۔ شرح مثنوی مولانا روم :- فارسی میں ہے اور مطبوعہ ہے۔ تصوف کے بارے میں ہے۔

۱۶۔ وحدت الوجود :- یہ کتاب مسئلۂ وحدت الوجود سے متعلق ہے۔ فارسی میں ہے اور تصوف کے اسلوب کی ہے۔

۱۷۔ تنزلاتِ ستہ :- یہ رسالہ بھی تصوف میں ہے۔ جولائی ۱۹۶۵ء کے سہ ماہی "اقبال ریویو" میں اس کا اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

۱۸۔ ھدایۃ الصرف :- یہ علم صرف میں ہے، فارسی میں ہے اور مطبوعہ ہے۔

۱۹۔ الحاشیہ علی حاشیۃ میرزاھد علی رسالۃ القطبیہ :- یہ حاشیہ چھپ چکا ہے اور منطق سے متعلق ہے۔

۲۰۔ الحاشیہ علی حاشیۃ میرزاھد ملا جلال :- یہ حاشیہ بھی چھپ چکا ہے اور منطق میں ہے۔

۲۱۔ الحاشیہ علی ضابطۃ التھذیب :- یہ بھی چھپ چکا ہے منطق

کے بارے میں ہے۔

۲۲۔ شرح سلم العلوم :۔ یہ شرح چھپ گئی ہے۔

۲۳۔ شرح الضابطہ :۔ یہ بھی شائع ہو چکی ہے منطق میں ہے۔

۲۴۔ تعلیقات علی الافق المبین :۔ یہ فلسفہ و حکمت سے متعلق ہے اور قلمی ہے جو رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

۲۵۔ الحاشیہ علی الصدرا :۔ یہ بھی فلسفے کے بارے میں ہے اور مطبوعہ ہے۔

۲۶۔ الحاشیہ علی المثناۃ بالتکریر :۔ یہ حاشیہ قلمی ہے اور فلسفے کے بارے میں ہے۔

۲۷۔ حاشیہ شمس البازغہ :۔ یہ بھی قلمی ہے اور اس کا موضوع بھی فلسفہ ہے۔

۲۸۔ العجالۃ النافعہ :۔ یہ قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے اور فلسفے میں ہے۔

۲۹۔ شرح المجسطی : یہ قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود ہے اور علم ہیئت میں ہے۔

۳۰۔ شرح مقامات المبادی :۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں موجود ہے۔

مولانا عبد العلی اپنے دور کے بہت بڑے حنفی المسلک عالم و فقیہ تھے۔ ان سے بے شمار اصحابِ علم نے مستفید ہونے کی سعادت حاصل کی۔ سید سلیمان ندوی حیاتِ شبلی میں تحریر کرتے ہیں :۔

ملا نظام الدین کے مشہور صاحب زادے ملا عبد العلی ہیں، جن کے دم سے (فرنگی محل کا) یہ چشمہ نہر بن کر دریائے فیض بن گیا اور دنیا نے ان کو بحر العلوم کہہ کر پکارا۔ یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رام پور سے ہوا خلیج بنگال کے پاس بوہار پہنچا اور وہاں سے مدراس ہو کر بحرِ ہند کے کناروں سے مل گیا۔

وفات

زندگی کے آخری دنوں میں مولانا عبدالعلی بہت ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے۔ ۸ رجب ۱۲۲۵ھ کو مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ چار دن یہ کیفیت رہی کہ کبھی ہوش آ جاتا اور کبھی غشی طاری ہو جاتی۔ حالتِ ہوش میں فرمایا کہ نفی و اثبات کی حقیقت اب معلوم ہوئی۔ خدا کے سوا کوئی شے موجود نہیں۔ ۸۱ برس کی عمر پا کر ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ (۱۳ اگست ۱۸۱۰ء) کو مدراس میں انتقال کیا اور دوسرے دن مسجد والا جاہی کے قریب دفن کیے گئے۔ تذکرہ علمائے ہند میں سالِ وفات ۱۲۳۵ھ مرقوم ہے جو صحیح نہیں۔[۴۳]

۱۸۔ شاہ عبدالغنی دہلوی

شاہ عبدالغنی دہلوی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے چوتھے اور سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ان کی تاریخ ولادت اور حالات کا پتا نہیں چل سکا۔ تذکروں سے صرف اتنی سی بات کا پتا چلتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے والدِ گرامی شاہ ولی اللہ اور برادرِ کبیر شاہ عبدالعزیز سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ باقی علوم مروجہ کی تحصیل بھی انہی سے کی۔ ان کی کسی تصنیف کا علم بھی نہیں ہو سکا۔ البتہ تذکرہ نگاروں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں درک رکھتے تھے اور ان کا دائرۂ معلومات بہت وسیع تھا۔ وہ اتباعِ سنت میں نہایت حریص اور قرآن و حدیث

۴۳؎ حالات کے لیے دیکھیے۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۸۲ تا ۲۸۷ ——— تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۲، ۱۲۳ ——— تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۳۷ تا ۱۴۱ ——— ابجد العلوم ص ۹۲۷ ——— علم و عمل ج ۱ ص ۴۲، ۷۵ ——— حدائق الحنفیہ ص ۴۶۷ ——— حیاتِ شبلی ص ۲۱ ——— مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۱۶ تا ۱۲۱ ——— اخبار الصنادید (ص ۳۱۵) میں نواب فیض اللہ خان کے عہد کے علما و مشائخ کے ضمن میں ان کا نام تحریر ہے ——— ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں ص ۳۳، ۳۴ و ۵۹ ——— رود کوثر ص ۶۱۰

پر عمل میں انتہائی تیز تھے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور دنیا کے مال و اسباب سے قطعاً کوئی رغبت نہ تھی۔ توکل و قناعت اور زہد و عبادت میں کوئی ان کا مثیل نہ تھا۔ شکل و صورت اور وضع و لباس میں اپنے والد کے مشابہ تھے جس نے ان کے والد کو دیکھا تھا، بیٹے کو دیکھ کر شاہ صاحب کا نقشہ اس کے سامنے آجاتا تھا۔

تذکروں میں یہ بھی مرقوم ہے کہ شاہ عبدالغنی طلبا کو درس دیتے تھے اور ان کا زیادہ وقت اسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ لیکن ان کے شاگردوں کے نام اور ان کی تعداد کا علم نہیں ہو سکا۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ اتنے بڑے آدمی اور اتنے بڑے خاندان سے تعلق رکھنے والے شخص کے حالات سے اس کا دامن خالی ہے۔

شاہ عبدالغنی کے کوائفِ زندگی بے شک پردۂ خفا میں ہیں اور ہم اس کو شدت سے محسوس کرتے ہیں، لیکن اس خلا کو ان کے فرزندِ عالی قدر حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید نے پُر کر دیا اور تاریخ کو ایک نیا اور روشن دار موڑ عطا کیا۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ مولانا شہید کے حالات میں بیان کی جائے گی۔

شاہ عبدالغنی نے عالم شباب میں وفات پائی اور ان کا سال وفات ۱۲۲۷ھ بیان کیا جاتا ہے۔[۴۴]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے چار صاحب زادے تھے، ان میں سب سے چھوٹے یہی شاہ عبدالغنی تھے، لیکن ان کا انتقال سب سے پہلے ۱۲۲۷ھ میں ہوا۔ ان سے بڑے شاہ عبدالقادر تھے، انھوں نے ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ کو وفات پائی۔ ان سے بڑے شاہ رفیع الدین ۶ شوال ۱۲۳۳ھ کو فوت ہوئے اور سب سے بڑے شاہ عبدالعزیز نے ۷ شوال ۱۲۳۹ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ یعنی سب سے چھوٹے نے سب سے پہلے، ان سے بڑے نے ان کے بعد، ان سے بڑے نے ان کے بعد اور سب سے بڑے نے سب کے بعد اس دنیائے فانی سے رختِ سفر باندھا۔ گویا جو ولادت کی ترتیب

---

[۴۴] حیاتِ ولی، ص ۶۴۱ — تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۹۳ — رود کوثر، ص ۵۹۰

تھی، اس کے برعکس وفات کی ترتیب ہوئی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

۱۹۔ مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی

برّصغیر پاک وہند میں تیرھویں صدی ہجری کے جن بلند بخت حضرات علما نے خدمتِ حدیث میں نمایاں کردار ادا کیا، ان میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد اور نواسے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کا اسمِ گرامی تاریخِ تدریسِ حدیث میں اُبھرے ہوئے الفاظ میں مرقوم ہے۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کے شاگردوں اور فیض یافتوں کا حلقہ نہایت وسیع ہے۔ لیکن اس وسعت پذیر حلقے میں دو بزرگ وہ ہیں، جن کی دورِ متاخرین میں خدمتِ حدیث کے سلسلے میں کوئی مثال نہیں ملتی —— وہ ہیں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجدّدی دہلوی اور حضرت سیّد میاں نذیر حسین دہلوی رحمہما اللہ تعالیٰ۔

ان دو بزرگانِ عالی قدر سے بلا امتیازِ مسلکِ فقہی بے شمار علمائے عظام نے فیضِ حدیث حاصل کیا اور پھر اپنی ذہنی و فکری استعداد کے مطابق اس بنیادی علم کی ترویج و اشاعت میں زندگیاں وقف کر دیں —— سیّد نذیر حسین دہلوی کا تذکرہ ان شاء اللہ چودھویں صدی ہجری کے خادمانِ حدیث و فقہ کی فہرست میں آئے گا۔ ان سطور میں مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنا مقصود ہے۔

مولانا ممدوح حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاف میں سے تھے۔ اس خانوادۂ عالی مرتبت کا ہر فرد زیورِ علم و فضل سے آراستہ تھا۔ آج اس برّصغیر کے مختلف گوشوں میں فروغِ علم کی جو مسندیں بچھی ہوئی ہیں، ان میں کسی نہ کسی شکل میں اس خاندان کے اصحابِ کمال کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان میں سے کسی بزرگ نے تصوف و طریقت کی محفلیں جمائیں، کسی نے وعظ و نصیحت کا راستہ اختیار کیا، کوئی تصنیف و تالیف کی راہ پر گامزن ہوا، اور کوئی درس و تدریس کے میدان میں اُترا۔ غرض ہر ایک نے اپنی بساط و استطاعت اور حالات کے مطابق وہ شان دار خدمات انجام دیں کہ جن کی ہمہ گیر اثر پذیری

سے بنجر دلوں کی کھیتیاں سرسبز ہوئیں اور قلب ونظر کے بھٹکے ہوئے قافلوں نے تسکین و راحت کی منزل پائی۔ ان حضرات کے نوع بنوع کارنامے آج تذکرہ و رجال کی کتابوں کے زریں باب بن گئے ہیں اور لوگ ان سے مستفید ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ مولانا عبدالغنی مجددی اسی بحرِ ناپیدا کنار کی ایک موجِ خوش خرام تھے، جس سے ہزاروں تشنہ لبوں نے سیراب ہونے کی سعادت حاصل کی۔

مولانا شاہ عبدالغنی مجددی ۲۲ شعبان ۱۲۳۵ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے سلسلۂ نسب ساتویں پشت میں حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی سے ملتا ہے اور وہ یہ ہے: عبدالغنی بن شاہ ابوسعید بن صفی اللہ بن عزیز القدر بن محمد عیسیٰ بن سیف الدین بن خواجہ محمد معصوم بن حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ — نسلاً فاروقی تھے او ... تمام اوصاف و محاسن سے متصف تھے، جو ان کے آبا و اجداد میں پائے جاتے تھے۔ ان کے والدِ گرامی مولانا شاہ ابوسعید مجددی دہلوی دیارِ ہند کے بلند مرتبت علما و فقہا اور اصحابِ طریقت و تصوف میں سے تھے[۴۵]۔ برادرِ کبیر مولانا شاہ احمد سعید مجددی کا شمار بھی خطۂ ہند کے جلیل القدر اربابِ فقہ اور نامور صوفیا و اتقیا میں ہوتا ہے[۴۶]۔ ان کا گھرانا علم و عمل اور فضل و کمال کا گھرانا تھا اور بڑے بڑے فضلا ان کے حلقے میں شامل ہونے اور ان کی صحبت اختیار کرنے کو موجبِ فخر و شرف قرار دیتے تھے۔

شاہ عبدالغنی نے کچھ ہوش سنبھالا تو قرآنِ مجید حفظ کیا، پھر مولانا حبیب اللہ دہلوی سے صرف و نحو اور علومِ عربی کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد حصولِ حدیث و فقہ کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی۔ حدیث کی تحصیل مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے کی۔ موطا امام محمد اپنے والدِ گرامی شاہ ابوسعید سے پڑھا، اخذِ طریقت بھی انہی سے کیا۔ مشکوٰۃ کا درس شاہ رفیع الدین دہلوی کے فرزندِ گرامی شاہ مخصوص اللہ سے لیا۔ ۱۲۴۹ھ میں عازمِ حجاز ہوئے اور حج و

---

[۴۵] ملاحظہ ہو "فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری" جلد اول، ص ۵۴ تا ۵۶۔

[۴۶] ایضاً ص ۷۳ تا ۷۶

زیارت کا شرف حاصل کیا۔ اس زمانے میں سرزمینِ حجاز میں مولانا محمد عابد سندھی اور شیخ ابوزاہد اسماعیل رومی کا غلغلۂ درسِ حدیث بلند تھا، شاہ عبدالغنی نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور سندِ حدیث سے مفتخر ہوئے۔ بعد ازاں اپنے وطنِ مالوف ہندوستان کو مراجعت فرمائی اور دہلی میں مسندِ درسِ حدیث آراستہ کی۔

تیرھویں صدی ہجری میں شاہ محمد اسحاق دہلوی کے دریائے فیض سے دو طویل و عریض نہریں جاری ہوئیں، ایک سرِعنوان بزرگ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کے نام سے موسوم ہے اور ایک حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے نامِ نامی سے۔ آگے چل کر ان سے فیض کے لیے بےشمار چشمے پھوٹے، جنھوں نے برصغیر کے علاوہ دیگر ممالک اسلامیہ کو بھی سیراب کیا۔

شاہ عبدالغنی علم و عمل میں درجۂ امامت پر فائز تھے۔ زہد و عبادت، صداقت و امانت، عفت و صیانت، حلم و تواضع، اخلاص و دیانت اور ابتہال و رجوع الی اللہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ ہر وقت دل پر خوفِ خدا طاری رہتا۔ حدیثِ رسول پاک کی محبت اور اتباعِ سنت کا جذبہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ حسنِ اخلاق کا پیکر تھے۔ لوگوں کو ہر معاملے میں نفع پہنچانا اور ان سے نیکی کا برتاؤ کرنا ان کا شیوہ تھا۔ دنیا کے مال و متاع سے کبھی تعلق نہیں رکھا، وہ اس جہانِ گزراں میں فرشتہ سیرت عالم تھے۔

برصغیر پاک و ہند میں انھوں نے علمِ حدیث کی تدریس و ترویج میں بے پناہ خدمت انجام دی۔ وہ گوشہ گیر بزرگ تھے اور مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر درسِ حدیث دیتے تھے۔ ان سے بےشمار علما نے کسب علم حدیث کیا اور پھر وہ اس علم کی اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ بنے۔ ان کے تلامذۂ حدیث کے وسیع حلقے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا عبدالحلیم انصاری لکھنوی کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ آج ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں علوم حدیث کے جو مراکز دکھائی دیتے ہیں ان کی نسبتِ قیام جن بزرگوں کی طرف جائے گی، ان میں شاہ عبدالغنی کے اسمِ گرامی کو ہمیشہ خاص حیثیت حاصل رہے گی۔

شاہ عبدالغنی مجددی جس دور میں دہلی میں مشغولِ تدریسِ حدیث تھے، اسی دور میں ۱۸۵۷ء کا حادثۂ ہائلہ پیش آیا، قمری اعتبار سے وہ ۱۲۷۳ھ تھا۔ شدید خوں ریزی کے بعد انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کرلیا اور دہلی کے گلستانِ علم اُجڑ گئے۔ حضرت شاہ صاحب کا رُوح پرور مدرسہ بھی انگریزوں کی دست بُرد کی نذر ہو گیا۔ علمائے ہند کے لیے بالخصوص یہ نہایت ابتلا کا وقت تھا۔ یہ بوریہ نشین مسجدوں اور مدرسوں میں علومِ اسلامی کی جو خدمت انجام دے رہے تھے، اس میں قدم قدم پر رُکاوٹیں پیدا ہونے لگیں اور یہ مُلک اپنی انتہائی وُسعت کے باوجود ان کے لیے تنگ ہو گیا۔ علمائے دین حالات سے مایوس اور وقت کی آندھیوں سے دل برداشتہ ہونے کے کبھی عادی نہیں رہے، لیکن یہ انقلاب و تغیر کی ایسی سنگین لہر تھی کہ اس میں بعض حضرات کے لیے آگے چلنے کے راستے بالکل مسدود ہو گئے تھے۔ ان کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اس ملک سے، جس میں انھوں نے قال اللہ و قال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند کرنے میں عمریں کھپا دی تھیں، ہجرت کر جائیں اور اس کی سکونت ترک کر کے ارضِ حجاز کو اپنا مسکن بنا لیں۔ چنانچہ اس ہنگامۂ دار و گیر میں شاہ صاحب ممدوح نے دہلی کو خیرباد کہا اور حجاز کی راہ لی۔ پہلے مکہ معظمہ گئے، اس کے بعد مدینہ منورہ کا قصد کیا اور پھر وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ ان کے برادرِ کبیر مولانا شاہ احمد سعید مجددی دہلوی نے بھی اسی ہنگامے کے نتیجے میں اہل و عیال سمیت مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔

حضرت شاہ عبدالغنی کا عمر بھر ایک ہی مشغلہ رہا اور وہ تھا درسِ علمِ حدیث —! مدینہ منورہ میں بھی اسی خدمت میں مصروف رہے۔ جس طرح دہلی میں طلبائے حدیث کا ہجوم ان کے گرد رہتا تھا، اسی طرح مدینہ طیبہ میں بھی شائقینِ حدیث کا بہت بڑا گروہ ان کے درس میں جمع ہو گیا۔ اس گروہ میں ہندوستان کے طلبا بھی شامل تھے اور حجاز، نجد، یمن، عراق، ترکی، خراسان، ماوراء النہر اور دیگر ممالک اسلامیہ کے بھی —! واضح الفاظ میں کہنا چاہیے کہ دہلی کی بہ نسبت مدینہ منورہ میں ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اور ہر ملک کے طلبائے حدیث کھنچے ہوئے ان کے درس میں شامل

ہوتے تھے، اس لیے کہ مطالب حدیث اور علوم حدیث کے حل وکشود میں ان کی شہرت دُور دراز علاقوں تک پہنچ گئی تھی۔

حضرت شاہ عبدالغنی مجدّدی نے تدریس کے علاوہ تحریری طور پر بھی حدیث کی خدمت کی اور "انجاح الحاجہ" کے نام سے حدیث کی مشہور کتاب "سنن ابن ماجہ" پر ذیل سپرد قلم کی جو اپنے انداز کی بہترین ذیل ہے۔

تیرھویں صدی ہجری کے یہ وہ ہندی عالم تھے جو تدریس حدیث اور ولایت و جلالت کے لحاظ سے عرب و عجم کے علما و طلبا میں خاص شہرت و قبولیت کے حامل تھے ـــــ اس عالم کبیر، علامۂ وقت، محدث شہیر اور فقیہ نامدار نے منگل کے روز ۶ محرم ۱۲۹۶ھ کو مدینہ منورہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۷۴]

۲۰ ـ مولانا عبدالقادر رام پوری

مولانا عبدالقادر رام پوری کے والد کا نام محمد اکبر اور دادا کا محمد اسلم تھا۔ ان کا خاندان دراصل ہرات سے تعلق رکھتا تھا اور ان میں سے ایک بزرگ کسی دور میں دہلی آ گئے تھے، اس لیے انھیں دہلوی بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض حضرات دہلی سے نقل مکانی کر کے رام پور میں آ بسے تھے، لہٰذا یہ رام پوری کہلائے۔ صاحب ترجمہ مولانا عبدالقادر کی ولادت ۱۱۹۷ھ میں رام پور میں ہوئی۔ اس زمانے میں مفتی شرف الدین رام پوری مسندِ درس و تدریس پر متمکن تھے۔[۷۵] مولانا عبدالقادر نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو مفتی صاحب

---

[۷۴] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۶ ـــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۸۹، ۲۹۰ ـــ الیانع الجنی ـــ آثار الصنادید ص ۲۱۵، ۲۱۶ ـــ ابجد العلوم ص ۹۲۹، ۹۳۰ ـــ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۳۹۵ ـــ حدائق الحنفیہ ص ۴۹۰، ۴۹۱۔

[۷۵] مفتی شرف الدین رام پوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو "فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری"، ج ۱ ص ۲۹۹ تا ۳۰۱۔

ممدوح کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور اُن سے اور دیگر علما سے مرّوجہ درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مختلف مقامات میں گھومتے اور تھوڑی بہت خدمات انجام دیتے رہے، کسی جگہ جم کر بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ اسی اثنا میں سہارن پور پہنچے اور اس شہر کے منصب صدارت پر فائز ہوئے۔ ایک عرصے تک اس عہدۂ جلیلہ پر متمکن رہے۔ اس عہد میں رام پور کا والی نواب محمد سعید خاں تھا، اس کو ان کی صلاحیت و قابلیت کا علم ہوا تو واپس رام پور تشریف لانے کی دعوت دی۔ اگرچہ مولانا کا اصل موضوع ریاضی تھا اور اس فن میں خوب عبور رکھتے تھے، تاہم حدیث اور فقہ کی باریکیوں پر بھی گہری نظر تھی اور ان علوم کے دقیق مسائل کو خوب سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر نواب مذکور نے ان کو ریاست رام پور میں قاضی القضاۃ کا منصب تفویض کیا۔ یہ بہت بڑا عہدہ تھا جو انھیں عطا کیا گیا۔ مولانا نے یہ خدمت حسن و خوبی سے انجام دی۔ اب وہ مالی مشکلات کی منزل سے گزر چکے تھے اور خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان حالات میں اُنھوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا اور مختلف موضوعات سے متعلق متعدد کتابیں سپردِ قلم کیں، جن میں درج ذیل کتابیں لائقِ تذکرہ ہیں:

۱۔ ایک کتاب خود اپنے اور اپنے حالات سے متعلق تحریر کی۔ یہ خاصی ضخیم کتاب ہے، اور فارسی زبان میں ہے۔

۲۔ ایک کتاب شاہانِ ہند سے متعلق لکھی، جو ہندوؤں کے عہد سے شروع ہوئی اور مسلمانوں کے آخری دور پر ختم ہوتی ہے۔ یہ مختصر سی کتاب ہے۔

۳۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کی "جامع البرکات" پر تعلیقات۔

۴۔ شرح الحکم المرتضویہ: اِس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اوامر و نواہی مروی ہیں، ان میں شرعی اعتبار سے کیا حکمتیں اور فوائد کارفرما ہیں۔

۵۔ ایک کتاب میں یہ بتایا ہے کہ بعض علما سے کن کن امور میں کہاں کہاں سہوِ قلم ہوا ہے۔

۶ - شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب "حسن العقیدہ" کا ترجمہ۔

۷ - "شرح العقیدہ" از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔

۸ - ایک کتاب اس موضوع سے متعلق ہے کہ ہندوؤں نے اپنے بتوں کے جو نام رکھے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے۔

۹ - شاہ عبدالعزیز کی "میزان البلاغہ" کی شرح۔

۱۰ - تعلیقات علی شمائل الترمذی۔

۱۱ - رسالہ فی حقیقت الدعاءِ والاجابہ۔

۱۲ - رسالہ قبلہ نما۔

۱۳ - ایک مختصر سا رسالہ علم عروض کے بارے میں۔

۱۴ - ایک رسالہ مختلف مذاہب کے بارے میں۔

۱۵ - ایک رسالہ اُردو گرامر سے متعلق۔

۱۶ - ایک رسالہ ہندی ضرب الامثال سے متعلق۔

۱۷ - تاریخ اجمیر و مارواڑ۔

۱۸ - ایک رسالہ روزے کی فرضیت اور فضیلت کے متعلق۔

۱۹ - ایک رسالہ رمل، نجوم، جفر اور سحر کے ابطال میں، اس میں حقیقت سحر بھی بیان کی گئی ہے۔

۲۰ - ایک رسالہ احکامِ نکاح اور اُس کے اسرار سے متعلق۔

۲۱ - ایک رسالہ امکانِ خرقِ عوائد کے موضوع میں۔

۲۲ - ایک رسالہ تعلیم و تربیت سے متعلق۔

۲۳ - ایک رسالہ "سیاسۃ المدن" میں۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے بڑے رسائل ان کی یادگار ہیں۔

مولانا عبدالقادر رام پوری نے ۷ رجب ۱۲۳۵ھ کو رام پور میں وفات پائی۔[۹۵]

---

[۹۵] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۹۳، ۲۹۴۔

۲۱ــ قاضی عبدالقادر کنتوری

قاضی عبدالقادر بن قاضی شریف الدین حسینی کنتوری، شیخ نظام الدین چشتی اورنگ آبادی کی اولاد سے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد اصلاً نقوی سادات تھے اور نیشاپور کے رہنے والے تھے، اس خاندان کے بعض اسلاف کسی زمانے میں نیشاپور سے اُٹھ کر ہندوستان آگئے تھے اور لکھنؤ کے نواح میں قصبۂ "کنتور" میں مقیم ہو گئے تھے۔ اس لیے یہ لوگ کنتوری کہلائے۔ قاضی عبدالقادر کنتوری کے والد کنتور سے دکن کے ایک شہر اورنگ آباد گئے اور وہاں کے قاضی مقرر کر دیے گئے، لہٰذا اس شہر کی نسبت سے اورنگ آبادی مشہور ہوئے۔ قاضی عبدالقادر، باپ کے زمانۂ قیام اورنگ آباد میں، ۱۱۵۱ھ کو وہیں پیدا ہوئے، اس لیے مقامِ ولادت کی بنا پر انھیں اورنگ آبادی کی نسبت سے بھی پکارا جاتا ہے۔

قاضی صاحب موصوف کچھ بڑے ہوئے تو پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر شیخ فخر الدین نائطی اور قاضی شیخ الاسلام خاں سے درسی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں سید غلام علی حسینی بلگرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے عربی ادب کی کتابوں کی تکمیل کی۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا، اس میں بھی انہی سے اصلاح لیتے رہے، مہرباں تخلص کرتے تھے۔

علوم عقلیہ و نقلیہ کے اکتساب کے بعد اورنگ آباد میں مسندِ درس بچھائی اور طلبا کو تفسیر، حدیث اور تصوف کی تعلیم دینا شروع کی۔ خود بھی صاحب طریقت تھے اور اس سلسلے میں اپنے ماموں شیخ فخر الدین اورنگ آبادی سے فیض یافتہ تھے۔ چونکہ حدیث و فقہ اور دیگر علوم میں مہارت رکھتے تھے، اس لیے والد کی وفات کے بعد اورنگ آباد کے منصب قضا پر فائز ہوئے۔ لیکن اس خدمت پر صرف تین سال مامور رہے، اس کے بعد اس منصب سے معزول ہو گئے اور ۱۱۸۳ھ میں مدراس کے نواب والا جاہ محمد علی خاں کے دربار میں مدراس چلے گئے، اس نے ان کی بہت پذیرائی کی اور انتہائی

عقیدت و احترام کا برتاؤ کیا۔ مدراس میں ہر حلقے کے لوگوں نے ان کو مستحق عزت گردانا۔ مدراس سے قصبہ میلاپور منتقل ہو گئے جو اس کے مضافات میں واقع ہے اور وہاں کی خانقاہ میں رہنے لگے، اسی وجہ سے انھیں میلاپوری بھی کہا جاتا ہے۔

قاضی عبدالقادر کنتوری اپنے دور کے عالم، فقیہ اور شاعر تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ اصل الاصول فی تطبیق المنقول بالمعقول: اس کتاب میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ عقلی اور نقلی علوم میں مطابقت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔

۲۔ کحل الجواھر فی ترجمۃ شیخ عبدالقادر: یہ کتاب شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات میں ہے۔

۳۔ مفتاح المعارف: یہ کتاب تصوف سے متعلق ہے۔

۴۔ شرح مثنوی معنوی: یہ مثنوی مولانا روم کی شرح ہے۔

۵۔ ایک دیوان عربی اشعار پر مشتمل ہے۔

۶۔ ایک دیوان فارسی اشعار کا ہے۔

قاضی عبدالقادر حسینی کنتوری نے ۱۲۰۴ھ کو قصبہ میلاپور میں وفات پائی جو مدراس کے نواح میں ہے اور وہاں کی خانقاہ میں مدفون ہوئے۔[۵۶]

۲۲۔ شاہ عبدالقادر دہلوی

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ترتیب کے اعتبار سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے تیسرے فرزند تھے۔ یعنی شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین دونوں سے چھوٹے تھے۔ ان کا سال ولادت اس دور کے تذکرہ نگاروں نے محفوظ نہیں کیا۔

---

[۵۶] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۹۲، ۲۹۳ ـــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۸ (اس میں سال ولادت ۱۱۴۳ھ مرقوم ہے)

حالاتِ زندگی بھی کسی ایک جگہ مرقوم نہیں۔ مختلف حضرات نے ان سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۱۳ سال کے قریب تھی۔ شاہ صاحب کی وفات ۱۱۷۶ھ میں ہوئی۔ اس حساب سے ان کا سالِ وفات ۱۱۶۳ھ بنتا ہے۔

حصولِ علم

شاہ عبدالقادر نہایت ذہین و طبّاع تھے اور گھر میں علم کا دریا رواں تھا، تذین اور تقوے میں بھی اس خاندان کے تمام افراد بے مثال تھے۔ قدرتی بات ہے کہ ان پر بھی گھر کے ماحول کا اثر ہوا، اور بچپن ہی سے حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ عظیم القدر باپ سے بھی یقیناً کچھ کتابیں پڑھی ہوں گی، لیکن کم عمری کی بنا پر ان سے زیادہ استفادہ نہیں کر سکے۔ شاہ ولی اللہ کے انتقال کے وقت شاہ عبدالعزیز کی عمر سترہ سال کی تھی اور وہ سب بھائیوں سے بڑے تھے، درس و تدریس کا سلسلہ بھی انھوں نے شروع کر دیا تھا۔ شاہ عبدالقادر نے بھی انہی سے تحصیل کی اور تمام مروّج و متداول علوم بڑے بھائی سے پڑھے، انہی کی کفالت و تربیت میں رہے اور وہی آخر وقت تک اپنے اس گوشہ نشین برادرِ صغیر کی سرپرستی کرتے رہے۔

مسجد اکبر آبادی

"مدرسہ شاہ عبدالعزیز" دہلی میں گلی شاہ عبدالعزیز" میں قائم تھا۔ مسجد شاہ عبدالعزیز بھی وہیں تھی، آج بھی یہ گلی اور مسجد اسی نام سے مشہور ہیں۔ شاہ عبدالقادر پہلے وہیں تھے، اس کے بعد مسجد اکبر آبادی میں چلے گئے تھے۔ یہ مسجد ۱۰۶۰ھ میں شاہ جہاں بادشاہ کی بیوی اعز النسا بیگم نے بنوائی تھی۔ اس خاتون کو "اکبر آبادی محل" کا خطاب دیا گیا تھا، اس لیے یہ مسجد "مسجد اکبر آبادی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ بہت وسیع اور شاندار مسجد تھی[۱] شاہ عبدالقادر اسی مسجد میں فروکش تھے اور یہیں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا فریضہ انجام

---

[۱] آثار الصنادید، ص ۱۷۸

دیتے تھے۔ نہایت قانع اور سادگی پسند بزرگ تھے۔ شاہ عبدالعزیز ان کے لیے سال بھر میں دو جوڑے کپڑے اور صبح و شام دونوں وقت کا کھانا مسجد اکبر آبادی میں بھیج دیتے، بس اس درویش منش عالم کی یہی کُل کائنات تھی۔

تلامذۂ کرام

مسجد اکبر آبادی میں ان سے متعدد حضرات نے علم حاصل کیا۔ امیر المجاہدین حضرت سید احمد شہید بریلوی نے عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا شاہ محمد اسحاق اور مولانا محمد اسماعیل شہید سے پڑھی تھیں، لیکن قرآن مجید کے ترجمہ اور حدیث کا درس اسی مسجد میں شاہ عبدالقادر سے لیا۔ سلوک و تصوف کی منزلیں بھی انہی کی صحبت میں طے کیں۔ حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی بھی کبھی زیارت اور کبھی استفادے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔[۵۲]

مولانا فضل حق خیر آبادی جو فلسفہ و حکمت میں درجۂ امامت پر فائز تھے، حدیث میں شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے۔[۵۳]

اُس دَور کے نامور شاعر حکیم مومن خاں مومنؔ حضرت شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے۔ اس سلسلے میں عرش گیاوی لکھتے ہیں: "کچھ کتابیں تبرکاً شاہ عبدالعزیز صاحب سے اور بقیہ علامہ شاہ عبدالقادر صاحب سے پڑھیں اور یہیں عربی، فارسی، حدیث، فقہ، منطق، معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔"[۵۴]

اُن حضرات کے علاوہ مولانا عبدالحی بڑھانوی، مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، شاہ محمد اسحاق دہلوی، سید محبوب علی جعفری، سید اسحاق بریلوی اور خلقِ کثیر نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کرنے کا شرف حاصل کیا۔[۵۵]

۵۲؎ محاسن موضح قرآن، ص ۲۰

۵۳؎ ایضاً، ص ۲۴

۵۴؎ مطالعہ مومن، ص ۲۲

۵۵؎ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۹۵

رُعب و جلال

شاہ صاحب ظاہری سادگی اور انکساری کے باوجود نہایت بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔ رؤسائے شہر، اُمرائے مملکت اور علمائے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوتے لیکن ان کے جلال اور وجاہت کا یہ عالم تھا کہ کسی کو اُن کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ ہوتی۔ مزاج میں استغنا حد درجے کا تھا۔ اس دور کی سیاسیات میں بھی درک رکھتے تھے لیکن عملاً اس جھمیلے میں کبھی نہیں پڑے، ہمیشہ خدمتِ دین میں مشغول رہے اور پوری زندگی مسجد اکبرآبادی کے حجرے میں گزار دی۔

ترجمۂ قرآن

شاہ صاحب کی بہت بڑی خدمت قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کے بارے میں سیّد عبدالحی حسنی نزھۃ الخواطر میں اپنے والدِ مکرم سیّد فخر الدین حسنی کی کتاب "مہر جہاں تاب" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے خواب دیکھا کہ ان پر قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہ خواب اُنھوں نے اپنے برادرِ کبیر شاہ عبدالعزیز سے بیان کیا۔ اُنھوں نے فرمایا، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نزولِ وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے، لیکن خواب بلاشبہ حق ہے۔ آپ کے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خدمتِ قرآن کی ایسی توفیق عطا فرمائے گا جو اس سے پہلے کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔[۵۶]

چنانچہ اللہ نے ان کو اُردو زبان میں ترجمہ قرآن مجید کی توفیق سے نوازا جو موضح قرآن" کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کا ترجمہ نہ کبھی ہوا، نہ ہوگا۔ صاف ستھری اُردو۔ نہ کوئی لفظ زائد نہ کم۔ سمجھنے میں کوئی دِقت پیش نہیں آتی۔ پھر اللہ نے اس ترجمے کو اس قدر قبولیتِ عامہ عطا کی کہ ہر گھر میں موجود اور ہر شخص اس سے استفادہ کرنے پر مجبور۔ بانہ کوئی لفظ متروک نہ غیر مانوس —!! جو شخص قرآن سے ذرّہ بھی انس رکھتا اور اس کو سمجھنا چاہتا ہے، وہ اس ترجمے کی تلاش کرتا ہے، اور پھر جب اس کو الفاظِ قرآن سے ملا کر پڑھنا شروع کرتا ہے تو

---

۵۶ نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۹۵

اشتیاق مطالعہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا ہے۔ ترجمے سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو اُردو زبان اور اُس کے محاوروں پر عبور تھا۔ اندازہ کیجیے جب اُردو کے قواعد وضوابط بھی نہیں بنے تھے اور زیادہ مقبول بھی نہیں ہوئی تھی، اس زمانے میں قرآن مجید کا اس میں ترجمہ کرنا کس درجے مشکل کام تھا۔

یہ ترجمہ اُنھوں نے ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں مکمل کیا۔ "موضوع قرآن" اس کا تاریخی نام ہے۔

خواجہ میر درد کی شاگردی

بعض تذکروں میں بتایا گیا ہے کہ شاہ عبدالقادر نے اُردو زبان خواجہ میر درد سے سیکھی تھی۔ شاہ عبدالعزیز بھی اپنے والدِ مکرم کے حکم سے بچپن میں اُردو سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد کی مجلس میں جاتے تھے۔ اس زمانے میں اُردو اگرچہ ابتدائی مراحل میں تھی، لیکن بعض پڑھے لکھے لوگوں نے اس کو اپنا لیا تھا اور اس کی ترقی کے مواقع پیدا ہو رہے تھے۔ چند شعرا نے بھی اسے ذریعۂ اظہار و بیان قرار دے لیا تھا۔ شاہ ولی اللہ اس صورتِ حال سے خوب آگاہ تھے، چنانچہ وہ اپنے بیٹوں کو اس کے سیکھنے کی تاکید کرتے تھے۔ ناصر نذیر فراق "لال قلعہ کی ایک جھلک" میں لکھتے ہیں:

> مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے، جس طرح اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ فن ہے، اسی طرح اصولِ زبان بھی فن ہے اور اُردو زبان کے موجد و مجتہد خواجہ میر درد صاحب ہیں۔ ان کی صحبت اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو، کیونکہ خواجہ صاحب پکے پان ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب خاص طور پر میر درد صاحب کے شاگرد تھے۔[۸۵]

ہندوستان کے نامور عالم مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی شاہ صاحب کو خواجہ میر درد کا شاگرد ماننے سے متأمل ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شاہ صاحب نے "خواجہ صاحب سے کچھ استفادہ تو کیا ہوگا" لیکن اُستادی اور شاگردی کا تعلق ایسا معمولی تعلق نہیں کہ اس دور کی

---

۸۵ لال قلعہ کی ایک جھلک، ص ۶۳۔

تاریخیں اس سے خاموشی اختیار کرتی ہیں۔[۵۸]

مولانا قاسمی نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ "اس دور کی تاریخوں" سے وہ کون سی "تاریخیں" مُراد لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک گزارش تو یہ ہے کہ اس کا ذکر مطالعہ مومن (ص ۲۳۷) اور لال قلعہ کی ایک جھلک (ص ۶۳) میں موجود ہے۔ جن کا حوالہ خود مولانا نے بھی دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر بقول ان کے شاہ صاحب نے استفادہ کیا ہوگا تو لفظ "استفادہ" کا اطلاق شاگردی پر بھی ہوتا ہے اور تذکرہ و رجال کی کتابوں میں شاگردی کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ شاہ عبدالقادر یا کسی اور بزرگ نے اگر واقعی خواجہ میر درؔد کی شاگردی اختیار کی ہے تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

خواجہ صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ وہ بہت بڑے عالم، فقیہ، صوفی اور مصنف تھے اور بہت اُونچے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی شاگردی سے خدانخواستہ شاہ صاحب کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا، بلکہ ان کے لیے سطحِ فکر پر عزت و احترام کے جذبات اُبھرتے ہیں اور ذہن میں یہ خیال کروٹ لیتا ہے کہ ہمارے اسلاف حصولِ علم کے اس درجے شائق تھے کہ کسی بھی دروازے پر دستک دینے کو معیوب نہیں گردانتے تھے۔

مولانا قاسمی نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ "خواجہ صاحب کی زبان میں جو متروک الفاظ ملتے ہیں، شاہ (عبدالقادر) صاحب کی زبان ان سے بالکل پاک ہے۔"[۵۹]

اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ خواجہ میر درؔد کا زمانہ بارھویں صدی ہجری کا ہے وہ ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو وفات پائی۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا دور تیرھویں صدی ہجری کا ہے۔ وہ ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ کو انتقال

---

۵۸ محاسنِ موضح قرآن ص ۲۱

۵۹ ایضاً

کیا یعنی خواجہ میر درد سے تیس سال بعد پیدا ہوئے اور اکتیس سال بعد وفات پائی۔ مولانا اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں کہ زبانیں ہر روز بدلتی اور ترقی کرتی ہیں، اور یہاں تو پورے تیس سال کا فرق ہے۔ ظاہر ہے، جو زبان خواجہ صاحب کے زمانے میں رائج تھی، وہ شاہ صاحب کے زمانے میں باقی نہ رہی تھی۔ شاہ صاحب نے بلاشبہ خواجہ میر درد کی وفات سے صرف ۶ سال بعد ۱۲۰۵ھ میں ترجمہ مکمل کر لیا تھا، لیکن اسی وقت طبع تو نہیں ہو گیا تھا۔ مسودے میں اس کے بعد بھی اصلاح و ترمیم کا عمل جاری رہا ہو گا اور ایسے الفاظ جو پہلے مستعمل تھے اور بعد کو متروک ہو گئے، نظرِ ثانی میں نکال دیے ہوں گے۔ پھر لیاقت میں شاگرد، انداز و بیان میں اُستاد سے بڑھ بھی جاتا ہے۔

ترجمے کی خصوصیات

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ بے شمار خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض مقامات پر ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھی تحریر کیے گئے ہیں جب کہ اس زمانے کی اردو نظم و نثر میں اس کا رواج نہ تھا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا اخلاق حسین قاسمی نے بڑی عمدہ بات کہی ہے، وہ لکھتے ہیں: ”اس کا مقصد صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم طبقہ قرآن کے پیغام سے قریب ہو۔“[۱۶۰]

اس ضمن میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ کے عربی متن سے اردو میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

”کسی غیر مسلم قوم میں دینِ حق کی تبلیغ، اتمامِ حجت کی حد تک کرنا مسلمانوں کی اصل ذمے داری ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کی زبان میں اسلامی اصول پیش کیے جائیں تاکہ وہ سمجھ سکیں۔ اگر اس درجے ابلاغ دین نہ ہو گا تو وہ قوم اصحابِ اعراف کی حیثیت میں ہو گی۔“[۱۶۱]

شاہ عبدالعزیز نے بھی فتاویٰ عزیزی میں اس مسئلے کی وضاحت کی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں: مسلمانوں پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ ہر قوم کو اس کی زبان میں اللہ کا پیغام پہنچائیں، زبانی

---

[۱۶۰] محاسن موضح قرآن، ص ۳۱

[۱۶۱] حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۱۷۔

اور تحریری افہام وتفہیم کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاقِ حسنہ کو بھی بطور دلیل کے ان کے سامنے پیش کریں، اس طرح وہ کفر اور اسلام کے درمیان امتیاز کرکے دکھائیں۔ اگر کسی قوم پر اس طرح اتمام حجت نہ ہوگا تو وہ قوم "اصحابِ فترت" کہلائے گی۔ شاہ صاحب کے فارسی الفاظ یہ ہیں: حکم او حکمِ اہلِ فترت بود علیٰ اختلاف المذاہب[۶۲]

اسی تبلیغِ اسلام اور اشاعتِ دین کی غرض کو جو شاہ عبدالقادر کے اکابر کا مقصدِ حیات تھا، خود انھوں نے بھی پیشِ نگاہ رکھا اور قرآن مجید کے ترجمے میں بھی بعض ہندی اور سنسکرت کے الفاظ استعمال فرمائے تاکہ ان کے ملک کے ہندو بھی آسانی سے اس کو سمجھ سکیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ اسلام کی نشر و ترویج اسی بولی میں کرنی چاہیے۔ جو لوگوں کے لیے زیادہ مؤثر اور مفید ہو۔

شاہ صاحب کے خاندان کے علما کی تصنیفی اور علمی زبان عربی اور فارسی تھی، لیکن وہ اپنے ملک کی ہندی زبان سے بھی آگاہ تھے۔ شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین میں اپنے والدِ گرامی شاہ عبدالرحیم کے چند ہندی اشعار نقل کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زبان میں شعر کہنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اشعار یہ ہیں:

جب جیو تھا تب پیو نہ تھا اب پیو ہے جیو نا تھ
رحیم پیا سوں یوں ملی جوں بوند سمندر ناتھ[۶۳]

بہر حال شاہ ولی اللہ کا خاندان نہایت بلند مرتبت خاندان تھا۔ اس کا ہر فرد علم کی دولت سے مالا مال اور پاک بازی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ انھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جس کی اس برِصغیر میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ قرآن مجید کی خدمت میں ان کو اولیت حاصل ہے۔ فارسی میں شاہ ولی اللہ کا ترجمہ اور اردو میں ان کے فرزندانِ گرامی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے ترجمے

۶۲ے فتاویٰ عزیزی، ص ۱۴۰

۶۳ے انفاس العارفین، ص ۸۱

اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اب اُردو زبان ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے اور قرآن کے متعدد ترجمے ہو چکے ہیں، لیکن جو خصوصیت ان دو ترجموں میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ بالخصوص شاہ عبدالقادر کا ترجمہ جن اوصاف سے مزین ہے، دو سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود کوئی اور ترجمہ اس کی مثال پیش نہ کر سکا۔

وفات

حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے بدھ کے روز ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ کو دہلی میں وفات پائی اور اپنے والد محترم کے قریب دفن کیے گئے۔ ان کی وفات کے وقت دونوں بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین زندہ تھے اور تدفین کے موقع پر نہایت حزن و ملال کے ساتھ بار بار کہتے تھے کہ آج ہم کسی انسان کو دفن نہیں کر رہے ہیں بلکہ علم و عرفان کو دفن کر رہے ہیں۔

مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند (ص ۱۲۹) میں ان کی تاریخ وفات ۱۹ رجب ۱۲۴۲ھ لکھی ہے جو صحیح نہیں۔ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے بھی تراجم علمائے حدیث ہند (ص ۶۴) میں یہی تاریخ رقم کی ہے۔ جو غلط ہے۔ اسی طرح شاہ رفیع الدین کی تاریخ ارتحال ۶ شوال ۱۲۳۳ھ ہے لیکن مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند (ص ۶۶) میں اور مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے تراجم علمائے حدیث ہند (ص ۶۵) میں ۱۲۴۹ھ لکھی ہے جو قرین صحت نہیں۔[۶۴]

۶۴ے شاہ عبدالقادر دہلوی کے حالات کے لیے دیکھیے: نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۹۵، ۲۹۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۹۔ آثار الصنادید، ص ۲۶۹۔ حیاتِ ولی، ص ۶۳۵ تا ۶۴۱۔ واقعات دار الحکومت دہلی، ج ۲ ص ۵۸۸، ۵۸۹۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۷۱۔ علم و عمل، ج ۱ ص ۲۲۹۔ ابجد العلوم ص ۹۱۵۔ الیانع الجنی ص ۷۵۔ تراجم الفضلاء ص ۱۷۔ محاسن موضح قرآن۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۶۴، ۶۵۔ رود کوثر، ص ۵۹۶، ۵۹۷

۲۳۔۔۔ مفتی عبدالقیوم صدیقی بڑھانوی

مفتی عبدالقیوم صدیقی بڑھانوی تیرھویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے عالم کبیر، شیخ و امام اور نامور محدث و فقیہ تھے۔ جماعت فقہا کے مشاہیر اور اکابر علما میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اپنے دور کے بہت بڑے مفتی اور مسائل میں مرجع خلائق تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا عبدالحی بڑھانوی، دادا کا ہبۃ اللہ اور پردادا کا نور اللہ تھا۔ نسباً صدیقی تھے اور اصل وطن بُڑھانہ (ضلع مظفر نگر، یو۔ پی) تھا۔ مولانا عبدالحی بڑھانوی اپنے عہد کے معروف عالم دین تھے، ان کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

مفتی عبدالقیوم بُڑھانوی کی ولادت ۱۲۳۱ھ کو بُڑھانہ میں ہوئی۔ خاندان کے تمام افراد علم و فضل میں ممتاز تھے، ابتدائی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ صرف و نحو کے مختصر رسائل اور فنونِ ریاضیہ سید نصیر الدین حسینی شافعی سے پڑھے جو ماں کی طرف سے حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کی اولاد میں سے تھے۔ بعض درسی کتابوں کی تحصیل مولانا نصیر الدین لکھنوی سے کی جن کا سلسلۂ درس دہلی میں جاری تھا۔

ان کے والد مولانا عبدالحی بڑھانوی امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ بیٹے نے بھی صغر سنی میں سید صاحب کی بیعت کر لی تھی۔

مولانا عبدالحی کے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے دو رشتے تھے۔ ایک یہ کہ مولانا عبدالحی کی پھوپھی شاہ صاحب کی اہلیہ تھیں، دوسرے شاہ صاحب کی ایک صاحب زادی کی شادی مولانا سے ہوئی، لیکن ان سے مولانا کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی وفات کے بعد مولانا نے اپنے چچا کی بیٹی سے نکاح کیا، جن سے عبدالقیوم پیدا ہوئے۔ یہ مولانا کے اکلوتے فرزند تھے۔

عبدالقیوم کی تربیت نہایت عمدہ طریقے سے ہوئی تھی، چھوٹی عمر میں سید احمد بریلوی کے سلسلۂ بیعت میں شامل ہو گئے تھے۔ جس زمانے میں سید صاحب نے جہاد کے لیے عزم سرحد کیا، عبدالقیوم کا سن بارہ تیرہ سال کا تھا اور سید صاحب کے ساتھ

سرحد چلے گئے تھے ۔ مولانا عبدالحی بھی وہیں تھے مولانا نے ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ (۲۴ فروری ۱۸۲۸ء) کو وفات پائی ۔ یوں تو سید صاحب عبدالقیوم پر پہلے ہی سے بہت شفقت فرماتے تھے ، لیکن باپ کی وفات کے بعد اس میں اور اضافہ ہو گیا ۔ اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے اور ہر لحاظ سے ان کا خیال رکھتے ۔ بعد میں اس لیے انھیں واپس وطن بھیج دیا تھا کہ ان کی والدہ کو مولانا کے انتقال کی اطلاع ہوگی تو بیٹے کا خیال بھی دل میں آئے گا ، اس سے اور مغموم ہوں گی ۔ بیٹا ان کے پاس ہوگا تو کسی حد تک شدتِ غم میں کمی آجائے گی ۔ عبدالقیوم کے دو حقیقی ماموں شیخ جلال الدین اور شیخ صلاح الدین بھی سید صاحب کے لشکر میں شامل تھے ، وہ بھی کم عمر بھانجے کے ساتھ وطن واپس آئے ۔

علاقۂ سرحد سے واپس آکر عبدالقیوم دہلی میں شاہ محمد اسحاق دہلوی اور اُن کے بھائی شاہ محمد یعقوب کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور حصولِ علم میں مشغول ہو گئے ۔ شاہ محمد اسحاق سے حدیث و فقہ کی تکمیل کی اور شاہ محمد یعقوب سے علم فرائض کی کتابیں پڑھیں ۔ شیخ محمد عظیم سے ، جو سید صاحب سے فیض یافتہ تھے اور ٹونک میں فروکش تھے ، اخذِ طریقت کیا اور عرصے تک ٹونک میں ان کی صحبت میں رہے ۔ شادی شاہ محمد اسحاق دہلوی کی صاحبزادی اَمۃ الغفور سے ہوئی ، جو بہت عابدہ و زاہدہ اور عالمہ خاتون تھیں اور حدیث و فقہ میں عبور کا یہ عالم تھا کہ مفتی صاحب جب بھوپال میں عہدۂ افتا پر فائز تھے تو بعض فقہی نوعیت کے مسائل میں اُن سے رجوع فرماتے تھے[۶۵]

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مفتی صاحب مع اہل وعیال کے حجازِ مقدس گئے ، سعادتِ حج سے بہرہ اندوز ہوئے اور کچھ عرصہ مکہ مکرمہ میں مقیم رہے ۔ اسی اثنا میں والیۂ بھوپال نواب سکندر جہاں بیگم حج کے لیے مکہ مکرمہ گئیں ، وہاں مفتی صاحب ممدوح کے علم وفضل اور زہد و تقویٰ سے نہایت متاثر ہوئیں اور بھوپال تشریف لانے کی دعوت دی ۔ وہ اہل وعیال سمیت بھوپال آئے تو وسعتِ علم اور کتاب و سنت پر عبور کی وجہ

---

۶۵ دیکھیے "فقہائے پاک وہند تیرھویں صدی ہجری" ج ۱ ص ۹۷، ۹۸ ۔

سے ریاست بھوپال کا منصب افتا پیش کیا اور سکونت کے لیے قطعۂ زمین عطا فرمایا۔

مفتی صاحب نہایت پابندِ شریعت اور متبع کتاب وسنّت تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ والیۂ بھوپال نے ان کی اہلیہ محترمہ سے مُلاقات کی خواہش ظاہر کی اور انھیں محل میں بھیجنے کے لیے کہا۔ آپ نے انکار کردیا۔ والیۂ بھوپال نے پیغام بھیجا کہ اگر آپ انھیں محل میں آنے کی اجازت نہیں دیتے تو میں خود اُن سے مُلاقات کے لیے آپ کے گھر آجاؤں گی۔ فرمایا آپ پردہ نہیں کرتیں، اس لیے اجازت نہیں دے سکتا۔ برقع اوڑھ کر آئیں تو مُلاقات کرسکتی ہیں۔

علمائے وقت کے نزدیک مفتی صاحب نہایت قدرومنزلت کے حامل تھے۔ کبھی دہلی تشریف لے جاتے تو میاں سیّد نذیر حسین دہلوی ان کی خدمت میں جاتے اور انتہائی احترام سے اُن کی مجلس میں بیٹھتے، حالانکہ میاں صاحب عمر میں ان سے بڑے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں بھی ان کی بہت تکریم کرتے اور مختلف مسائل میں ان سے گفتگو فرماتے۔

علم وحلم، انکساری و تواضع، وعظ وتذکیر، علوِّ اخلاق اور درس وافادہ میں اپنے اسلاف کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ منصبِ افتا کی بھاری ذمے داریوں کے باوجود تدریسِ قرآن و حدیث میں مشغول رہتے۔ ان سے متعدد حضراتِ علما نے استفادہ کیا، جن میں مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی اور مولانا احمد حسن امروہوی شامل ہیں۔

مفتی صاحب ممدوح میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ خواب کی تعبیر دینے میں ماہر تھے، جو تعبیر دیتے، صحیح ثابت ہوتی۔

آخرِ عمر میں خرابیٔ صحت کی بنا پر بھوپال سے اپنے وطن بڑھانہ منتقل ہوگئے تھے اور پھر وہیں ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں فوت ہوئے۔ اٹھہتر[۹۸] سال کی عمر پائی[۴۲]۔ ـــــ مولانا ابو یحییٰ

---

[۴۲] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۹۷، ۲۹۸ ـــ تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۱۲۲ تا ۱۲۴ ـــ جماعت مجاہدین، ص ۱۱۵ و ۲۹۳، ۲۹۴ ـــ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۲۶۸ ـــ طی المراسخ الی منازل البرازخ ص ۵۱۳، ۵۱۴ ـــ

امام خاں نوشہروی نے "تراجم علمائے حدیث ہند" (ص ۱۲۴) میں مقام وفات وتدفین بھوپال لکھا ہے جو صحیح نہیں۔

۲۴ — مولانا عبد اللہ مدراسی

ارضِ ہند کے شہر مدراس اور اس کے گرد ونواح میں بے شمار اربابِ علم اور اصحابِ کمال پیدا ہوئے، جنھوں نے تصنیف وتدریس کے میدان میں بڑی شہرت پائی اور اپنی خدماتِ گوناگوں کی وجہ سے عالی مرتبے کو پہنچے۔ ان خوش نصیب حضرات میں مولانا عبد اللہ مدراسی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی قاضی صبغت اللہ[۱] اور جدِ امجد کا شیخ محمد غوث تھا۔ یہ تمام حضرات علم وعرفان کی دولت سے مالامال تھے اور حدیث وفقہ میں مہارت رکھتے تھے۔

مولانا عبد اللہ مدراسی کی ولادت ۲۸ ربیع الاول ۱۲۳۶ھ کو ہوئی۔ گھر میں علم کا فیض جاری تھا، اپنے والد مکرم قاضی صبغت اللہ مدراسی اور عمِ محترم سے مروجہ علوم کی کتابیں پڑھیں۔ قاضی ارتضا علی گوپاموی اس زمانے کے جید اساتذہ میں سے تھے، اُن سے بھی اکتسابِ علم کیا۔ ان حضرات کے علاوہ اور بھی متعدد علما کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔

اس عہد کے سرکاری مناصب میں صدارت کا منصب بہت اہم تھا اور یہ اُسی شخص کو تفویض ہوتا تھا جو علم وادراک بالخصوص فقہ میں عبور رکھتا ہو۔ مولانا عبد اللہ فقہِ شافعی میں اس معیار پر پورا اُترتے تھے اور اس علاقے میں شوافع اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے۔ مولانا ممدوح کو ۱۲۶۰ھ میں یہ منصب جلیلہ حکومتِ مدراس کی طرف سے عطا کیا گیا۔

مولانا موصوف جلیل القدر عالم ہونے کے ساتھ بہت عابد وزاہد اور متقی بھی تھے۔ سرزمینِ حرم سے اُنھیں بہت محبت تھی۔ چنانچہ وہ چار مرتبہ حج وزیارت کے لیے عازمِ حجاز ہوئے۔ اس زمانے میں یہ انتہائی مشکل سفر تھا۔ ایک مرتبہ سال بھر سے زیادہ عرصہ وہاں رہے، اس

---

[۱] قاضی صبغت اللہ کے حالات کے لیے دیکھیے "فقہائے پاک وہند تیرھویں صدی ہجری" ج ۱ ص ۳۰۶ تا ۳۰۸

اس طرح انھوں نے پانچ حج کیے اور یہ بہت بڑی سعادت تھی جو انہیں حاصل ہوئی۔

وہ نامور مصنف بھی تھے اور کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ چوں کہ وہ مسلکاً شافعی تھے، لہٰذا فقہِ شافعی کے سلسلے میں ان کی خدمات زیادہ ہیں۔ تصنیفات یہ ہیں :-

۱۔ الفوائد الغوثیہ فی فقہ الشافعیہ :- یہ کتاب جیساکہ نام سے ظاہر ہے، فقہِ شافعی سے متعلق ہے۔

۲۔ تعلیقات علی مختصر ابی شجاع :- یہ بھی فقہِ شافعی کے بارے میں ہے۔

۳۔ تخریج احادیث البیضاوی :- تفسیر بیضاوی میں درج احادیث کی تخریج۔

۴۔ تحفۃ الاحبہ فی بیان استحباب تنل الوزغہ

۵۔ تحفۃ المحبین لمولد حبیب ربّ العالمین۔

۶۔ کتاب الزجر الی منکر شق القمر

۷۔ اوضح المناسک۔

یہ عالمِ کبیر آخری حج سے واپس آ رہے تھے کہ ۲۵ ربیع الاوّل ۱۲۸۸ھ کو دکن کے شہر "گلبرگہ" (ہندوستان) میں انتقال کر گئے۔[۶۸]

۲۵۔ مولانا عبداللہ مدراسی

مدراس کے علمائے کرام اور فقہائے عظام میں ایک اور مولانا عبداللہ مدراسی کا سلسلۂ نسب یہ ہے :- عبداللہ بن عبدالقادر بن صادق بن عبداللہ بن نظام الدین۔ یہ بھی شافعی تھے اور محتشم الدولہ، بخشی الملک میر عسکری خان بہادر سالار جنگ ان کے خطاب تھے۔

۲۷ شعبان ۱۲۰۵ھ کو پیدا ہوئے اور مولانا محمد حسین مدراسی، بحر العلوم مولانا

۶۸؎ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۰۱ بحوالہ حدیقۃ المرام۔

عبدالعلی لکھنوی اور مولانا غلام غوث شافعی مدراسی سے علم حاصل کیا۔ بحرالعلوم اس زمانے میں مدراس میں قیام پذیر تھے اور طلبا کی کثیر جماعت ان کے حلقۂ درس میں شریک تھی۔ مولانا محمد غوث مدراسی شافعی المسلک تھے اور اُن مولانا عبداللہ مدراسی کے جدِ امجد تھے، جن کا تذکرہ گزشتہ صفحے میں ہوا ہے، وہ صاحبِ ترجمہ کے قریبی رشتے دار تھے۔

مولانا عبداللہ مدراسی کا شمار اپنے علاقے اور عہد کے اصحابِ علم میں بھی ہوتا تھا، اور ارکانِ دولت میں بھی۔ امیرِ مدراس نے ان کو اپنے عساکر کا سربراہ مقرر کیا تھا اور ان کی سرکاری خدمات کی وجہ سے وہ خطابات عطا کیے تھے، جو ابتدائی سطور میں بیان ہوئے ہیں۔ ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ سرکاری کام کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہتے۔ ان کی تصنیفات جو خاص اہمیت کی حامل ہیں یہ ہیں :۔

۱۔ الدر الثمین فی شرح الاربعین :۔ امام نووی کی اربعین کی شرح۔

۲۔ شرح اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی کی شرح۔

۳۔ رجال الصحیح لمسلم بن الحجاج نیسابوری۔

مدراس کے اس نامور عالم و فقیہ نے ۲۶ محرم ۱۲۶۷ھ کو مدراس میں وفات پائی اور نمازِ جنازہ شیخ محمد غوث نے پڑھائی۔ جنازے میں لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا اور حزن و ملال کی وجہ سے شرکائے جنازہ کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ ہر حلقے میں عزت و احترام کے مالک تھے اور لوگ ان سے نہایت خوش تھے۔ وفات پر سب نے انتہائی افسوس کا اظہار کیا۔ مدراس کے قریب میلاپور میں مدفون ہوئے۔ باسٹھ سال عمر پائی[۱۷۹]

۲۶۔ مولانا عبداللہ الٰہ آبادی

مولانا عبداللہ صدیقی محمدی الٰہ آبادی، تیرھویں صدی ہجری کے شیخ و عالم اور محدث و

---

[۱۷۹] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۰۱، ۲۰۲ — تاریخ نوائط ص

قصبہ تھے۔ بمقام مئو پیدا ہوئے۔ جو الہ آباد (یوپی) کے نواح میں واقع ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی حصولِ علم میں مشغول ہو گئے اور الہ آباد اور گرد و نواح کے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد عازم دہلی ہوئے اور مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے اخذِ علم کیا۔ خط بہت اچھا تھا۔ قیام دہلی کے زمانے میں حواشی و تعلیقات کے ساتھ متعدد منداولہ و غیر منداولہ کتابوں کی کتابت کی۔ کتابت و تحریر میں بہت تیز تھے۔ ایک روایت کے مطابق پوری صحاح ستہ کی اپنے ہاتھ سے کتابت کی اور پھر یہ ضخیم کتابیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اولاد و احفاد سے پڑھیں۔ یہ بھی منقول ہے کہ ان کتابت شدہ کتابوں کی تکمیل شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے کی۔

مولانا عبداللہ الہ آبادی کا تذکرہ صاحب عون المعبود مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اپنی تصنیف "تذکرۃ النبلا" میں کیا ہے۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے اور اس کا ایک نسخہ مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی کے کتب خانے (رائے بریلی) میں محفوظ ہے۔ سید صاحب موصوف نے نزھۃ الخواطر میں ان کا مختصر ترجمہ "تذکرۃ النبلا" کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے۔ یہ سطور اسی سے مستفاد ہیں۔

مولانا عبداللہ محمدی الہ آبادی نسباً صدیقی تھے اور اپنے عہد کے جلیل القدر عالم اور محدث تھے۔ قلیل الدرس لیکن کثیر التصانیف تھے۔ توحید کے موضوع پر انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے بعض میں شہد کی سی شیرینی ہے اور بعض میں حنظل کی سی تلخی۔ اپنے نقطۂ نظر کے مخالفوں پر سخت تنقید کرتے اور ان پر اظہارِ خیال میں بہت آگے نکل جاتے۔ ظواہر نصوص کو مدارِ عمل ٹھہراتے اور اس کا یہ مطلب لیتے کہ دیگر فقہی مذاہب و مسالک کے لوگ مثلاً حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ وغیرہ نعوذ باللہ کفر کی سرحدوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ طرقِ تصوف، قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ اور مجددیہ وغیرہ کے بارے میں بھی ان کی یہی رائے تھی۔ اپنی کتاب "اعتصام السنہ" میں لکھتے ہیں کہ ان کی طرف نسبت بہتر فرقوں میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:-

۱۔ السیم الزغرب فی لغات الحدیث المنتخب :۔ یہ حروف معجم کی ترتیب سے مرتب کی ہے۔

۲۔ العروۃ الوثقیٰ لمنبع سنۃ سیّد الوریٰ :۔ یہ کتاب حدیث سے متعلق ہے اور اس میں ابوابِ فقہی کی ترتیب سے احادیث درج کی ہیں۔

۳۔ عُمدۃ الصلوٰۃ وفائز النجاۃ :۔ اِس میں حدیث کی روشنی میں نماز کے مسائل بیان کیے ہیں۔

۴۔ اعتصام السنۃ وقامع البدعۃ :۔ یہ دو ابواب پر مشتمل ہے۔ ایک باب میں اتباعِ سنت اور ردِ بدعت سے متعلق قرآن مجید کے احکام بیان کیے ہیں اور دوسرے میں اس موضوع کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ درج کی ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۷۱ھ میں تصنیف کی۔

۵۔ النبراس المُنیر لصلوٰۃ الدیاجیر۔

۶۔ معین الابرار علی الصلوٰۃ فی اللیل والنہار :۔ اس میں یہ وضاحت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کون کون سی سورتیں تلاوت فرماتے تھے۔

۷۔ الریاض الانضر فی الفقہ الاکبر :۔ اس کتاب میں نماز کے مسائل صحیح احادیث کی روشنی میں بیان کیے ہیں اور کتاب ابوابِ فقہ کی ترتیب سے مرتب کی ہے۔

۸۔ صمصام الحدید المسلول :۔ بدعات، رسوم و رواج، رائے اور تقلید کے رد میں ہے۔

۹۔ الاعجاز المتین فی معجزات سید المرسلین :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے سلسلے میں۔

۱۰۔ ترجمہ شرح الصدور۔

۱۱۔ البدور السافرہ۔

۱۲۔ سیف الحدید فی قطع المذاہب والتقلید۔

ان کتابوں کے علاوہ متعدد چھوٹے بڑے رسالے بھی لکھے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ اللباب فی صلوٰۃ الاحباب :۔ یہ مختصر سا رسالہ اُردو میں ہے اور دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ۱۲۶۹ھ میں تصنیف ہوا۔

۲۔ العروۃ المتین فی اتباع سنۃ سید المرسلین : یہ رسالہ اُردو میں ہے۔ ۱۲۷۳ھ میں لکھا۔

۳۔ السیف المسلول فی ذم التقلید المخذول : یہ بھی اُردو میں ہے اس کا سن تالیف بھی ۱۲۷۳ھ ہے۔

مولانا شمس الحق ڈیانوی فرماتے ہیں کہ مولانا عبداللہ صدیقی الہ آبادی اپنے عہد کے بہت بڑے عالم، محدث، فقیہ اور مصنف تھے۔ سنت کی نشر و اشاعت ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا۔ فقہی نوعیت کے بعض اختلافی مسائل میں متشدد تھے اور اس میں ان کی تائید نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ان کا مرتبہ علمی بہت اُونچا تھا اور علوم کی خدمت میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[1]

۲۷۔ سید عبداللہ غزنوی

سرزمین پاک و ہند، علم و عمل اور فضل و کمال کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہی ہے۔ اس میں بے شمار علما و صلحا اور صوفیا و اتقیا نے یا تو جنم لیا یا کسی اور ملک سے یہاں آکر آباد ہوئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی کا شمار ان حضرات میں ہوتا ہے جو ایک دوسرے ملک (افغانستان) سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔

نام و نسب

ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن محمد شریف عمرزئی غزنوی۔ اپنے

---

[1] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۰۴ تا ۳۰۶ بحوالہ تذکرۃ النبلا۔

دور کے شیخ و امام اور محدث و فقیہ تھے۔ زہد و عبادت، ریاضت و تصوف اور جہاد فی سبیل اللہ میں یگانۂ عصر تھے۔ ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۱ء) کو قلعہ بہادر خیل میں پیدا ہوئے جو ضلع غزنی میں واقع ہے۔ مولانا غلام رسول (قلعہ والے) لکھتے ہیں کہ ان کے گاؤں کا نام "گیرو" ہے جو ہلال پہاڑ کے متصل ضلع غزنی میں ہے اور نسبی تعلق عمر زئی قبیلے سے ہے۔[1]

والدین نے ان کا نام محمد اعظم رکھا تھا۔ لیکن بعد میں انھوں نے اپنا نام عبداللہ رکھ لیا۔ فرماتے ہیں:

محمد کہ اعظم از کائنات، افضل از مخلوقات است، ہماں رسول اللہ ہست تریرا عبداللہ خوب است[2]

یعنی محمد کا اسم گرامی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہی کو زیب دیتا ہے۔ جو تمام کائنات سے معظم اور تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔ ہمارا نام تو عبداللہ ہی بہتر ہے۔

ان کے فرزند گرامی مولانا عبدالجبار غزنوی فرماتے ہیں کہ عبداللہ نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں اللہ کی الوہیت اور بندے کی عبودیت کا اظہار و اقرار ہے۔

خاندان

مولانا عبداللہ کے آبا و اجداد اور خاندان کے دیگر بزرگوں کے بارے میں تفصیلات کا علم تو نہیں ہو سکا، تاہم ان کے صاحبزادے مولانا عبدالجبار غزنوی کی ایک عبارت سے جو انھوں نے اپنے والدِ مکرم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاندان نیکی اور تقوے کے لحاظ سے غزنی میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ یہ سادات کا خاندان تھا، جس کو دین داری اور احکامِ اسلام کی اتباع میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

یہ خاندان غزنی کے معروف سادات میں سے تھا، لیکن مولانا عبداللہ صاحب کی یہ حالت تھی کہ اگر ان سے کوئی شخص یہ سوال کرتا کہ آپ کا تعلق سادات سے ہے؟ تو فرماتے لوگ ہمیں

---

[1] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا غلام رسول ص ۲۸۔

[2] ایضاً

سید کہتے ہیں، مگر عجم میں انساب کے سلسلے کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان سے سادات کی صحیح طور پر نشان دہی کرنا ممکن نہیں رہا۔[۴۳]

مولانا عبداللہ غزنوی پر انکسار اور تواضع کا غلبہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنے اسلاف سے متعلق کسی خاص بات کی وضاحت نہیں کی، بلکہ اظہارِ عجز کرتے ہوئے ایک مکتوب میں فرمایا:

صاحبا! فقیر و فقیر زادہ ام و غریب زادہ، عاجزی و گم نامی و خاک ساری کارِ ماست و گوشہ نشینی و زاویہ گزینی شعارِ ما است۔

میں فقیر آدمی ہوں اور فقیر زادہ و غریب زادہ ہوں، عاجزی، گم نامی اور خاک ساری ہمارا کام، گوشہ نشینی ہماری عادت اور زاویہ گزینی ہمارا شعار ہے۔

اس انکساری میں یہ حقیقت بہرحال نمایاں ہے کہ اس خاندان کے اسلاف راہِ طریقت پر گام زن اور جادۂ درویشی پر قدم فرسا تھے۔ اگرچہ ہماری تاریخ نے ان کے نقوشِ علم اور آثارِ تصوف کو محفوظ نہیں رکھا، تاہم یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اپنے عہد کے ممتاز اہلِ علم اور نامور اصحابِ سلوک تھے۔

قریۂ صاحب زادگان

مولانا عبداللہ غزنوی کے بزرگوں کے آثار اب بھی ان کے قدیم وطن (افغانستان) میں موجود ہیں اور وہاں کے لوگ عزت و احترام سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ مولانا سید داؤد غزنوی کے بھتیجے سید عثمان غزنوی صاحب نے ایک مرتبہ بتایا کہ ۱۹۷۱ء میں ایک بزرگ لاہور میں ان کے مکان پر تشریف لائے۔ ان کی وضع قطع، لباس اور گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ وہ بہت نیک اور پرہیزگار آدمی ہیں۔ وہ غزنی کے ایک گاؤں سے تشریف لائے تھے! انھوں نے بیان کیا کہ مولانا عبداللہ غزنوی کے آبا و اجداد کی قبریں اب تک محفوظ ہیں، لوگوں نے اُن کے ارد گرد دیوار تعمیر کر دی ہے، کہ وہ منہدم نہ ہوں۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ وہاں

---

[۴۳] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۔

جاتے اور اصحاب قبور کے لیے دعا کرتے ہیں۔ پرانے لوگ یہ بھی بتاتے ہیں کہ کون سی قبر مولانا عبداللہ غزنوی کے کس بزرگ کی ہے اور وہ تقویٰ و تدین کے کس درجے پر فائز تھے۔ مولانا عبداللہ غزنوی کی پرہیزگاری اور دین داری سے لوگ واقف ہیں، پھر جن مصائب و آلام سے انھیں دوچار کیا گیا، اس کی تفصیلات سے بھی وہ آگاہ ہیں، کس بادشاہ نے انھیں کیا تکلیفیں پہنچائیں اور کیوں پہنچائیں، یہ تمام واقعات انھیں یاد ہیں اور اپنی مجلسوں میں ان واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ اب وہ گاؤں جس میں وہ پاک باز حضرات قیام پذیر تھے، اُجڑ چکا ہے، لیکن اس کا نام ختم نہیں ہوا، اسے اب "قریہ صاحب زادگان" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے قریب جو گاؤں آباد ہے اور جہاں بس بھی جاتی ہے، اس کا نام "قریہ عبدالشکور" ہے۔ "قریہ صاحب زادگان" کو دیکھنے اور وہاں کی قبروں پر دعا کرنے والے لوگ بس کے ذریعے قریہ عبدالشکور جاتے ہیں، وہاں سے پیدل قریہ صاحب زادگان پہنچتے ہیں۔

عثمان غزنوی نے بتایا کہ وہ شخص تین دن ان کے پاس رہا اور اس اثنا میں مولانا عبداللہ غزنوی اور ان کے اسلاف سے متعلق جو باتیں وہاں مشہور ہیں، وہی سناتا رہا۔ وہ غریب آدمی معلوم ہوتا تھا اور بہت مشکل سے پوچھتے پچھاتے یہاں پہنچا تھا۔ جاتے وقت وہ ان سے مل کر نہیں گیا اور اس نے ان سے نہ روپیہ پیسہ لیا، نہ کوئی چیز۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مولانا عبداللہ غزنوی کے گاؤں کا نام "گیرو" تھا۔ معلوم ہوتا ہے "قریہ صاحب زادگان" اس کا نام ان کے وہاں آنے کے بعد پڑا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے اسلاف نیکی میں مرجع خلائق تھے اور افغانستان کے لوگ ان سے بہت متاثر تھے۔

حصولِ علم

عبداللہ غزنوی عالمِ طفولیت ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ علوم مروجہ کی تحصیل غزنی کے علما سے کی۔ ان کی سرعتِ ادراک اور حدتِ فہم سے لوگ متعجب ہوتے اور کتب درسیہ کے مشکل سے مشکل مقام نہایت آسانی سے ان کے ذہن کی گرفت میں آجاتے۔

ابتدائے عمر ہی سے کتاب اللہ اور حدیثِ رسول اللہ سے شغف و تعلق تھا۔ علوم متداولہ کے مختلف گوشوں پر اس قدر حاوی تھے کہ غزنی کا کوئی عالم ان کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ کسی مسئلے میں اگر انھیں کوئی اُلجھن پیش آتی تو کوئی عالم اطمینان بخش جواب نہ دے پاتا۔ اس زمانے میں قندھار میں ملا حبیب اللہ قندھاری کا سلسلۂ درس جاری تھا جو اپنے عہد کے بہت بڑے عالم و فقیہ اور مصنف تھے۔ مولانا موصوف غزنی سے چلے اور راستے کی بے پناہ مشکلات کو عبور کرتے ہوئے قندھار پہنچے۔ وہاں ملا ممدوح کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔ اس کے بعد وطن واپس آگئے۔ کچھ عرصہ وطن رہے اور پھر عازمِ قندھار ہوئے۔ اس طرح مُلا حبیب اللہ سے انھوں نے خوب استفادہ کیا۔ مُلا حبیب اللہ اپنے اس شاگرد اور مُرید کے بہت مداح تھے۔ ان کی قوتِ فہم کی سب علما کے سامنے تعریف کرتے اور صاف لفظوں میں فرماتے۔

مسائلِ دینیہ را چناں کہ ایں شخص می فہمد من خود نمی فہم۔

دینی مسائل کو جس طرح یہ شخص سمجھتا ہے، میں نہیں سمجھتا ہوں۔

اس کے بعد مُلا صاحب نے ان کو قندھار تشریف لانے سے روک دیا اور فرمایا اگر آپ کو کبھی کوئی مشکل پیش آئی تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے گا اور تمام عقدے حل ہو جائیں گے۔ چنانچہ مولانا فرمایا کرتے:

رَبّ جلّ شانہٗ موافق گفتۂ شیخ با من معاملہ کردہ است[1]۔

میرے پروردگار نے میرے ساتھ وہی معاملہ کیا جو شیخ نے فرمایا۔

"ملفوظاتِ ملا حبیب اللہ قندھاری" کے نام سے ملا صاحب کے ایک مرید اور شاگرد نے ان کے ملفوظات جمع کیے ہیں، جو غیر مطبوعہ ہیں، ان میں ملا ممدوح نے مولانا عبداللہ غزنوی کا ذکر کیا ہے اور ان کے زہد و اتقا اور ورع و عبادت کی تعریف کی ہے۔

توحید سے متعلق ارشادات

مولانا عبداللہ غزنوی مسئلۂ توحید سے متعلق نہایت سخت تھے۔ یہ ملا حبیب اللہ

---

[1] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی ص ۹۔

قندھاری کی صحبت و تلمذ کا اثر تھا۔ توحید کے بارے میں ان کے ارشادات لائق تذکرہ ہیں۔ فرماتے ہیں، اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رجوع کرنا شرک فی العبادت ہے، نیز کسی سے استعانت کرنا بھی شرک ہے۔ تمام امور اور سب معاملات میں فقط اللہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

فرماتے ہیں، بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کی قبروں پر اس نیت سے حاضری دینا کہ ان کی برکت اور توجہ سے کوئی مقصد حل ہو جائے، سراسر توحید کے خلاف اور کلمۂ شہادت کے منافی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میں صلحائے اُمت کی قبروں پر کچھ مانگنے اور طلب کرنے کے لیے نہیں، بلکہ حصولِ برکت کے لیے جاتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ وہاں میری دُعا کو جلد درجۂ قبولیت حاصل ہو گا، تو یہ بھی شریعت کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے لیے مسجد مقرر کی ہے، قبروں کو مقامِ عبادت قرار نہیں دیا، جیسا کہ اغاثۃ اللہفان میں امام ابن قیمؒ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

فرماتے ہیں، زمانۂ طفولیت میں مجھے جنگل میں جا کر تنہائی میں اللہ کی عبادت کرنے اور دُعا مانگنے کا بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں بعض اہل اللہ سے ملاقوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ وہ میرے شوقِ عبادت کو دیکھ کر فرماتے کہ تمھاری پیشانی میں نور کی شعاعیں دکھائی دیتی ہیں، اور تاکید کرتے کہ علمائے سو کی صحبت اختیار کر کے اپنے قلب و روح کی کیفیتوں کو نقصان نہ پہنچانا۔

فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں فضل و کرم سے تمام اوصافِ ذمیمہ کو میرے دل اور جسم سے خارج کر دیا ہے۔ مجھے مرتبۂ احسان سے نوازا، اور ماسوی اللہ کو میرے دل سے باہر نکال پھینکا ہے۔ مجھ پر اس نے یہ حقیقت منکشف فرما دی کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی مربی نہیں، ہر شے اللہ کے قبضے اور اختیار میں ہے۔

فیضانِ عام

سلوک و طریقت کے دورِ آغاز میں لوگوں سے میل جول سے احتراز کرتے، یہاں تک کہ عزیزوں اور رشتے داروں سے بھی دُور رہتے۔ ان دنوں خواجہ ہلال پہاڑ میں مقیم ہو گئے

تھے ۔جو آبادی سے دُور تھا۔ لیکن لوگوں کو پتا چلا تو وہاں پہنچنے لگے ۔ اس زمانے میں ان پر کیفیتِ جذب کا غلبہ تھا اور وہاں کے اصحابِ علم اور اربابِ فضل بھی اس پر متحیّر تھے۔ اب ان کی شہرت حدودِ غزنی سے نکل کر دُور دور تک پھیل گئی تھی اور لوگ استفادے اور زیارت کے لیے حاضرِ خدمت ہونے لگے تھے، جن میں علما و مشائخ بھی شامل تھے۔ جب سُبْحَانَ اللّٰہ اور لا الٰہ الا اللہ کا وِرد کرتے تو فضا گُونج اُٹھتی اور محسوس ہوتا کہ شجر و حجر بھی ان کے ساتھ تسبیح و تہلیل میں مشغول اور حالتِ وجد و اضطراب میں ہیں۔ بعض لوگ ان کا لباس دیکھ کر ہی وجد میں آ گئے، چنانچہ ایک طالب علم نے ان کی پوستین اُٹھائی تو وجد طاری ہو گیا اور وہ "مرید پوستین" کے نام سے موسوم ہوا۔[۵۵]

دنیاداروں سے کبھی تعلق نہیں رکھا، ان سے ہمیشہ دامن کشاں رہے۔ اولاد اور متعلقین کو بھی ان کی صحبت و مجلس سے دُور رہنے کی تاکید فرماتے۔ اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے عمر بھر اُمرا۔ اور اصحابِ مال سے محفوظ رکھا۔

جذبۂ احیائے سُنّت

احیائے سنّت اور اتباعِ شریعت کا جذبہ نہایت شدید تھا۔ خلافِ سنت کوئی عمل اور حرکت برداشت نہ کرتے لیکن اس وقت افغانستان کی دینی حالت بالکل دگرگوں تھی۔ عوام اور خاص بدعات کے خوگر اور مُشرکانہ رسوم میں مبتلا تھے۔ علما اور مشائخ کی حالت بھی یکسر بدلی ہوئی تھی۔ وہ بھی بدعات کو دین اور غلط رسوم کو اسلام قرار دینے لگے تھے۔ مولانا کو اس صورتِ حال سے سخت ذہنی اور روحانی تکلیف ہوتی۔ بظاہر حالات اگرچہ ناموافق تھے لیکن وہ اللہ کا نام لے کر میدانِ عمل میں اُترے، اشاعتِ سنّت اور تبلیغِ قرآن و حدیث پر کمرِ ہمت باندھی اور بدعات کی تردید اور مشرکانہ رسوم و عوائد کی مخالفت شروع کی۔ اس پر قندھار کے قاضی اور علما نے تو بہت خوشی کا اظہار کیا، کیونکہ وہ ملا حبیب اللہ قندھاری سے متاثر تھے اور مسلکِ محدثین کے حامی اور پابند تھے، لیکن ملا کٹہ اور دیگر دنیا پرست علما اس سے نہایت برافروختہ ہوئے اور علانیہ دشمنی اور مخالفت پر اُتر آئے۔

۵۵۔ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۴

اس زمانے میں قندھار کے قاضی کا نام غلام تھا۔ قاضی غلام مولانا عبداللہ غزنوی کے حامی اور ان کے اندازِ دعوت و تبلیغ کے مؤید تھے۔ ان کو ملا کُڈہ کی مخالفت سے بہت دکھ ہوا، اس کا اظہار انھوں نے ایک خط میں کیا جو ملا سعد الدین مقری کو تحریر کیا۔ اس خط میں ملا کڈہ کے نقطۂ نظر کو غلط ٹھہرایا اور مولانا کی تعریف کی۔

یہ خط فارسی میں ہے اور مولانا عبداللہ غزنوی کی اس سوانح عمری میں درج ہے، جو مولانا عبدالجبار غزنوی نے لکھی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

حقائق و معارف آگاہ الموفق من عند اللہ، قائد الخلق الی صراط اللہ محی السنہ وقامع البدعہ میاں محمد اعظم[۱۶] صاحب زادہ کے بارے میں یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ رجل مملوّ بالسنۃ من الفرق الی القدم (یہ شخص سر سے پاؤں تک سنت میں ڈوبا ہوا ہے) انھوں نے سیر و سلوک باطن میں نسبت اویسی حاصل کرنے کے بعد محض اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے طریقۂ نقشبندیہ میں قدم رکھا اور اس کے سیر و سلوک کی تکمیل کی اور اس میں مجاز ہوئے — اس کے بعد سید آدم بنوری قدس اللہ سرہ کے طریقے کا بھی اکتساب کیا اور سلسلۂ بنوریہ میں مجاز ہوئے۔ مختصر یہ کہ میاں محمد اعظم کا ظاہر، تقویٰ اور شریعت مصطفوی کے زیور سے آراستہ ہے اور ان کا باطن، اہل صفا کے احوال ومقامات سے مزین ہے۔ اس صاحب زادے میں نقص صرف یہ ہے کہ اپنے آپ کو ملا کڈہ کے محبین و مخلصین میں شمار نہیں کرتے۔ ملا کڈ بزرگوار صاحب زادہ صاحب کو کبھی وہابی کہتا ہے اور کبھی بدعتی کہہ کر پکارتا ہے۔ بلکہ بعض قابل اعتماد لوگوں سے سنا ہے کہ ملا کڈہ نے غلبائی کے اردگرد کے علاقوں میں ان کے خلاف نفرت اور عداوت پھیلانے کے لیے خطوط بھی ارسال کیے ہیں۔[۱۷]

علمائے سوء اور امیرِ کابل کی ایذا رسانی

جب مولانا نے علی الاعلان کتاب و سنت کی دعوت دینا شروع کی، توحیدِ خالص کا نعرہ لگایا اور بدعات کی مخالفت اور مشرکانہ رسوم کی تردید میں آواز بلند کی تو غزنی کی فضا میں ایک

---

[۱۶] جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا، مولانا عبداللہ غزنوی کا اصل نام محمد اعظم تھا۔ عبداللہ انھوں نے بعد میں رکھا تھا۔

[۱۷] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی، ص ۹ ، ۱۰۔

تہلکہ مچ گیا، اس لیے کہ وہاں کے لوگوں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی اور ان کے کان اس سے آشنا نہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اہلِ علم اور اربابِ حکومت، اور خواص و عوام کے وہ طبقے جو محض مولانا کی نیکی اور کرامتیں دیکھ کر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے تھے، ان کی مخالفت کرنے لگے اور اذیت رسانی پر اُتر آئے۔ مولانا فرماتے تھے کہ مسائل میں حدیثِ رسولؐ کو مدارِ عمل ٹھہرانا ضروری ہے۔ اگر کسی فقہی مذہب کا کوئی پہلو حدیث کے خلاف ہو تو اس کو حدیث کے مقابلے میں ترک کر دینا چاہیے۔ لیکن وہاں کے علما اس بات کو نہیں مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ خلافِ مذہبِ فقہی عمل بالحدیث کی ضرورت نہیں۔ اس مسئلے پر وہ مولانا سے مباحثے اور مناظرے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن ان پر مولانا کی شخصیت اور للّٰہیت کا اس درجے اثر پڑا کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے اور یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ مولانا اپنے موقف میں صحیح ہیں ـــــ یہ تو غزنی اور اُس کے مضافات کے علما کا حال تھا۔ دوسرے علاقوں کے اہلِ علم کو حالات کا علم ہوا تو اُنھوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی اور اس مسئلے پر مولانا کے ساتھ گفتگو اور بحث کا ارادہ ترک کر دیا۔

اس کے بعد مخالفین نے مولانا کے ساتھ باقاعدہ جنگ و جدال کا منصوبہ بنایا اور اپنے حامیوں کو ان پر حملہ آور ہونے کے لیے اُکسایا۔ یہ نہایت خطرناک منصوبہ تھا۔ اس کا علم مولانا کے عقیدت مندوں اور اصحابِ ارادت کو ہوا تو وہ بھی مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کی تعداد بھی کم نہ تھی اور وہ ایسے نازک موقعے پر اپنے مرشد اور اُستاد کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفوں کی یہ چال بھی کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی۔

اب علمائے سو نے ایک اور پینترا بدلا، اکٹھے ہو کر افغانستان کے دارالسلطنت کابل پہنچے اور بعض امرا و وزرا کو اپنا ہم نوا بنایا اور ان کی وساطت سے حاکمِ وقت کے بابِ عالی پر دستک دی۔ اس زمانے میں افغانستان کا حکمران امیر دوست محمد خاں تھا اور اس کے بعض ارکانِ حکومت مولانا کے معتقد بھی تھے۔ امیر مذکور سے مخالفین

نے سیاسی رنگ میں بات کی، جسے وہ آسانی سے سمجھ سکتا اور متاثر ہو سکتا تھا۔ اس سے کہا کہ یہ شخص آپ کی سلطنت کو ختم کرنے اور بادشاہت کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ اگر اس کو ایک سال کی بھی مزید مہلت دی گئی تو تمام نظامِ حکومت ناکارہ ہو جائے گا۔ اس لیے کہ حکومت کے متعدد امرا و وزرا اس کے معتقد و مرید ہیں جو ظاہر ہے اس کے زیرِ اثر ہیں۔ وہ نظامِ حکومت کو مختل کرنے میں اس کا ساتھ دیں گے ـــــ یہ ایسی بات تھی جو آسانی سے امیر دوست محمد خاں کی برہمی کا سبب بن سکتی تھی۔

اس کا علم جب مولانا کے بعض معتقدین کو ہوا تو انھوں نے مولانا کو مشورہ دیا کہ تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ امیر دوست محمد خاں کے طلب کرنے سے پہلے ہی آپ کابل تشریف لے جائیں اور اس کو حقیقتِ حال سے آگاہ کریں ـــ یہ بات اگرچہ مولانا کی طبعِ بے نیاز کے خلاف تھی، تاہم وہ اپنے مخلص احباب کے مشورے کے مطابق عازمِ کابل ہوئے اور امیر دوست محمد خاں سے ملاقات کی ـــ مخالف نقطۂ نظر کے علما بھی امیر کے دربار میں آ گئے، جن میں خان ملا دُرانی، ملا نصر اللہ لوہانی، ملا مُشکی اندڑی اور بہت سے بااثر علما شامل تھے۔ ان علما نے باہم مشورے سے طے کیا کہ ہمیں مولانا سے فقہی اور دینی مسائل میں مناظرہ اور مباحثہ نہیں کرنا چاہیے، اس میں ہم کامیاب نہیں ہو سکیں گے اور امیر کے سامنے بھری محفل میں شرمندگی اُٹھانا پڑے گی۔ بہتر یہ ہے کہ ان کے خلاف جھوٹی گواہی دی جائے اور گواہوں کے ذریعے یہ بات ثابت کر دی جائے کہ یہ شخص خلافِ شرع حرکات کا مرتکب ہے۔ چنانچہ جھوٹے گواہ پیش کیے گئے جنھوں نے امیر کابل سے ایسی باتیں کہیں جو عام طور پر دوسروں کو بھڑکانے کے لیے بعض لوگ کرتے ہیں۔ اس کو بتایا کہ یہ شخص رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی کرتا ہے اور حضورؐ کی شفاعت کا منکر ہے۔ خود نبوت کا مدعی ہے اور ایسی باتیں زبان سے نکالتا ہے، جن کی رُو سے یہ کافر و مرتد قرار پاتا ہے۔ لہٰذا اس کو یا تو قتل کر دیا جائے یا ملک سے نکال دیا جائے۔ اس موقع پر اُنھوں نے سیاسی نوعیت کا کوئی الزام ان پر عائد نہیں کیا۔ یعنی جو بات تنہائی میں امیر سے کہی تھی، اب مولانا کی موجودگی میں نہیں کہی ـــــــ امیر نے

ساری باتیں سُنیں تو سمجھ گیا کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے اور افترا باندھتے ہیں، لیکن اس میں علمائے سو کی مخالفت کی جرأت نہ تھی۔ اُسے خطرہ تھا کہ مولانا کی حمایت اور علمائے سو کی مخالفت سے ملک ایک نئے ہنگامے اور فساد کی لپیٹ میں آجائے گا۔ اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ مولانا کو ملک بدر کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے ان کو اپنے حدودِ سلطنت سے باہر نکال دیا۔ اس سے ان کے عقیدت مندوں اور احباب کو تو بہت تکلیف ہوئی، لیکن خود انھوں نے کوئی ذہنی یا قلبی پریشانی محسوس نہیں کی۔

جلاوطنی اور حصولِ علمِ حدیث

مولانا نے راہِ خدا میں اہل وعیال اور دوست احباب کو چھوڑ کر کابل سے سوات کی راہ لی۔ وہاں سے کوٹھہ پہنچے اور پھر ہزارہ تشریف لے گئے۔ اثنائے سفر میں تبلیغِ دین کا سلسلہ جاری رہا اور بے شمار لوگ اُن سے مستفیض ہوئے۔ اس زمانے میں دہلی علم وفضل کا مرکز تھا اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کا وہاں وسیع حلقۂ درس قائم تھا۔ مولانا نے ہزارہ سے دہلی کا قصد کیا اور لاہور اور امرتسر سے گزرتے اور قیام کرتے ہوئے دہلی جاکر حضرت میاں صاحب کے درس میں شریک ہوئے۔ ان سے حدیث پڑھی اور سند واجازہ سے بہرہ یاب ہوئے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب دہلی میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ گرم ہوا، اور شہر میں بموں کے دھماکے شروع ہوئے۔ میاں صاحب کی مسجد اور مدرسے میں بھی بم گر رہے تھے، لیکن مولانا عبداللہ اس سے قطعاً مضطرب نہ ہوتے تھے۔ مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے بھی ان کے شریکِ درس تھے۔ ان بزرگوں نے حضرت میاں صاحب سے حدیث کی سند لی اور اپنی نیکی اور خدمتِ دین کی وجہ سے چار دانگ عالم میں شہرت پائی۔

مراجعتِ وطن اور مزید اذیتیں

حضرت میاں صاحب سے حصولِ سندِ حدیث کے بعد مولانا غزنوی دہلی سے پنجاب آئے۔ کچھ عرصہ پنجاب کے مختلف بلاد وقصبات میں مقیم رہے اور وعظ ونصیحت اور کتاب وسنت کی تبلیغ کا سلسلہ اس سفر میں بھی حسبِ معمول جاری رکھا۔ اسی اثنا میں وہ امرتسر میں بھی مقیم رہے۔ پھر

ڈیرہ اسماعیل خاں سے ہوتے ہوئے واپس غزنی تشریف لے گئے۔ انھیں خیال تھا کہ اب جلا وطنی پر خاصی مدت گزر گئی ہے اور اُن کے بارے میں امیر دوست محمد خاں کا نقطۂ نگاہ بدل چکا ہوگا۔ لیکن وطن آئے ابھی زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ ناگہاں امیر دوست محمد خاں کے فرستادہ سرکاری آدمی آئے اور وطن سے اخراج کا حکم دیا۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور وہ ملک نادہ جا کر متقیم ہوگئے۔ امیر مذکور نے وہاں سے بھی نکل جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے اہل و عیال کو ساتھ لے کر یاغستان کے پہاڑوں میں جا بسیرا کیا۔ جب نادہ کے علمائے سو کو ان کے یاغستان کے پہاڑوں میں قیام کا پتا چلا تو کئی سو آدمیوں کو ساتھ لے کر ان پر حملہ کر دیا۔ گھر کو آگ لگا دی اور تمام شاگردوں اور عقیدت مندوں کو زخمی کر دیا۔ اس حملے میں مولانا اور ان کے اہل و عیال کو کوئی گزند نہیں پہنچا، وہ دشمن کی گرفت سے بچ کر محفوظ مقام پر چلے گئے۔ مولانا عبدالجبار غزنوی تحریر فرماتے ہیں:

سبحان اللہ! دریں امتحانات و جلاوطنی و دشمنی تمام عالم چناں مرفہ الحال وخوش عیش می ماندکہ ہیچ امیری با طیب عیش از و ندیدم، و گویا از غیب نعم گوناگوں برسرش می بارید، کدام نعمتے بود کہ دراں کوہ پایہ پیشش نمی رسید۔

سبحان اللہ! ان آزمائشوں کے دور میں اور جلا وطنی اور تمام جہان کی دشمنی کے زمانے میں وہ اس قدر خوشحال تھے اور اس درجے اچھی زندگی بسر کرتے تھے کہ کسی امیر کو میں نے ان سے بڑھ کر خوش حال اور بہتر زندگی بسر کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ گویا غیب سے قسم قسم کی نعمتیں ان کے سر پر برستی تھیں، وہ کون سی نعمت تھی جو اُن پہاڑوں میں آپ کے پاس نہیں پہنچی تھی۔

پھر جلا وطنی

اسی زمانے میں امیر دوست محمد خاں نے شہر ہرات میں وفات پائی اور اس کا بیٹا شیر علی خاں افغانستان کا حکمران ہوا۔ مولانا یاغستان کے پہاڑوں سے وطن واپس چلے گئے۔ علمائے سو نے امیر شیر علی خاں کے بھی کان بھرنے شروع کر دیے اور مولانا کے خلاف اُسے خوب بھڑکایا۔ اب اُنھوں نے امیر شیر علی خاں کو ایک خط لکھا کہ "میں مظلوم ہوں،

---

[1] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۱۵، ۱۶۔

حاسدوں نے مجھ پر جھوٹی تہمتیں لگائی تھیں جن کی وجہ سے تمھارے باپ نے مجھے ملک سے نکال دیا تھا۔ تم اس سلسلے میں اپنے باپ کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔" اس نے جواب میں لکھا کہ "میں تمام رعایا کی مخالفت کر کے ایک شخص کی حمایت نہیں کر سکتا تم فوراً ہمارے ملک سے باہر نکل جاؤ۔" اخراج کا یہ حکم نامہ ملا تو بہت حیران ہوئے کہ کدھر کا قصد کریں۔ بالآخر جنگل کی راہ لی اور پہاڑ کے ایک غار میں جا کر چھپ گئے۔ کچھ عرصہ وہیں رہے۔ اس اثنا میں اللہ کی طرف سے القا ہوا:

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَٰلَمِينَ ۝

(الانعام: ۴۵) یعنی جن لوگوں نے ظلم ڈھایا تھا اُن کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور حمد و ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اسی دوران میں افغانستان میں انقلاب بپا ہو گیا اور امیر شیر علی خاں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ وہ ذلیل و خوار ہو کر کابل سے بھاگا اور ہرات میں جا کر پناہ لی۔

مصائب کی انتہا اور مولانا کی استقامت

اس کے بعد مسندِ حکومت پر محمد افضل خاں متمکن ہوا۔ علمائے سو نے مولانا کے خلاف پھر اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور امیر محمد افضل خاں سے ان کی شکایات کیں۔ امیر مذکور نے ایک خط کے ذریعے مقر کے حاکم کو ان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ سردار محمد عمر خاں نے جو امیر دوست محمد خاں کا بیٹا تھا، رات کے وقت مسلح سواروں کا دستہ روانہ کیا، جس نے نصف رات کے قریب مولانا کے مکان کا محاصرہ کر کے ان کو گرفتار کر لیا۔ وہ لوگ ان کو گرفتار کر کے اور گھر کا تمام سامان اُٹھا کر سردار محمد عمر خاں کے پاس لے گئے۔ مولانا کے بیٹوں میں سے تین بیٹے مولانا محمد، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالجبار بھی ان کے ساتھ تھے۔ سب کو یقین تھا کہ اب سخت سزا دی جائے گی، لیکن سردار محمد عمر خاں ان کے چہرے کی نورانیت اور جلال سے اس قدر مرعوب و متاثر ہوا کہ سارا غصہ جاتا رہا اور نہایت ادب اور احترام سے بولا کہ آپ نے جو راہ اختیار کر رکھی ہے، اُسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ آپ بھی وقت کے علما کے ساتھ مل جائیں اور وہی کچھ کریں جو وہ کرتے ہیں۔ مولانا نے انکار کیا۔ سردار محمد عمر خاں کا جرنیل پاس ہی کھڑا تھا،

غضب ناک ہو کر بولا:

بدست من بدہید تا بتوپ پرانم۔

اسے میرے حوالے کرو کہ میں اسے توپ سے اُڑا دوں۔

مولانا نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ مجھے اللہ تعالےٰ کا حکم ہے کہ کتاب و سنت کے احکام کی اشاعت کروں۔ مجھے بارہا القا ہوا ہے کہ

یا عبدی ھٰذا کتابی وھٰؤلاء عبادی، فاقرأ کتابی علی عبادی۔

اے میرے بندے! یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے بندے ہیں۔ تو میری کتاب میرے بندوں کو پڑھ کر سنا۔

پھر فرمایا یہ بھی مجھے حکم دیا گیا ہے:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لا مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ه (البقرہ: ۲۰)

اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو تیرے پاس آچکا ہے تو کوئی حامی اور مددگار تجھے اللہ کی سرزنش سے بچا نہ سکے گا۔

اس وقت مولانا پر عجیب کیفیت طاری تھی اور وہ پورے جلال اور جوش میں تھے۔ کڑک کر بولے:

قصد محکم دارم و عزم مصمم کہ تا جان در بدن دارم و سر بر تن، در خدمتِ کتاب و سنت بہ نہایت سرگرمی کوشم۔ ایں چہ مصائب است کہ بر من می آید، من از ربِّ خود ہمیں می خواہم کہ دریں راہ تکہ تکہ شوم و اعضاء رودہائے من در بیاباں بر سر بوتہ و خار افتادہ زاغہا بزاغہائے خورند۔[۲۷]

میں قصد محکم اور عزم مصمم رکھتا ہوں کہ جب تک میرے بدن میں جان باقی ہے اور جسم پر سر

---

[۲۷] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی۔ ص ۱۷، ۱۸۔

سلامت ہے، کتاب وسنت کی خدمت نہایت گرم جوشی سے کرتا رہوں گا۔ یہ کیا مصیبتیں ہیں جو مجھ پر آئی ہیں، میں اپنے اللہ سے یہی آرزو رکھتا ہوں کہ اس راہ میں میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اور میری انتڑیاں جنگلوں کی خار دار جھاڑیوں پر پھینک دی جائیں اور کوّے اُن پر اپنی چونچیں ماریں۔

اس وقت آپ پر حق گوئی کی انتہائی کیفیت طاری تھی اور نہایت درجے جوش و جذبے اور حالتِ جلال میں تھے۔ اس طرح کی اور بھی کئی باتیں کہیں۔ مگر سب خاموش تھے اور مجلس میں سناٹا چھا گیا تھا۔ جرنیل اور صوبے کا حاکم بھی موجود تھے جو آپ کے طرزِ کلام سے اس قدر مرعوب و متاثر تھے کہ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ یہ صورتِ حال سردار محمد عمر خاں نے دیکھی تو قلم پکڑا اور امیر محمد افضل خاں اور محمد اعظم خاں کو خط لکھا کہ "آپ کے حکم کی تعمیل میں مولانا عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا ہے، لیکن یہ شخص فقیر منش اور ولی اللہ ہے، دنیوی اعتبار سے بھی بے سروسامان ہے، مطلع فرمائیں اب اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔" امیر افضل خاں اور اعظم خاں نے جواب میں لکھا کہ "اس کو کامل احتیاط کے ساتھ ہمارے پاس کابل پہنچا دو۔" اس حکم کے بعد ملّا مشکی اور ملّا نصر اللہ لوہانی کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ شاید مولانا عبداللہ کو ان الزامات سے بری کر دیا جائے گا جو ان پر عائد کیے گئے ہیں اور حکومت کے اہل کار بھی ان کے زیرِ اثر آ جائیں گے۔ چنانچہ وہ دونوں فوراً امیر افضل خاں اور اعظم خاں کے دربار میں پہنچے اور کہا کہ امیر دوست محمد خاں کے عہد میں ہم اس شخص پر کفر ثابت کر چکے ہیں، اب دوبارہ تحقیق کی ضرورت نہیں۔

افغانستان کے علمائے سو نے مولانا کے قتل کا فتویٰ صادر کیا، لیکن ملّا مشکی نے اس پر دستخط نہیں کیے، وہ ان میں کچھ انصاف پسند عالم تھا۔ بعد میں کافی بحث و تمحیص کے بعد قتل کا فتویٰ تو واپس لے لیا گیا، لیکن یہ فتویٰ جاری کیا گیا، کہ اس کو دُرّے مارے جائیں، چنانچہ اُنھیں دُرّے مارے گئے، سر اور داڑھی مونڈ دیے گئے، چہرۂ مبارک سیاہ کیا گیا اور گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں گشت کرایا گیا۔ بعد ازاں اُنھیں قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

ان کے مریدوں میں سے ایک شخص قید خانے میں ملاقات کو گیا تو دیکھ کر رونے لگا۔ فرمایا روتے کیوں ہو، عزت اور داڑھی کیا شے ہے جو اللہ کی راہ اور اس کی رضا میں چلی گئی، شکر کرو دین ہاتھ سے نہیں گیا۔ رونا تو مخالفین کو چاہیے کہ وہ دین سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس زمانے میں مولانا عبداللہ غزنوی اور ان کے اہل وعیال کو جن مصائب و آلام سے دوچار کیا گیا، اس سے متعلق حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے وفات سے چند روز پیشتر اپنی ایک پھوپھی مرحومہ کے حوالے سے ان سطور کے راقم کو بتایا کہ غزنی کی پولیس اور حکمران ہر وقت ان کے تعاقب میں رہتے تھے۔ وہ انھیں انتہائی اذیتیں پہنچاتے اور یہ لوگ پہاڑوں کے غاروں میں چھپتے پھرتے تھے۔ کوئی شخص بھی اس نواح میں ان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرنے والا نہ تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ جب وہ اس دور کے واقعات بیان کرتیں تو ہم سن کر کانپ اٹھتے تھے۔

جلاوطنی اور ظالم حکام کا انجام

مولانا عبداللہ دو سال اپنے تین بیٹوں (مولانا محمد، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالجبار) کے ساتھ قید میں رہے۔ ۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو امیر محمد افضل خاں بعارضۂ وبا مر گیا تو اس کا بیٹا امیر اعظم خاں تختِ حکومت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے دورِ حکمرانی میں مولانا کی جلاوطنی کے احکام جاری کیے اور مُلّا خاں عبدالرحمٰن کے کہنے پر سخت گرمی کے دنوں میں ان کو پاپیادہ پشاور کی طرف ڈھکیل دیا۔ اس وقت پینے کو پانی بھی ان کے پاس نہ تھا۔ مولانا عبدالجبار غزنوی تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا کی جلاوطنی کے احکام جاری ہوئے ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ امیر اعظم خاں کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا اور وہ دشمن سے شکست کھا کر سراسیمگی کی حالت میں حیران و سرگرداں پہاڑوں میں پھرنے لگا۔ اس کے اہل وعیال کو بھی جو کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے تھے، وطن سے نکال دیا گیا۔ قرآن کا فرمان کتنا صحیح ہے: فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (الزخرف، ۵۵) "جب انہوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔"

امیر دوست محمد کے خاندان کو اللہ نے اپنی قدرتِ کاملہ کے ساتھ ایسا پراگندہ اور منتشر کیا کہ وہ قرآن کی اس آیت کے مصداق ہو گئے:

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ط (سبا: ۱۹)

"کہ ہم نے انھیں افسانے بنا دیا اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔"

وہ لوگ پشاور اور پنجاب میں انگریزوں کے ہاتھوں قید و بند کی سختیوں میں مبتلا ہوئے اور ان میں سے بعض جنگلوں اور پہاڑوں میں پریشان و سرگرداں پھرنے لگے۔ ایسا کیوں نہ ہو، حدیث میں اللہ کا ارشاد مروی ہے: من عادی لی ولیاً فقد بارزنی بالحرب۔

"جو شخص میرے کسی دوست کے ساتھ دشمنی کرتا ہے، وہ حقیقت میں میرے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے۔"

یہ بالکل سچ ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ٥ (النساء: ۱۲۲) اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے[۷۹]؟

کابل سے روانگی اور امرتسر میں ورود

جب بادشاہِ افغانستان نے ملک سے نکل جانے کا حکم دیا تو کابل سے ہندوستان کا رُخ کیا اور فرمایا:

بختِ افغانستان خوابیدہ شُد و بختِ ہندوستان بیدار شُد[۸۰]

افغانستان کی قسمت سو گئی اور ہندوستان کی قسمت جاگ اُٹھی۔

افغانستان سے نکلنے کے بعد کچھ عرصہ پشاور میں مقیم رہے۔ اس کے بعد عازم لاہور ہوئے۔ یہاں بھی کچھ مدت قیام رہا، لیکن اس کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔ پھر اہلِ دل اور فضل و کمال کے اس قافلے نے بعض احباب کی درخواست پر پنجاب کے شہر امرتسر کا رُخ

۷۹؎ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۱، ۲۲

۸۰؎ حضرت مولانا داؤد غزنوی، ص ۱۲ (مضمون مولانا محی الدین احمد قصوری مرحوم)

کیا اور شہر کے قریب ایک گاؤں "خیرالدین" میں اُترے۔ اس اثنا میں ان کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی تھی اور یہ چھوٹا سا گاؤں فیض حاصل کرنے والوں کا مرکز قرار پایا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس گاؤں میں چند مہینے قیام رہا اور متعدد حضرات نے ان کی خدمت میں یہاں حاضری دی۔ اسی لیے رجال کی بعض مستند کتابوں میں اس گاؤں کا ذکر ہوا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں نے بھی جیسا کہ آئندہ سطور میں بیان کیا گیا ہے، اپنی مشہور تصنیف تقصار جیود الاحرار میں اس گاؤں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا کے نزول کی وجہ سے اس گاؤں کو تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس گاؤں میں امرتسر کے لوگ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ پھر وہی لوگ انھیں امرتسر شہر لے گئے

ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے زمانے میں حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں مقیم تھے اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے صحیح بخاری کا درس لیتے تھے۔ مولانا غلام رسول (قلعہ میہان سنگھ، ضلع گوجرانوالہ) بھی ان کے شریکِ درس تھے۔ میاں صاحب کا مدرسہ اس زمانے میں مسجد اورنگ آبادی میں قائم تھا۔ مولانا عبداللہ غزنوی خود فرماتے ہیں:

بخدمت خاتم المحدثین شیخنا سید محمد نذیر حسین صاحب رسیدم و کتاب صحیح بخاری شروع نمودم، درآں میان بلوائے دہلی شروع شد۔ درعین بلوائے شدید کہ ہر کس بہ غم جانِ خود بود و من مشغول بخواندنِ کتاب مذکور[۱]

میں اپنے شیخ خاتم المحدثین سید محمد نذیر حسین صاحب کی خدمت میں پہنچا اور صحیح بخاری پڑھنا شروع کی۔ اس اثنا میں دہلی کا شہر سخت ہنگامے کی زد میں آگیا۔ اس شدید ہنگامے میں جب ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا، میں صحیح بخاری پڑھنے میں مشغول تھا۔

جب دہلی میں فساد کی آگ بھڑک رہی تھی اور خاندانوں کے شیرازے بکھر رہے تھے،

---

[۱] الحیات بعد الممات، ص ۵۲۔

اس خطرناک وقت میں بھی وہ موت سے خوف زدہ نہ تھے، اس لیے کہ وہ مقامِ ولایت کے اس زروۂ علیا پر سرفراز تھے جہاں موت وحیات کے سربستہ راز واشگاف ہو جاتے ہیں۔ اس ہنگامِ قتل و غارت میں اگر انھیں کوئی ڈر تھا تو صرف یہ کہ کہیں ایسے لمحے موت کا شکار نہ ہو جائیں جب کہ یادِ خدا سے غافل ہوں۔ مولانا غلام رسول ان کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

مارا ایک فکر است کہ مبادا بے یادِ مولائے خود جاں بجانِ آفریں بدہیم و بغفلت روح پرواز کند۔[۸۲]

ہمیں فقط ایک ہی فکر ہے، مبادا یادِ الٰہی کے بغیر مر جائیں اور ذکرِ خدا سے غفلت میں روح جسم سے پرواز کر جائے۔

پھر جب کسی حد تک کشت و خون کا طوفان تھما اور لوگوں کے قافلے شہر سے نکلنے لگے تو آپ نے کمالِ اطمینان کے لب و لہجے میں فرمایا:

ما نمی رویم، ہر چہ بادہ باد۔ شاید کہ امتحان رسیدہ باشد و عند الامتحان یکرم الرجل او یہان[۸۳]

ہم نہیں جائیں گے جو ہونا ہے ہو جائے۔ شاید آزمائش کا وقت آپہنچا ہے اور یہی وہ وقت ہے جس میں آدمی یا تو قابلِ احترام قرار پاتا ہے یا ذلت و رسوائی کے گڑھے میں پھینک دیا جاتا ہے۔

اس طوفانِ بلا کے زمانے میں وہ شیخ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنایا کرتے کہ جب تاتاریوں نے خوارزم میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا، اس وقت شیخ وہیں تھے۔ انھوں نے اپنے مریدوں کو بلایا اور سب کو اپنے اپنے وطن کی طرف لوٹ جانے کو کہا۔ مریدوں نے عرض کیا کہ اجازت ہو تو آپ کے لیے بھی سواری کا انتظام کیا جائے۔ شیخ نے فرمایا: "مرا اذن نیست کہ بیروں روم" (مجھے بارگاہِ خداوندی سے شہر چھوڑ

---

[۸۲] سوانح مولانا عبد اللہ غزنوی از مولانا غلام رسول ص ۴۲

[۸۳] ایضاً۔ ص ۴۱

کر جانے کی اجازت نہیں) چنانچہ وہ وہیں رہے اور تاتاریوں سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

بہرحال دہلی میں جب لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ کا سلسلہ حد سے بڑھ گیا تو مولانا سید نذیر حسین سخت پریشان ہو گئے تھے اور عالمِ اضطراب میں شہر کی آبادی اور تباہی کے متعلق لوگوں سے پوچھتے تھے۔ مولانا عبداللہ غزنوی ان کی پریشانی دیکھ کر فرماتے:

معلوم نیست مولوی صاحب راچہ شدہ است کہ ہمہ روز بہ سخن ہائے این و آں می گزرند۔ ایام فتن است، بایستی کہ صحیح بخاری می خواندیم و بمولائے خود پرداختیم۔

معلوم نہیں مولانا (نذیر حسین) کو کیا ہو گیا ہے کہ دن بھر لوگوں سے باتیں پوچھتے رہتے ہیں، یہ فتنے کا زمانہ ہے۔ ہم تو صحیح بخاری پڑھتے ہیں اور حالات کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔

مولانا عبداللہ غزنوی اس ہنگامِ فتنہ خیز میں نہایت اطمینان سے مسجد میں بیٹھے اور صحیح بخاری پڑھتے رہتے۔ مولانا غلام رسول فرماتے ہیں کہ ایک دن مسجد کی دیواروں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور مولانا عبداللہ ذکرِ الٰہی میں منہمک تھے۔ مولانا غلام رسول کو وہ عام طور پر "عبداللہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ جب بہت زیادہ شور ہوا تو ان سے مخاطب ہو کر پوچھا "عبداللہ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

بلاشبہ ان کے استغراق کی یہی کیفیت تھی۔ مولانا امام عبدالجبار غزنوی لکھتے ہیں کہ ان کا ایک عقیدت مند ان کے پاس کوئی شکایت لے کر گیا تو فرمایا:

من در دنیا نیستم، فقط بظاہر بدنِ مرا شما در دنیا مشاہدہ می کنید، ورنہ من در آخرت ہستم۔[۲۷۷]

اس کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں:-

میں دنیا میں نہیں ہوں، تم محض میرا جسم دنیا میں دیکھتے ہو، ورنہ میں تو عقبیٰ میں رہتا ہوں۔

ہم چنیں بود بجز ذو دیت او خدا یاد می آمد و نشستنِ ہمراہش ہمہ خطرات و ہموم ہبا منثورا می شدند[۲۷۸]

---

۲۷۷ سوانح مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۳

۲۷۸ ایضاً

بات فی الواقع ایسی ہی تھی، محض ان کے دیکھنے سے خدا یاد آتا تھا اور ان کے پاس بیٹھنے سے رنج وغم کی گھٹائیں چھٹ جاتی تھیں۔

دہلی میں تحریکِ آزادی کا آغاز ۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ (۱۱ مئی، ۱۸۵۷ء) کو ہوا۔ مولانا غلام رسول عید الفطر پڑھ کر مولانا عبداللہ غزنوی کے ایما سے دہلی سے وطن روانہ ہوئے، لیکن مولانا عبداللہ خود وہیں رہے اور مولانا غلام رسول کو رخصت کرنے کے لیے لاہوری دروازے کے باہر شاہدرہ تک تشریف لائے۔ مولانا غلام رسول نے دہلی سے روانہ ہوتے وقت وصیت طلب کی تو فرمایا: اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ۔ یعنی میں تمھیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔

جب مولانا غلام رسول لاہور پہنچے تو اُن کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے۔ انگریزی حکومت مولویوں سے بدگمان بھی تھی اور خوف زدہ بھی تھی۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک وعظ وتقریر کے ذریعے یہی لوگ ملک میں "فساد" بپا کرتے اور انگریزی حکومت کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے تھے۔ مولانا غلام رسول کے بڑے بھائی نے ان کو روپوش ہو جانے کا مشورہ دیا۔ مولانا نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کیا اور فرمایا: "روپوش ہونا اور کہیں چھپ کر بیٹھ جانا مردوں کا کام نہیں۔ میں اللہ کی رضا پہ راضی ہوں اور اپنے آپ کو اُسی کے سپرد کرتا ہوں ـــ بہر کیف ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد تحقیقات کا سلسلہ چلا تو رہا کر دیے گئے۔ لیکن یہ پابندی لگا دی گئی کہ وعظ کہنے کے لیے حکومت سے اجازت لینا ضروری ہے۔ انگریز کی عدالت نے تحقیقات کے دوران مولانا سے پوچھا "کوئی آپ کا ضامن ہے کہ اس کی ضمانت پر آپ کو رہا کر دیا جائے"؟ فرمایا، "ہے"۔! پوچھا، "کون؟" کہا "اللہ تعالیٰ"!!

مولانا عبداللہ غزنوی اُس وقت دہلی سے نکلے جب دہلی اُجڑ گئی، اس کے باشندے منتشر ہو گئے اور اس پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اہلِ دہلی کے لیے یہ اتنا سنگین وقت تھا کہ کوئی شخص انگریزی حکومت کی اجازت اور پروانۂ راہداری کے بغیر نہ اس شہر سے باہر نکل سکتا تھا اور نہ اس میں داخل ہو سکتا تھا۔ مولانا عبداللہ نے بھی پروانۂ راہداری لیا

اور دہلی سے امرتسر تشریف لائے۔[۵۸۶]

یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں مولانا عبداللہ غزنوی افغانستان سے ہجرت کرکے مستقل طور پر امرتسر نہیں آئے تھے، غزنی ہی میں ان کا گھر بار تھا۔ یہ ان کی جلاوطنی کا دور تھا اور تحصیل علم حدیث کے لیے دہلی گئے تھے۔ واپسی پر وطن جاتے ہوئے امرتسر رُکے اور سال بھر وہاں ان کا قیام رہا۔ اس سے قبل دہلی جاتے ہوئے بھی کچھ عرصہ امرتسر رہے تھے۔

ایک سچا خواب

یہاں یہ واقعہ لائقِ تذکرہ ہے کہ مولانا عبداللہ غزنوی نے دہلی جانے سے پیشتر اپنے وطن (غزنی) میں ایک خواب دیکھا تھا، جس میں ان کو ان حالات سے آگاہ کر دیا گیا تھا جو دہلی جا کر پیش آئے۔ وہ خواب اور اس کی تعبیر وہ خود ہی بیان کرتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہے۔

دیدم کہ در تہہ خانۂ زینہ دار فرو می روم۔ وقتے کہ بہ صحنِ خانہ رسیدم چراغ روشن یافتم، و دراں حالت در بغلم کتاب صحیح بخاری بود پیش چراغ نشستہ کتاب مذکور را وا نمودم۔ می بینم کہ کتاب از اول تا آخر سیاہ گشتہ۔ دودۂ دخانیہ چناں برآں چسپیدہ کہ حرف بہ نظر نمی آید۔ آخر الامر رومالے برگرفتم و از اول کتاب صاف نمودن شروع نمودم، و ورق ورق صاف نمودہ، قریب آخر رسانیدم۔ اوراقِ متعددہ باقی ماندہ نہایت ماندہ شدہ، نفس سرد کشیدہ گفتم اللہ اکبر، چہ قدر تکلیف بر داشتم۔ و دراں خواب چہرۂ خود بہ نظر می آید، می بینم کہ گردِ آں کتاب بر اسانم نمودار می باشد۔ در تعبیر ایں خواب حیران بودم کہ اتفاق سفر دہلی کہ بہ نسبت بلادِ ما نہایت زیر است، افتاد، بخدمت خاتم المحدثین شیخنا سید محمد نذیر حسین رسیدم و کتاب صحیح بخاری شروع نمودم۔ در آں میان بلوائے دہلی شروع شد۔ در عین بلوائے شدید کہ ہر کس بغم جانِ خود بود من مشغول بخواندن

---

۵۸۶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا غلام رسول، ص ۳۳

کتاب مذکور، تا حدے کہ نصاریٰ غالب آمدند و اہلِ بلدہ را متفرق نمودند۔ دراں ایام کتاب صحیح بخاری قریب الاختتام بود، مگر بسبب پراگندگیٔ اہلِ بلدہ درمیان من و سید صاحب ہم جدائی افتاد و کتاب ناتمام ماند ۔ تعبیرِ خواب ہمیں بود کہ زیر خانہ، دہلی بود۔ چراغ، سیّد صاحب مذکور۔ و صاف نمودن صحیح بخاری خواندنِ آں بود دراعسرِ اوقات۔ اوراقِ چند کہ بنابر لاچاری باقی ماند[۵۶]۔

یعنی میں نے دیکھا کہ میں ایک سیڑھیوں والے مکان کے نیچے اترا ہوں۔ اس کے صحن میں پہنچا تو وہاں چراغ جل رہا تھا۔ اس وقت میری بغل میں کتاب صحیح بخاری تھی۔ چراغ کے سامنے بیٹھ کر میں نے یہ کتاب کھولی تو دیکھتا ہوں کہ کتاب شروع سے آخر تک سیاہ ہو گئی ہے اور اس پر اس قدر دھوئیں کی تہہ جمی ہوئی ہے کہ حرف نظر نہیں آتے۔ بالآخر میں نے رُومال پکڑا اور صفحۂ اوّل سے کتاب صاف کرنا شروع کی اور ایک ایک ورق صاف کرتا ہوا، آخر کتاب کے قریب پہنچ گیا۔ کچھ اوراق جو باقی تھے، بہت خراب تھے۔ ٹھنڈی آہ بھر کر میں نے کہا، اللہ اکبر، میں نے کتنی تکلیف برداشت کی ہے — اس خواب میں مجھے اپنا چہرہ نظر آ رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ کتاب کی گرد میرے دانتوں پر نمودار ہو گئی تھی۔ اس خواب کی تعبیر کے لیے میں حیران تھا کہ اچانک دہلی کا سفر پیش آیا اور یہ وہ شہر ہے جو ہمارے ملک کے شہروں کی بہ نسبت بہت نشیب میں ہے۔ وہاں خاتم المحدثین شیخ سیّد محمد نذیر حسین کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے کتاب صحیح بخاری پڑھنا شروع کی۔ اس اثنا میں دہلی میں (۱۸۵۷ء) ہنگامہ شروع ہو گیا۔ شدید ہنگامے کے دوران میں، جب کہ ہر شخص کو اپنی جان کا خطرہ لاحق تھا، میں صحیح بخاری پڑھنے میں مشغول تھا۔ پھر صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی کہ اس ملک پر انگریز غالب آ گئے اور باشندگانِ دہلی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ ان دنوں کتاب صحیح بخاری ختم ہونے کے قریب تھی، مگر اہلِ شہر کے انتشار اور پراگندگی کی وجہ سے میرے اور سید (نذیر حسین) صاحب کے درمیان بھی جُدائی ہو گئی اور کتاب پوری نہ پڑھی جا سکی۔ میرے اس خواب کی تعبیر یہ تھی کہ "زیر خانہ" سے مراد شہر دہلی تھا — "چراغِ روشن" سید (نذیر حسین) صاحب تھے۔

---

[۵۶] الحیات بعد المماۃ، ص ۵۳۶ تا ۵۳۸۔

"صحیح بخاری کو صاف کرنے سے" مراد سخت مشکل اور ناموافق حالات میں اس کا پڑھنا تھا، سوائے ان چند اوراق کے جو انتہائی مجبوری کی وجہ سے باقی رہ گئے۔

ایک اور سچا خواب

اسی طرح انھوں نے ایک اور خواب دیکھا، وہ بھی بالکل صحیح اور سچا ثابت ہوا۔ وہ خواب یہ ہے، فرماتے ہیں:

دیدم کہ از دہانِ شیخنا سید محمد نذیر حسین صاحب، چشمۂ شربتِ شیریں جاری است و آں شربت در ہر دو دست من می ریزد و من آں رامی نوشم۔ مطلب کہ چشمۂ آں شربت از دہانِ شیخنا می باشد و مجرائے آں ہر دو دست من و مدخلِ آں فمِ من می باشد۔ در تعبیر ایں خواب متحیر بودم کہ اتفاقاً فرزندم عبدالجبار بخدمت شیخ مذکور رسیدہ و تحصیلِ علمِ حدیث از ایشاں نمود۔ چشمۂ شیریں علم حدیث است کہ از جناب سامی جاری است و تحصیل علمِ حدیث فرزندم از جناب ایشاں نوشیدنِ من است ازاں چشمۂ شیریں کہ فرزند مذکور جزوِ من است و از باقیاتِ صالحات من خواہد شد، ان شاء اللہ تعالیٰ[۸۲]

میں نے خواب میں دیکھا کہ ہمارے شیخ محترم سید محمد نذیر حسین صاحب کے دہنِ مبارک سے شیریں شربت کا چشمہ جاری ہے اور وہ شربت میرے دونوں ہاتھوں پر گر رہا ہے اور میں اُسے پی رہا ہوں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شربت کا چشمہ ہمارے شیخ کا دہنِ مبارک ہے، میرے دونوں ہاتھ اس کے جاری ہونے کی جگہ اور اس کا مدخل میرا منہ ہے۔ میں اس خواب کی تعبیر میں حیران تھا کہ اتفاق سے میرا بیٹا عبدالجبار شیخ مذکور کی خدمت میں پہنچا اور ان سے اس نے علم حدیث کی تحصیل کی تو گویا وہ چشمۂ شیریں، علم حدیث ہے جو اُن جناب سے جاری ہوا ہے، اور میرے فرزند کا ان سے علم حدیث حاصل کرنا میرا اس چشمۂ شیریں سے شربت پینا ہے، اس لیے کہ میرا مذکورہ فرزند میرا ہی ایک حصہ ہے، اور میری باقیات صالحات میں سے ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

---

[۸۲] الحیات بعد المماۃ، ص ۳۲۵

شیرازہ بکھر گیا

مولانا عبداللہ غزنوی کے اس دورِ طالب علمی میں میاں سیّد نذیر حسین دہلوی مسجد اورنگ آبادی میں حدیث کا درس دیتے تھے۔ یہ دہلی کی ایک شاندار مسجد تھی، جو اورنگ زیب عالمگیر کی بیوی نواب اورنگ آبادی نے بنوائی تھی اور پھر اسی خاتون کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ یہ مسجد جس جگہ تعمیر ہوئی، اس کا نام "پنجابی کٹڑہ" تھا۔ یہ ایک مکان تھا جو مختلف مقامات کے سوداگروں کی قیام گاہ تھا، لیکن اس میں زیادہ تر پنجابی سوداگر آتے اور قیام کرتے تھے۔ اسی بنا پر یہ پنجابی کٹڑہ کہلایا۔ اورنگ آبادی مسجد بھی چونکہ اسی جگہ بنائی گئی تھی اس لیے اسے "مسجد پنجابی کٹڑہ" بھی کہتے تھے۔ میاں سیّد نذیر حسین کے خسر مولانا سیّد عبدالخالق اور خود میاں صاحب اسی مسجد میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے اور اس میں دن رات قَالَ اللہُ وَقَالَ الرَّسُوْل کی صدائیں بلند ہوتی رہتی تھیں[۸۹]۔ مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول نے اسی مسجد میں حضرت میاں صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے دلّی پر قبضہ کیا تو وہ جوشِ انتقام میں اندھے ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے نہایت بے دردی سے اس شہر کو تاراج کیا۔ کئی محلے بیخ و بُن سے اُکھاڑ دیے۔ بہت سی شاہی عمارتیں زمیں بوس کر دیں اور مسجدوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ پنجابی کٹڑہ جو اہل اللہ کا مسکن تھا، ڈھا دیا گیا اور اصحابِ فضل اور اربابِ علم کا شیرازہ بکھر گیا۔ نہ میاں صاحب کا مکان بچا، نہ مسجد اورنگ آبادی کے آثار باقی رہے۔ اس مسجد کی زمین ریلوے سٹیشن کے احاطے میں شامل کر دی گئی۔ میاں صاحب پھاٹک حبش خاں میں چلے گئے اور زندگی کے آخری سانس تک وہیں رہے۔

سبعہ معلقہ عربی ادب کی مشہور کتاب ہے۔ اس کا چوتھا معلقہ لبید بن ربیعہ عامری کا ہے، جنھوں نے زمانۂ جاہلیت بھی پایا اور زمانۂ اسلام بھی۔ ظہورِ اسلام کے بعد

۸۹ے آثار الصنادید، ص ۱۸۸

مسلمان ہوئے اور شرفِ صحابیت حاصل کیا۔ ان کا معلقہ زمانہ جاہلیت کا ہے، جس کا تشبیب کا شعر یہ ہے جو ولی کے اس عہد کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

عَفَتِ الدِّیَارُ مَحِلُّھَا وَمَقَامُھَا
بِمِنًی تَاَبَّدَ غَوْلُھَا فَرِجَامُھَا

منیٰ میں دیارِ محبوب کے نشانات مٹ گئے۔ اب نہ وہ مقام ہے، نہ فرودگاہ۔ اس کے غول اور رجام برباد ہو گئے۔ یعنی وہ تمام مقامات جہاں محبوب کا بسیرا تھا اور جن سے عشق و محبّت کی داستانیں وابستہ تھیں، تباہ ہو گئے۔

تذکرہ نگاروں کا خراجِ عقیدت

مولانا سیّد عبداللہ غزنوی منبعِ علم و عرفان اور مقصودِ عباد و زہاد تھے۔ تذکرہ نگار حضرات نے نہایت احترام و عقیدت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ مولانا سیّد عبدالجبار غزنوی جو اپنے فضائل بوقلموں کی وجہ سے "امام صاحب" کے عرف سے معروف ہوئے، سفر و حضر میں ہمیشہ باپ کے ہم رکاب رہے، وہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عابد کثیر الذکر رجاع الی اللہ المتذلل لہ الخاشع الخاضع الورع المتضرع المتبرع المتواضع المبتھل الحنیف المتبتل الی اللہ الکامل البارع الملھم المحدث المخاطب المخلص الصدیق الکریم الجواد الاواہ الحلیم المتوکل المنیب الصابر القانت لم تاخذہ فی اللہ لومۃ لائم قط۔[۹۰]

یعنی وہ عبادت گزار، بہت ذکر کرنے والے، اللہ کی طرف رجوع کرنے والے، اُس کے سامنے بہت جھکنے والے اور خشوع و خضوع کرنے والے تھے۔ گناہوں سے بچنے والے، اللہ کے حضور گریہ و زاری کرنے والے، بہت صدقہ و خیرات کرنے والے، عاجزی کرنے والے، سب سے کٹ کر اللہ ہی کی طرف متوجہ ہونے والے اور اسی سے دعا و التجا کرنے والے تھے۔ مردِ کامل اور یگانۂ روزگار تھے۔ اللہ کی طرف سے القا و خطاب سے نوازے جاتے

---

۹۰ مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۱

تھے اور اس سے ہم کلامی کا انھیں شرف حاصل ہوتا تھا۔ اللہ کے مخلص بندے، بہت سچے، بزرگ اور سخی، نہایت درجے کے دردمند، بُردبار، اللہ پر بھروسا کرنے والے تھے۔ اسی کی طرف رجوع کرنے والے، مصیبتوں پر صبر کرنے والے اور اللہ کے اطاعت گزار تھے۔ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اُنھیں اللہ کی راہ سے ہرگز روک نہ سکتی تھی۔

مولانا شمس الحق ڈیانوی جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے تلمیذ تھے، مقدمہ "غایۃ المقصود" میں مولانا عبداللہ غزنوی کی توصیف میں رقم طراز ہیں:

انه كان فی جمیع احواله مستغرقا فی ذكر الله عزوجل حتی ان لحمه وعظامه واعصابه واشعاره وجمیع بدنه كان متوجها الی الله تعالٰی فانیا فی ذكره عزوجل۔

وہ ہر وقت اور ہر حالت میں خدائے بزرگ و برتر کے ذکر میں ڈوبے رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کا گوشت، ان کی ہڈیاں، ان کے پٹھے اور ان کا ہر ہر بُنِ مُو اللہ کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اللہ عزوجل کے ذکر میں فنا ہو گئے تھے۔

مولانا سید عبدالحئی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں:

الشیخ الامام العالم المحدث عبداللہ بن محمد بن محمد شریف الغزنوی الشیخ محمد اعظم الزاهد المجاهد الساعی فی مرضاة الله المؤثر لرضوانه علی نفسه واهله وماله واوطانه صاحب المقامات الشهیرة والمعارف العظیمة الكبیرة۔ [۱۹]

شیخ و امام اور عالم و محدث عبداللہ غزنوی، زاہد و مجاہد اور رضائے الٰہی کے حصول میں کوشاں تھے۔ خوشنودیٔ خدا کے لیے اپنی جان، گھر بار، مال و متاع اور ملک و وطن سب کچھ قربان کر دینے والے تھے۔

اِس کے بعد فرماتے ہیں:

۱۹ے نزهة الخواطر، ج ۷، ص ۳۰۲

عکف علی العبادۃ والافادۃ، انتھیٰ الیہ الورع وحسن السمت والتواضع والاشتغال بخاصۃ النفس، واتفق الناس علی الثناء علیہ والمدح بشمائلہ وصار المشار الیہ فی ھٰذا الباب وانتفع الناس بصالح دعواتہ وقصدوہ لذالک۔[۹۲]

وہ عبادتِ الٰہی اور افادۂ علماء و طلبا کے لیے وقف ہو گئے۔ ان میں پرہیزگاری، حُسنِ اخلاق، تواضع اور اصلاحِ نفس کا جذبہ حدِ کمال تک پہنچا ہوا تھا۔ لوگ ان کے اخلاق و عادات کی مدح و توصیف میں متفق ہیں اور اس باب میں ان کو اس درجے انفرادیت حاصل تھی کہ لوگوں کی ان کی طرف انگلیاں اٹھتی تھیں۔ ان کی صاف ستھری دعوتِ دین سے مخلوقِ خدا نے بے حد فائدہ اٹھایا اور اس کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

سیّد عبدالحیٔ حسنی مزید فرماتے ہیں:

وکان حسنۃ الزمن وزینۃ الھند قد غشیہ نور الایمان وسیماء الصالحین، ولہ کشوف وکرامات لا یسعھا البیان۔[۹۳]

وہ اپنے دور کی زینت اور ہندوستان کی آرائش تھے۔ ان پر نور ایمانی اور صلحائے اُمّت کی روشنی چھائی ہوئی تھی۔ ان سے ایسے ایسے کشوف و کرامات کا ظہور ہوا کہ جن کو حیطۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

نواب سیّد محمد صدیق حسن خاں نے اپنی تصنیف تقصار جیود الاحرار میں ان کا تذکرہ شاندار الفاظ اور عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے۔ ان کی نیکی، تدین، اتقاء، جذبۂ اتباعِ سُنّت، ایثار و قربانی اور خشیتِ الٰہی کو بہترین اسلوب میں حوالۂ قرطاس فرمایا ہے۔ ان کو جن مصائب سے دوچار کیا گیا اور جس وجہ سے کیا گیا، نواب صاحب نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ نیز بتایا ہے کہ حکومتِ وقت اور اہلِ بدعت کی ستم رانیوں کے سبب کابل سے نکل کر وہ پشاور پہنچے، پھر موضع خیرالدین اور امرتسر گئے۔

۹۲؎ نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۰۳

۹۳؎ ایضاً

نواب صاحب کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ ان کے حضرت مولانا سے گہرے روابط تھے اور ان دونوں کے درمیان سلسلۂ مراسلت جاری تھا۔ وہ نواب صاحب کی تصنیفات خود بھی پڑھتے اور اپنے عقیدت مندوں کو بھی ان کے مطالعہ کی تلقین کرتے تھے۔ نواب صاحب کی کتابیں ان کی کوشش سے افغانستان، خراسان، زابلستان وغیرہ علاقوں میں پہنچیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کا حلقۂ ارادت دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔

ہم چاہتے ہیں کہ نواب صاحب کی پوری عبارت یہاں درج کر دی جائے تاکہ اختصار کے ساتھ ان کے تمام اوصاف و کمالات قارئین کرام کے سامنے آجائیں۔ نواب صاحب کی فارسی عبارت بلاشبہ طویل ہے، لیکن لائقِ مطالعہ ہے۔ پہلے ان کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمایئے، پھر اردو ترجمہ پڑھیے:

شاہ عبداللہ غزنوی قدس سرہ، ولادت وی تقریباً در اواخر عشرۂ ثالثہ از مائتہ ثالث عشر ہجری بودہ، لیسے بزرگ بود، جامع میان علم حدیث نبوی و علم سلوک سنّی، در ایثار حق بر خلق از دست اہل بدعت در وطن جفا ہا کشیدہ، تا آنکہ می گویند کہ ریش او را نتزا شیدہ از کابل بدر کردند، در قرب پشاور رسید و در موضع خیر دین و امر تسر بسر می برد، و اشتغال داشت بعبادت و ریاضت و اشاعت علم حدیث و اتباع سنّت، و او انسانی بزرگ بود، دریں باب کہ نظیر آں از اہل عصر حاضر معلوم نیست۔ با محرر سطور محبت بللہ داشت و باوجود علو رتبہ و کبر سن، من صغیر العمر و الرتبہ را بالفاظ عالی در مکاتیب یاد می فرمود، گاہی استاذ خود می نوشت و گاہی بلفظ شاہ فلاں یاد می کرد، و خود را عائذ باللہ عبداللہ می نگاشت۔ دم گیر داشت ہر کہ بصحبت وی رسید، از خلق رمیدہ و بخالق رسیدہ۔ نماز در پس او رنگ حضور دیگر می آورد۔ وی مؤلفات محرر سطور را کہ غالباً در رفقہ سنّت و اصول حدیث ست در بلاد خراسان و افغانستان و زابلستان و آں نواح و دیار ترویج بلیغ بخشید، آلہ بود از آلات اذاعت سنّت و جارحہ بود از جوارح اضاعت بدعت و امانت محدث۔ در اصول و فروع مماشات بر طریقۂ سلف صالح داشت، و تقلیدات مذاہب و رجال را تالمہ در حصن حصین

دین مبین و شرع متین می انگاشت۔ چرخ اگر ہزار چرخ زند مشکل کہ چنیں ذاتِ جامع
کمالات بر روئے ظہور آرد۔ ہم محدث بود و ہم محدث۔ رؤیا ہای صادقہ حسنہ دیدہ و مبشراتِ
صحیحہ آوردہ۔ در حق ایں ناچیز خوابی عظیم مشاہدہ کردہ و خودش بتعبیر آں پرداختہ۔ می فرماید
فلانی را دیدم بر اسپی تیز رفتار سوار ست و تاج زریں بر سر دارد کہ نورِ آں چشم نظارہ را خیرہ
می سازد تا آں کہ فرس بعنان سما رسیدہ بلکہ خودش بر عرشِ عظیم شتافتہ و ترقی عجیب
گرفتہ۔ فرمود ایں کرامت از اشاعتِ علم سنت ست کہ دریں باب جہد بلیغ نمودہ،
و اصول و فروع ملتِ اسلام را بر وفقِ حدیث خیر الانام باقطار ارض از عرب و عجم
رسانیدہ، انتہیٰ۔ ازیں نفس مبارک شیخ امیدواری ہا دارم و چشم در راہ و گوش بر آواز، عقود
عافیت و مغفرت و رضوان خویشم۔ وکیف کہ رؤیائے صالحہ از صالح یکی از اجزاء نبوت و
مبشرات آخر امت ست بیرونی ادنیٰ لہ دریں نزدیکی شب سہ شنبہ پانزدہم
ربیع الاول ۱۲۹۸ واصل رحمت حق شد و داغ فراق بر دل اہل اتباع و مستفیدان
سنت سنیہ گزاشت۔ شیخ اہل قرآن تاریخ وفات ست کہ مولوی محمد یحییٰ
کشمیری در حلیۂ نظم برآوردہ اند، و قاضی طلا محمد پشاوری مرثیۂ او در قصائد عربیہ میمیہ
سرائیدہ، رحمہ اللہ تعالیٰ وایانا[۹۴]

" شاہ عبداللہ غزنوی مرحوم و مغفور کی ولادت تیرھویں صدی کے تیسرے دہے میں ہوئی۔
وہ بہت بڑے بزرگ اور علم حدیث اور علم سلوک کے جامع تھے۔ لوگوں کو کلمۂ حق سنانے کی پاداش
میں اپنے وطن کے اہل بدعت کے ہاتھوں ان کو کئی قسم کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا حتیٰ کہ ان کی داڑھی
مونڈ دی گئی اور ان کو حدودِ کابل سے نکال کر پشاور کی طرف دھکیل دیا گیا۔ وہاں سے وہ موضع خیر الدین
پہنچے اور پھر امرتسر جا آباد ہوئے۔ عبادت و ریاضت، اشاعتِ علم حدیث اور اتباعِ سنت ان کا شب و روز
کا مشغلہ تھا۔ وہ اس ضمن میں اتنے مستعد اور اس قدر اونچے درجے پر فائز تھے کہ اس دور میں اس کی
کوئی مثال نہیں ملتی۔ راقم السطور (صدیق حسن خاں) سے حبّ للہ رکھتے تھے۔ مرتبے میں عالی اور علم

---

۹۴ تقصار جیود الاحرار و تذکار جنود الابرار، ص ۱۹۳، ۱۹۴

میں بڑے ہونے کے باوصف مجھ کم عمر اور کم مرتبہ کو اپنے مکتوبات میں معززانہ الفاظ سے یاد فرماتے تھے۔ کبھی میرے لیے لفظِ "استاذ" تحریر فرماتے اور کبھی لفظِ "شاہ" سے خطاب کرتے اور اپنے لیے "عائذ باللہ عبداللہ" کے الفاظ رقم کرتے۔ وہ دم گیر صوفی اور صاحبِ طریقت تھے۔ جو ان کی صحبت میں آیا وہ مخلوق سے دور اور خالق کے قریب ہوا۔ ان کی اقتدا میں نماز، کچھ اور ہی کیفیت پیدا کرتی تھی۔ راقم السطور (صدیق حسن خان) پر وہ اس قدر مہربان تھے کہ میری ان تصنیفات کو جو تفہیم سنت اور مسائل حدیث سے متعلق ہیں، پوری کوشش کے ساتھ خراسان، افغانستان، زابلستان اور اس کے گرد و نواح کے بلاد و قصبات میں پہنچایا اور ان کی خوب ترویج کی۔ وہ اشاعتِ سنتِ نبویؐ کا زبردست آلہ اور بدعات و محدثات کا قلع قمع کرنے کے لیے تیغ براں تھے۔ اصول و فروع میں طریقۂ سلف صالح کے پابند تھے۔ شریعت کے قصرِ رفیع اور احکامِ دین میں تقلید مذاہب و رجال ان کا شیوہ نہ تھا۔ آسمان اگر ہزار بار گردش کرے تو مشکل سے کہ اب ایسی جامع صفات ہستی عالم وجود میں آئے۔ وہ محدّث بھی تھے اور اللہ سے ہم کلامی کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔ اللہ نے ان کو اس صفت سے نوازا تھا کہ وہ سچے اور عمدہ خواب دیکھتے اور اس کی صحیح ترین تعبیر دیتے۔ یقیناً اُسے مبشراتِ صحیحہ کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ اس ناچیز (صدیق حسن) کے بارے میں بھی انھوں نے ایک خواب دیکھا پھر خود ہی اس کی تعبیر دی فرمایا میں نے دیکھا ہے کہ (صدیق حسن) تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہیں اور ایسا تاجِ زریں سر پر رکھا ہے کہ اس کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ گھوڑا الگام سمیت آسمان پر پہنچ گیا ہے بلکہ خود (صدیق حسن) بھی عرشِ عظیم پر پہنچ گیا ہے اور بے حد ترقی کر گیا ہے۔ فرمایا یہ اشاعتِ علم سنت کی کرامت ہے کہ اس باب میں انتہائی جد و جہد کی ہے اور ملّتِ اسلام کے اصول و فروع کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں سرزمین عرب و عجم کے دور دراز کناروں تک پہنچا دیا ہے۔

نواب صاحب لکھتے ہیں: شیخ عبداللہ کی زبان مبارک ہو، میں اللہ سے اُمید رکھتا ہوں اور چشم براہ اور گوش بر آواز ہوں کہ وہ عفو و عافیت عطا فرمائے اور اپنی مغفرت و رضامندی سے سرفراز کرے۔ بلاشبہ اچھا خواب جو مردِ صالح دیکھے، اجزائے نبوت اور مبشراتِ اُمت

میں سے ہے، ایسا خواب وہ اپنے لیے دیکھے یا دوسرے کے لیے ۔۔۔!

"انھوں نے سہ شنبہ کی رات، ۱۵ ربیع الاوّل ۱۲۹۸ھ کو جنّت الفردوس کی راہ لی اور اپنے عقیدت مندوں اور متبعینِ سُنّت کو داغِ فراق دیا۔ اُن کی تاریخ وفات شیخ اہل قرآن ہے جو مولوی محمد یحییٰ کشمیری نے اپنی ایک نظم میں بیان کی ہے۔ ناصی طلا پشاوری نے عربی میں ان کا ایک دردناک مرثیہ کہا۔۔۔ اللہ ان پر اور ہم سب پر اپنی رحمت کی بارش کرے۔"

نواب صاحب کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حضرت عبداللہ غزنوی سے ملاقات تھی اور ان کی اقتدا میں ان کو نماز پڑھنے کا بھی موقع ملا ہے جس سے ان کے قلب و روح کی دنیا پر خاص نوع کی کیفیات طاری ہوئیں اور خاص قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔ "نماز درلیس اور زنگ حضور دیگرمی آورد" سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم، مولانا عبداللہ غزنوی کے مرید تھے۔ ان کے نام ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے مشہور عالم و محقق اور معروف مصنّف و مترجم نواب وحید الزمان خان حیدرآبادی نے تسہیل القاری میں مولانا عبداللہ غزنوی کا ذکر کیا ہے اور نہایت ادب و احترام کے الفاظ سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

ہمارے شیخ وحید العصر، امام الزمان مولوی عبداللہ صاحب اپنے مکتوب میں جو جبر نبیل مولوی محمد حسین صاحب کی طرف لکھا تھا، کہتے ہیں:۔ پس شمارا ضرور است کہ کلام اللہ را بزن و مرد تعلیم کنید با ترجمہ و ترجمۂ نماز را بزن و مرد تعلیم کنید۔ شیخ حبیب اللہ قندھاری می گفت ہر کہ معانی نماز یاد نہ دارد نماز او مقبول نیست۔[۵۹]

---

۵۹ تسہیل القاری ترجمہ صحیح بخاری، پارہ پنجم، ص ۴۰۔۔۔ یہاں یہ یاد رہے کہ نواب وحید الزمان خان نے "تیسیر الباری" کے نام سے صحیح بخاری کا اُردو ترجمہ کیا تھا جو کئی مرتبہ چھپ چکا ہے اور اہل علم میں مقبول و متداول ہے۔ سب سے آخر میں "تسہیل القاری" کے نام سے مع شرح کے، صحیح بخاری کا اُردو ترجمہ شروع فرمایا۔ صرف پانچ پارے مکمل ہوئے تھے کہ وفات پا گئے اور ترجمہ و شرح پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔

یعنی آپ کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کو مرکزِ التفات ٹھہرائیں اور اُسے باترجمہ غور وفکر کے ساتھ پڑھیں اور پڑھائیں۔ ترجمۂ نماز کو بھی ضروری قرار دیں اور لوگوں کو بھی اس کی تعلیم دیں۔ شیخ حبیب اللہ قندھاری کا فرمان ہے کہ جو شخص نماز کے معانی نہیں جانتا، اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔

میاں سیّد نذیر حسین دہلوی کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری اپنی تصنیف "الحیات بعد الممات" میں مولانا عبداللہ غزنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

مولانا محمد اعظم الشہیر بہ عبداللہ الغزنوی امرتسری المتوفی لیلۃ الثلثاء ۱۵ ربیع الاوّل ۱۲۹۸ھ صوفی محدث تھے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اگر کوئی شخص تصوفِ نبوی کا نمونہ دیکھنا چاہتا ہو تو اس کے لیے آپ کی ذات بابرکات کے برابر کوئی دوسرا نمونہ نہ مل سکتا تھا۔ آپ کے دو رؤیائے صالحہ جناب مولوی عبدالجبار صاحب (آپ کے صاحبزادے) کے دستِ خاص کے لکھے ہوئے ہیں، جن کی نقل خالی از دلچسپی نہ ہوگی — مولانا عبداللہ نے میاں نذیر حسین دہلوی سے حدیث پڑھی۔[۹۶]

اِس سے آگے لکھتے ہیں:

مولانا عبداللہ غزنوی نے اپنے چار صاحبزادوں کو تحصیل علم حدیث کے لیے جناب میاں صاحب کے حضور میں دہلی بھیجا اور چاروں دہلی سے کامیاب ہو کر اپنے بے نظیر باپ کی جناب میں حاضر ہوئے۔ (۱) مولانا محمد غزنوی خلف اکبر جناب ممدوح المتوفی ۱۲۹۶ھ۔ آپ نے اپنے والدِ ماجد کی زندگی ہی میں وفات پائی۔ تفسیر جامع البیان پر اُن کا حاشیہ ہے (۲) مولانا عبدالجبار غزنوی امرتسری جانشین والدِ ماجد قدس سرہ (۳) مولانا عبدالواحد غزنوی امرتسری (۴) مولانا عبداللہ بن عبداللہ غزنوی — (ان کے علاوہ مولانا عبداللہ غزنوی کے پوتوں میں سے) مولانا عبدالاوّل بن مولانا محمد غزنوی، مولانا عبدالغفور بن مولانا محمد غزنوی، مولانا عبدالقدوس غزنوی، مولانا عبدالاعلیٰ غزنوی اور مولانا عبدالحق غزنوی نے حضرت

---

۹۶ "الحیات بعد الممات"، ص ۶۷۹ — اس سے آگے فارسی میں دو رؤیا مرقوم ہیں جو گزشتہ صفحات میں درج کیے جا چکے ہیں۔

میاں سید نذیر حسین سے درس حدیث لیا۔[۹۷]

حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کی سوانح عمری "مہر منیر" کے مصنف مولانا فیض احمد فیض نے بھی مولانا عبداللہ غزنوی کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ ان کا اندازِ تحریر مخالفانہ ہے، لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

اس زمانے میں مملکتِ ہند میں وہابیت نے زور پکڑنا شروع کر دیا تھا اور تصوف و اہلِ تصوف کو ہدفِ بنا رکھا تھا۔ اس تحریک کو مولوی اسماعیل دہلوی اور مولوی عبداللہ غزنوی ثم امرتسری کی تعلیمات سے، غیر مقلدین کے وجود اور خود اہلِ سنت میں سے کئی سرگرم داعی مل جانے کے باعث تقویت ہوئی۔ یہ لوگ تاویلوں کے جال پھیلائے ہوئے، بزرگانِ دین کے اعراس میں جا پہنچتے اور زائرین کو قبر پرستی اور حدیثِ شدِ رحال کے طعنے دے کر پھنسانے کی کوشش کرتے، جس کی وجہ سے اکثر سادہ لوح عقیدت مند ان کی باتوں میں آ کر بھٹک جاتے۔[۹۸]

مولانا عبداللہ غزنوی علم و فضل میں یکتا، تقویٰ و تدین میں یگانہ، تصوف و طریقت میں بے مثال اور ضبط و تحمل میں منفرد تھے۔ علامہ اقبال نے محمد دین فوق کے نام ۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ء کو، ان کے بیٹے کی تعزیت کے سلسلے میں ایک خط لکھا، اس میں تحریر کرتے ہیں:

مولوی عبداللہ غزنوی حدیث کا درس دے رہے تھے کہ ان کو اپنے بیٹے کے قتل کی خبر موصول ہوئی۔ ایک منٹ تامل کیا، پھر طلبا کو مخاطب کر کے کہا: ما برضائے او راضی ہستیم، بیائید کہ کارِ خود بکنیم۔ یہ کہہ کر پھر درس میں مصروف ہو گئے۔[۹۹]

علامہ اقبال کو یہاں سہو ہو گیا ہے۔ مولانا عبداللہ غزنوی کا کوئی بیٹا قتل نہیں ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے مولانا محمد غزنوی تھے، وہ باپ کی زندگی میں ۱۲۹۶ھ میں وفات پا گئے تھے۔ یہ واقعہ انہی سے متعلق ہوگا۔ وفات کی خبر کو غلطی سے قتل کی خبر

---

[۹۷] "الحیاۃ بعد المماۃ" ص ۶۸۱۔

[۹۸] مہر منیر، ص ۲۵۹

[۹۹] انوارِ اقبال، ص ۱، ۲، مکتوب بنام محمد دین فوق۔

لکھ دیا گیا۔

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی "تاریخ اہل حدیث" میں رقم طراز ہیں :

"مولانا عبداللہ غزنوی کے والد کا نام محمد اور دادا کا نام بھی محمد تھا۔ پردادا محمد شریف تھے۔ یہ سب ولی اللہ تھے۔ چنانچہ آپ نے ولایت کی گود میں پرورش پائی۔ بچپن ہی سے تحصیل علم میں مصروف ہو گئے اور اسی حالت میں جوانی کی حد کو پہنچے۔ ان دنوں کا ایک واقعہ آپ سنایا کرتے کہ میں ایک دفعہ اپنے پردادا محمد شریف کی قبر پر (جو اس علاقے میں مقبول انام ہے) گیا، تو مجھے القا ہوا۔ "لا الٰہ غیرک" میں نے محسوس کیا، اللہ نے مجھے جتلایا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے کی طرف رجوع کرنا عبادت اور استعانت میں شرک ہے۔ قبروں پر اس نیت سے جانا کہ فلاں مطلب حاصل ہو جائے، توحید میں رخنا ڈالتا ہے اور کلمۂ شہادت (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کے معنی کے مخالف ہے۔ اور اگر کوئی گمان کرے کہ میں کسی نیک آدمی کی قبر پر اس لیے نہیں جاتا کہ اس سے کچھ سوال کروں، بلکہ اس لیے جاتا ہوں کہ وہ قبر مبارک مقام ہے، وہاں میری دعا قبول ہو گی، یہ بھی دین میں غلطی ہے۔ عبادت اور دعا کی قبولیت کے لیے شارع علیہ السلام نے بہتر جگہ مسجد مقرر فرمائی ہے"[۲۰]

اس سے آگے لکھتے ہیں :

"حامی شریعت شیخ حبیب اللہ قندھاری جو اس علاقے میں صاحب علم اور زہد و تقویٰ میں بے مثل تھے، (مولانا عبداللہ غزنوی نے) ان سے بعض مسائل میں استفادہ کیا۔ ان کی منشا سے تقویۃ الایمان کا مطالعہ کیا اور تمام قسم کے شرک کو سمجھ کر مالک حقیقی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کو صاحب کمالات سمجھنے۔ اکثر حدیث کی کتابوں (بخاری شریف وغیرہ) کا مطالعہ کیا، تو دل میں سنت کی تابعداری کا خیال محکم ہو گیا اور ہر مسئلے میں صحیح حدیث پر عمل کرنے لگے۔ فقہ کی جزئیات میں سے کوئی جزئی، حدیث

---

۲۰ تاریخ اہل حدیث، ص ۴۴۵۔

کی مخالفت ہوتی تو اُسے چھوڑ دیتے اور فرماتے ، تعجب ہے ، صحیح حدیث جو چند واسطوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہے ، ترک کی جائے اور اس کے خلاف فقیہ کا قول ، جس کے نقل کرنے والے مفتی اور قاضی ہیں ، وہ بھی معلوم نہیں کس واسطے سے ان کے پاس پہنچا ہے ، اس پر عمل کیا جائے ۔ چنانچہ آپ نے تشہد میں رفع سبابہ ، رکوع سے پہلے اور بعد میں رفعِ یدین ، آمین بالجہر اور فاتحہ خلف الامام پر عمل کرنا شروع کر دیا ۔ نماز بھی اوّلِ وقت میں خشوع خضوع سے پڑھتے ۔[۱۱]

تلامذہ اور اصحاب ارادت

مولانا عبداللہ غزنوی کے تلامذہ اور اصحابِ ارادت کا حلقہ بہت وسیع تھا ۔ ان میں وہ حضرات بھی تھے جو غزنی ، قندھار اور افغانستان کے رہنے والے تھے اور قیام غزنی کے زمانے میں ان سے مستفیض ہوئے تھے ۔ یہ ان کے ابتلا و آزمائش کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں ان کے حلقۂ بیعت و ارادت میں شامل ہونا اپنے آپ کو مشکلات کے حوالے کرنا تھا ۔ ظاہر ہے جن تکلیفوں میں مرشد کو ڈالا جائے گا وہ کسی نہ کسی شکل میں مسترشدین کے حصے میں بھی آئیں گی ۔ افغانستان میں وہ جہالت اور آمریت کا دور تھا ، اس میں کلمۂ حق بلند کرنے اور دعوتِ توحید دینے والوں کو حکومت بھی باغی قرار دیتی تھی اور علمائے سُو بھی ان کی شدید مخالفت کرتے تھے ۔ اس لیے کہ یہ دعوت ان کے خود ساختہ عقاید اور ذاتی مفادات سے متصادم تھی ۔ تاہم واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور علمائے سو کی بے پناہ مخالفت کے باوجود مولانا عبداللہ کو غزنی اور افغانستان کے دیگر مقامات میں اپنے زہد و ورع کی بنا پر لائق اکرام گردانا جاتا تھا اور لوگ اُن سے فیض حاصل کرتے تھے ، لیکن افسوس ہے اس کی تفصیل فراہم نہیں ہو سکی ۔

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی

افادہ و فیض کا دائرہ کبھی محدود نہیں رہا ۔ نہ اس کے مقام کا تعین ہو سکتا ہے اور نہ اس کے حدود کے لیے کوئی لکیر کھینچی جا سکتی ہے ۔ جہاں کوئی نیک اور متقی آدمی سکونت پذیر

---

[۱۱] تاریخ اہل حدیث ، ص ۴۴۵ ۔

ہوگا، اس کی شہرت پھیلے گی اور تشنگانِ فیض اس کے پاس پہنچیں گے۔ مولانا عبداللہ غزنوی کے بارے میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ ان کے فیض کے حدود بھی دُور دُور تک پھیلے اور افغانستان کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے ہندوستان میں آپہنچے یہاں کے بعض لوگ اُن کی خدمت میں گئے اور فیض یاب ہوئے۔ ان عالی مرتبت حضرات میں حضرت حافظ محمدؒ لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کے نامور فرزند مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا اسمِ گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

حافظ محمدؒ لکھوی کچھ عرصہ اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔ اُنھوں نے بارگاہِ ایزدی میں دُعا کی اور اللہ سے عہد کیا کہ اگر ان کے بیٹا پیدا ہوا تو وہ اُسے راہِ خدا میں وقف کردیں گے۔ دُعا قبول ہوئی اور اللہ نے انھیں بیٹا عطا فرمایا جس کا نام محی الدین رکھا۔[۱۰۲] جلیل القدر باپ نے بیٹے کی بہت اچھی تربیت کی اور خوب تعلیم دلائی۔ اس وقت غزنی میں مولانا عبداللہ غزنوی کا چشمۂ فیض جاری تھا۔ حضرت حافظ محمدؒ لکھوی نے لائق بیٹے کو ان کی خدمت میں غزنی بھیجا اور سو روپے جو اُس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی، زادِ راہ کے طور پر دیے۔

یہ آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس وقت آمد و رفت کے ذرائع نہایت مخدوش اور پُرخطر تھے۔ مولانا ممدوح ضلع فیروزپور (مشرقی پنجاب) کے گاؤں "لکھوکے" سے چلے اور راستے کی مشکلات عبور کرتے اور پیچ در پیچ پہاڑی سفر طے کرتے ہوئے غزنی پہنچے۔

مولانا عبداللہ غزنوی کو اللہ کی طرف سے القا ہوگیا تھا کہ کوئی بزرگ ملاقات کو آرہے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے استقبال کے لیے گھر سے نکلے اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ ایک بہت بڑے بزرگ تشریف لارہے ہیں، ان کے لیے اچھا کھانا تیار کرو۔ اس سے

---

[۱۰۲] اس کے بعد ایک اور بیٹے کی ولادت ہوئی جن کا نام مولانا محمد حسین لکھوی تھا۔ یہ بھی ممتاز تھے۔ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے اور ستمبر ۱۹۴۳ء کو وفات پائی۔

اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرید بھی نیکی کے کس قدر اونچے درجے پر فائز تھا جس کی آمد کی اطلاع اللہ کی طرف سے مرشد کو دی گئی۔۔۔۔ مولانا عبداللہ پیشوائی کے لیے ماننے میں جاکر بیٹھ گئے، اُدھر مولانا لکھوی بھی پہنچ گئے۔ مولانا غزنوی معزز مہمان کو گھر لے کر آئے اور کھانا وغیرہ کھلا کر نام پوچھا تو بتایا کہ میرا نام محی الدین ہے۔ فرمایا نام تو اچھا ہے، لیکن یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ہم لوگ کس حد تک احیائے دین کرتے ہیں۔ عبداللہ اور عبدالرحمٰن وہ نام ہیں جو اللہ کو بہت پسند ہیں۔ میرا نام محمد اعظم تھا، بے شک اعظمیت کا تعلق محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ ستودہ صفات سے ہے، تاہم میں نے اس کو بدل کر اپنا نام عبداللہ رکھ لیا کہ اللہ کا بندہ ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، آپ اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیجیے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ عبدالرحمٰن کے نام سے مشہور ہوئے، اگرچہ بعض حضرات انہیں مولانا محی الدین بھی کہتے ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی دو ماہ کی طویل اور تکلیف دہ مسافت طے کر کے غزنی پہنچے تھے۔ وہاں جاکر انھوں نے مولانا غزنوی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور واپس وطن آگئے۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ پھر غزنی جاکر ان کی خدمت میں حاضری دی۔ اس طرح وہ دو مرتبہ مولانا غزنوی کے آستانۂ فیض پر گئے اور ان سے مستفیض ہوئے۔[۱۰۳]

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی کے سفرِ غزنی کا ذکر مولانا عبدالجبار غزنوی نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ دورانِ سفر میں لوگ مولانا عبدالرحمٰن لکھوی سے مولانا عبداللہ غزنوی کی مخالفت کرتے تھے اور اس سے وہ بہت متحیر ہوتے تھے۔ اثنائے راہ میں انھیں ایک رات میں تین مرتبہ اللہ کی طرف سے القا ہوا، اور قرآن مجید کی آیات ان

---

۱۰۳ یہ واقعہ پوری تفصیل سے اس بندۂ عاجز کو حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف اوقات میں دو تین مرتبہ سنایا۔ مولانا مرحوم، لکھوی خاندان کا بہت احترام کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ لکھوی اور غزنوی خاندانوں کے تعلقات و مراسم بہت پرانے ہیں اور خالص للّٰہیت پر مبنی ہیں۔

کے پردۂ سماع سے ٹکرائیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ اپنا سفر جاری رکھو اور عبداللہ سے ملو، وہ نیک آدمی ہیں۔ مولانا عبدالجبار غزنوی کے فارسی الفاظ کا اُردو ترجمہ یہ ہے:-

مولوی عبدالرحمٰن بن شیخ محمد بن بارک اللہ جو اپنے دور کے علما میں بہت مشہور عالم ہیں اور زہد و تقویٰ اور رشد و صلاح میں اپنے زمانے کے امام ہیں، اُن (مولانا عبداللہ غزنوی) کی صحبت بابرکت سے فیض حاصل کرنے کے لیے ملکِ پنجاب سے سفر کر کے ملکِ غزنی تک گئے، یہ دو ماہ کی طویل اور تکلیف دہ مسافت ہے جو اُنھوں نے طے کی۔ راستے میں اُنھوں نے حضرت مولانا کی نسبت، مخالفوں سے جو کلمات سُنے، اس سے حیران ہوئے، چنانچہ اُسی رات اُن کو یہ الہام ہوا:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۝

(الذّٰریٰت: ۲۳)

(سو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی، وہ برحق ہے، اسی طرح جیسے کہ تم بات چیت کر رہے ہو)

دوسری بار یہ الہام ہوا:

وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ (ص: ۴۷)

(اور بے شک یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب اور سب سے اچھے لوگوں میں ہیں)۔

تیسری بار یہ الہام ہوا:

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ (الزخرف: ۵۹)

(وہ تو بس ہمارے ایک بندے ہیں، جن پر ہم نے اپنا فضل کیا)[۱]

مولانا عبدالجبار غزنوی کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ اس طویل سفر کے مختلف مقامات میں لوگوں نے مولانا عبداللہ غزنوی سے متعلق مولانا عبدالرحمٰن سے جو باتیں بیان کیں، اُن سے وہ پریشانی اور حیرانی میں مبتلا ہو گئے تھے اور ان کے افکار و عقائد کے

۱۔ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی ص ۱۰

بارے میں کئی قسم کی باتیں اُن کے ذہن میں گھومنے لگی تھیں۔ ان کی یہ پریشانی اس وقت دُور ہوئی، جب اللہ تعالےٰ نے ان کی رہنمائی فرمائی اور قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات یکے بعد دیگرے ان کے ذہن میں بصورتِ الہام والقا گردش کرنے لگیں۔

خاندانِ غزنویہ اور لکھویہ کے روابط

مولانا عبداللہ غزنوی کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہونے کے بعد علمائے غزنویہ اور علمائے لکھویہ کے درمیان سلسلۂ روابط بہت بڑھ گیا تھا اور دونوں ایک دوسرے سے نہایت تکریم و اعزاز کا برتاؤ کرتے تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن لکھوی کے صاحب زادے مولانا محمد علی لکھوی مدنی نے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات پر مدینہ منورہ سے ان کے صاحب زادوں مولوی عمر فاروق اور مولانا ابوبکر غزنوی کے کے نام ایک تعزیتی مکتوب ارسال کیا تھا۔ اس میں اُنھوں نے غزنوی اور لکھوی خاندان کے باہمی تعلقات اور مولانا عبدالرحمٰن لکھوی سے مولانا عبداللہ غزنوی کے روابط کے بارے میں تحریر فرمایا تھا کہ :

"حضرت امام مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن اخی المرحوم مولانا داؤد غزنوی کو فرمایا تھا کہ داؤد! تم محمد علی کو اپنا بھائی سمجھا کرو۔ اس کے والد مولانا عبدالرحمٰن صاحب میرے بھائی تھے۔ حضرت امام صاحب کی اس وصیت پر میرے الاخ المرحوم نے پورا عمل کیا۔ مسجد غزنویہ (امرتسر) میں ایامِ طالب علمی سے لے کر ہم آج تک لڑکپن، جوانی، بڑھاپے تک ہمدرد، ہمراز بھائی بھائی رہے۔ لِلّٰہِ الْحَمْدُ — اگرچہ ہمارے خاندان الگ الگ ہیں مگر روحانی اور دینی سلوک میں ایک ہی ہیں — حضرت ولی اللہ المعروف مولانا عبداللہ صاحب غزنوی، راقم کے والد ماجد (رحمۃ اللہ علیہما) کو اپنی صلبی اولاد سے مقدم رکھتے تھے۔ صوفی عبدالحق صاحب مرحوم غزنوی فرمایا کرتے تھے کہ مجھے عبداللہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "بسوئے عبدالرحمٰن بروکہ آں آفتاب است"۔ یعنی علم سلوک کے لیے عبدالرحمٰن کی طرف جاؤ کہ وہ علم سلوک کا آفتاب ہے —

الحاصل کہ حضرت والد ماجدؒ، حضرت عبداللہ صاحبؒ کے روحانی لڑکے تھے۔ للذا اخی المرحوم حضرت

مولانا محمد داؤد غزنوی تغمدہ اللہ تعالیٰ برحمتہ راقم کے بھائی روحانی ہوئے جو کہ نسبی بھائیوں سے بدرجہا افضل واعلیٰ مقام ہے۔[۱۰۶]

بہرکیف مولانا عبدالرحمٰن لکھوی نہایت پاکباز اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ مولانا نواب وحید الزماں خاں حیدرآبادی نے نماز کے سلسلے میں تسہیل القاری (اُردو ترجمہ صحیح بخاری) میں بہ درجۂ غایت تکریم کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ہمارے شیخ التقیٰ زماں مولوی عبدالرحمٰن صاحب ساکن لکھوکے رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص نماز کے معنی نہیں جانتا، اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ جو شخص اس مسئلے میں ان کے خلاف پر اصرار کرتا تو اس سے مباہلے پر تیار ہو جاتے۔[۱۰۷]

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی جلیل القدر عالم اور بہت بڑے صاحب طریقت تھے۔ حدیث میں حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ حج بیت اللہ کے لیے گئے اور ۱۳۱۲ھ کو مدینہ منورہ میں بحالتِ سجدہ وفات پائی۔ جنّت البقیع میں دفن کیے گئے۔ ان کے والد مکرم حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال اس سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ۱۳ صفر ۱۳۱۱ھ کو ہوا تھا۔

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مولانا عبداللہ غزنوی کی شہرت ان کے قیامِ غزنی کے دور ہی میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں پہنچ گئی تھی اور لوگ حصولِ فیض کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اپنی جلا وطنی کے دوران اور قیامِ دہلی کے زمانے میں بھی وہ پنجاب سے گزرتے ہوئے بعض مقامات میں تبلیغِ اسلام اور اشاعتِ دین کے لیے کچھ عرصہ مقیم رہے۔ ان مقامات میں ڈیرہ اسماعیل خاں اور اس کا نواحی علاقہ بھی شامل ہے۔ اس اثنا میں جیسا کہ آگے ذکر ہوگا، انھیں امرتسر میں بھی اقامت گزینی کا موقع ملا اور ان علاقوں کے لوگ ان کے مواعظِ حسنہ اور صحبتِ

---

[۱۰۶] ہفت روزہ "الاعتصام" (لاہور) ۷ فروری ۱۹۶۴ء

[۱۰۷] تسہیل القاری، پارہ پنجم، ص ۱۴۰، ۱۴۱

بابرکت سے اثر پذیر ہوئے۔یہی وجہ ہے کہ جب وہ افغانستان سے ہجرت کے بعد اور امرتسر میں ورُود سے قبل اس کے نواحی گاؤں خیرالدین پہنچے تو فوراً ہی کثرت کے ساتھ فیض و زیارت کی غرض سے لوگ ان کی خدمت میں آنے لگے اور چند ہی روز میں وہ مرجعِ عقیدت قرار پاگئے اور اس چھوٹے سے غیر معروف گاؤں کو مرکزِ فیض کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

راقمِ عاجز کے بزرگوں کی حاضری

راقم الحروف کے جدِّ امجد میاں محمد مرحوم کے حقیقی چچا میاں امام الدین مرحوم اور ہماری برادری کے ایک اور بزرگ حاجی نورالدین مرحوم بھی اسی زمانے میں موضع خیرالدین میں مولانا عبداللہ غزنوی کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ان کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال کے قریب تھی۔آزادیٔ پاکستان و ہندوستان سے قبل ایک مرتبہ حاجی نورالدین مرحوم نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی: "ہمیں پتا چلا کہ غزنی سے ایک بزرگ جن کا نام عبداللہ ہے، امرتسر آئے ہیں۔اُن کو اور اُن کے اہل و عیال کو کابل کے بادشاہ نے اپنے ملک سے فقط اس لیے نکال دیا ہے کہ وہ کلمۂ حق بیان کرتے ہیں۔یہ سُن کر میں اور میاں امام الدین اپنے شہر (کوٹ کپورہ[1]) سے چلے اور امرتسر پہنچے۔یہ سفر پیدل طے کیا۔امرتسر جاکر معلوم ہوا کہ وہ بزرگ اپنے خاندان سمیت قریب کے ایک گاؤں خیرالدین میں قیام فرما ہیں۔وہاں گئے تو لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو ان کے گرد جمع تھا۔وہ نہایت خوب صورت بزرگ تھے۔سُرخ و سفید رنگ، بارعب چہرہ، مناسب قد و قامت اور ہر آن ذکرِ الٰہی میں مشغول۔ہم تین دن اور تین راتیں وہاں رہے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نُور کی بارش ہو رہی ہے اور اللہ کی رحمت گھٹائیں باندھ کر آگئی ہے۔ہم لوگ ان سے بیعت ہونا

---

[1] آزادی سے پہلے کوٹ کپورہ، مشرقی پنجاب کی سکھ ریاست فرید کوٹ کا ایک شہر تھا، آزادی کے بعد ریاستیں ختم ہوگئیں اور فرید کوٹ کو ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔اب یہ شہر ضلع فرید کوٹ میں ہے۔میرا آبائی وطن یہی شہر ہے۔امرتسر وہاں سے ساٹھ میل کے لگ بھگ ہوگا۔

چاہتے تھے، لیکن نہ وہ ہماری بولی سمجھتے تھے اور نہ ہم ان کی زبان سے آشنا تھے۔ ہم خالص پنجابی بولنے والے اور اُن کی زبان فارسی — ! فرمایا، اب تم جاؤ، کچھ پڑھو، پھر آنا۔ لیکن ہم لوگ دوبارہ نہیں جاسکے۔ واپس آکر مولانا عبدالرحمٰن لکھوی سے بیعت ہوگئے، جو غزنی جاکر ان کے مرید ہوئے تھے۔ اس طرح بالواسطہ طور پر مولانا عبداللہ غزنوی کے حلقۂ ارادت میں شمولیت کا شرف حاصل ہوا۔" حاجی نورالدین مرحوم فرماتے تھے کہ "تین دن اور تین راتوں کی ان نمازوں میں جو مولانا عبداللہ غزنوی کی اقتدا میں پڑھیں، الیسا روحانی لطف اور قلبی سرور حاصل ہوا کہ اس کے بعد نصیب نہ ہوسکا۔"

میاں امام الدین مرحوم اور حاجی نورالدین مرحوم نہایت نیک اور پرہیزگار تھے۔ ایک ہی شہر کے باشندے تھے اور حسنِ اتفاق سے ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں نے اپنے شہر (کوٹ کپورہ) میں دین کی خوب اشاعت کی اور بے شمار لوگوں کو قرآن پڑھایا اور اسلام سکھایا۔

میرے والدِ مکرم (میاں عبدالمجید) کی عمر اس وقت نوّے سال کے قریب ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ میاں امام الدین کی وفات کے وقت وہ تقریباً بارہ سال کے تھے۔ میاں صاحب کئی روز سے بیمار تھے۔ بہت سے لوگ ان کی عیادت کو آتے اور اُن کے مکان کے قریب مسجد میں آکر بیٹھ جاتے۔ جس رات وہ فوت ہوئے، اُس رات مسجد میں لوگوں کی بہت بھیڑ تھی۔ والد صاحب نے بتایا کہ وہ اپنے والد (میاں محمدؐ) کے ساتھ تمام رات مسجد میں رہے۔ فجر کی اذان سے کچھ پہلے روشنی کی ایک لمبی شعاع میاں امام الدین کے مکان سے نکلی اور آسمان تک چلی گئی۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی۔ اسی وقت شور مچ گیا کہ میاں امام الدین فوت ہوگئے۔ یہ ۱۹۰۵ء کے قریب کا واقعہ ہے۔

حاجی نورالدین نے کم و بیش سو سال عمر پائی۔ بچوں کو قرآن پڑھانا ان کا اصل کام تھا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے خول ریز ہنگامے میں بہت بڑے قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچے، لیکن اس میں رہنا نصیب نہیں ہوا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو فیروزپور کے راستے سے دریائے ستلج عبور کیا اور اُسی دن دوپہر کے وقت گنڈا سنگھ والا (ضلع قصور) میں وفات پا گئے۔ نمازِ جنازہ

پڑھنے والوں میں ان سطور کا راقم بھی شامل تھا۔ وہیں سڑک کے کنارے، ایک ویرانے میں دفن کیے گئے، جس کے اردگرد سرکنڈے کا دور تک پھیلا ہوا جھنڈ تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مولانا محمد حسین بٹالوی

جیساکہ پہلے گزر چکا، دیارِ ہند کے جیّد عالم مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم بھی مولانا عبداللہ غزنوی کے زمرۂ مریدین میں شامل تھے۔ وہ اپنے دور کے بہت بڑے فاضل تھے۔ ۱۷ محرم ۱۲۵۶ھ کو پیدا اور ۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ (۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء) کو فوت ہوئے۔

مولانا غلام رسول

مولانا عبداللہ غزنوی کے ایک بہت ہی نامور اور ممتاز مرید مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ) تھے، جو طویل عرصے تک ان کے ساتھ رہے۔ ان کا ذکر مولانا غزنوی کے حالات میں کثرت سے آتا ہے۔ دہلی میں میاں سید نذیر حسین دہلوی سے دونوں نے ایک ساتھ حدیث پڑھی۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا، یہ دونوں بزرگ میاں صاحب کے درس میں شامل تھے۔ ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ (۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) کو دہلی میں جنگِ آزادی کا پہلا شعلہ نمودار ہوا۔ مولانا غلام رسول نے عید الفطر دہلی میں پڑھی اور پھر وہاں سے وطن روانہ ہو گئے۔ لیکن مولانا غزنوی کچھ عرصہ وہیں رہے۔

مولانا غلام رسول نہایت صاحبِ فراست عالم تھے اور ان کی سوچ بہت اونچی تھی۔ انھوں نے دہلی میں عورتوں اور بچوں کی لاشیں دیکھ کر کہا تھا کہ معلوم نہیں اب ہندوستان کب تک غلام رہے۔[۱]

مولانا عبداللہ غزنوی اپنے اس مرید اور شاگرد پر بہت شفقت فرماتے اور عام طور پر انھیں "عبداللہ" کہہ کر پکارا کرتے۔ ان کے نام جو خطوط تحریر کیے ان میں بھی "عبداللہ ساکن قلعہ" لکھا ہے۔ بعض دفعہ دونوں اکٹھے سفر پر جاتے۔ ایک مرتبہ ضلع سیالکوٹ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مولانا غلام رسول ہم رکاب تھے۔ جب ایک گاؤں "ہلو والی" پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے ان کو روک لیا۔ وہ لوگ مولانا غلام رسول کو بہت اچھی طرح جانتے تھے، لیکن مولانا عبداللہ سے متعارف نہ تھے۔ وہاں کے چند سرکردہ آدمی مولانا

---

[۱] "الاعتصام" تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء نمبر ص ۳۲، ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء

غلام رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وعظ کی درخواست کی۔ مولانا نے فرمایا۔ "حضرت مولانا عبداللہ صاحب ہیں، ان کا مقام شیخ اور مرشد کا ہے، ان کی اجازت کے بغیر وعظ نہیں کہہ سکتا۔" وہ لوگ مولانا عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ فرمایا، "ایں مرداں چہ می گویند"؟ (یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟) بتایا گیا کہ آپ سے یہ عرض کرنے آئے ہیں کہ مولانا غلام رسول کو وعظ کہنے کی اجازت دے دیں۔ یہ سُن کر مولانا غلام رسول سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

"مولوی غلام رسول قابل وعظ شدی؟" (مولوی غلام رسول تم وعظ کہنے کے قابل ہو گئے ہو؟)

فرمایا، کلمۂ حق کہنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بے شک کتنی بھی مخالفت کی جائے اور لوگ جتنا جی چاہے ہنگامہ بپا کریں، ماریں، پیٹیں، منبر سے اُتار دیں، لیکن پیشانی پر بل نہ پڑے۔ وہ بار بار تکلیف پہنچائیں اور مبلغ اتنے ہی زور اور جذبے سے بار بار کلمۂ حق بلند کرے، اگر یہ چیز آپ میں پیدا ہو گئی ہے تو بلا شبہ آپ کو وعظ کہنے کا حق ہے۔[۱۰۹]

ایک روز مولانا غلام رسول صاحب سے کسی مسئلے سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

مولوی غلام رسول! تو مولوی شُدی، محدث شُدی، عالم شُدی، واعظ شُدی، واللہ ہنوز مسلمان نشدی۔

یعنی مولوی غلام رسول! تم مولوی ہو گئے ہو، محدث ہو گئے ہو، واعظ ہو گئے ہو، لیکن ابھی مسلمان نہیں ہوئے۔

یہ سُن کر مولوی غلام رسول فرش پر گر گئے اور تڑپنے لگے۔ پھر فرمایا: "بگو لا الٰہ الا اللہ" منقول ہے کہ اس وقت مسجد کے در و دیوار سے لا الٰہ الا اللہ کی آواز آ رہی تھی۔[۱۱۰]

---

[۱۰۹] "حضرت مولانا داؤد غزنوی" ص ۱۶ (مضمون مولانا محی الدین احمد قصوری)

[۱۱۰] ایضاً

مولانا غلام رسول کی ولادت ۱۲۲۸ھ میں اور وفات ۱۲۹۱ھ میں ہوئی۔ انھوں نے مولانا عبداللہ غزنوی کی فارسی میں سوانح عمری بھی لکھی ہے، جس کے حوالے ان صفحات میں کئی بار آئے ہیں (ان کے حالات اس کتاب کی تیسری جلد میں شائع ہوں گے انشاءاللہ)

مولوی غلام قادر

مولانا عبداللہ غزنوی بلاشبہ ولی اللہ اور عالی مرتبہ بزرگ تھے۔ اکثر ان پر استغراق و محویت کا عالم طاری رہتا۔ مولانا محی الدین احمد قصوری مرحوم کے ایک استاذ مولوی حافظ عبدالرحمٰن مرحوم، مولانا عبداللہ غزنوی کے شاگرد تھے۔ مولانا قصوری ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"وہ فرمایا کرتے تھے کہ قیام امرتسر کے زمانے میں جب وہ حضرت مولانا (عبداللہ) سے حدیث پڑھا کرتے تھے، ان کی محویت کے عجیب وغریب واقعات دیکھنے میں آئے۔ ایک مرتبہ عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ یکایک سخت بارش شروع ہوگئی، ایسی سخت کہ مقتدی سب نماز چھوڑ کر بھاگ گئے، صرف دو چار رہ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو ہاتھ سب کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے۔ فرمانے لگے: "امروز باراں شد؟ واللہ عبداللہ را خبر نشد۔[1] (کیا بارش ہوگئی ہے؟ عبداللہ کو اس کا احساس نہیں ہوا)

"نمازِ عصر کے بعد مولانا عبداللہ غزنوی کا خاص وقت تھا۔ جن لوگوں کو دعا کرانا ہوتی، وہ اس وقت پہنچ جاتے۔ مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے پھوپھا مولوی غلام قادر کو مولانا عبداللہ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ وہ امرتسر گئے تو نماز کے بعد اپنا تعارف کرایا اور اپنے خاندان کا ذکر کیا۔ فرمایا، اگر تمھارا تعلق اس خاندان سے ہے تو ضرور علم سے کچھ دسترس رکھتے ہو گے۔ انھوں نے ازراہِ انکسار عرض کیا "کچھ شُدبُد رکھتا ہوں"۔ ایک دن مولانا نے اپنی کسی کتاب کا قلمی نسخہ نکالا اور مولوی غلام قادر سے فرمایا کہ کتابت کر سکتے ہو تو یہ چھوٹی سی کتاب نقل کر دو ـــ ان کا خط بہت اچھا تھا۔ کئی دن کے بعد جب کتاب نقل کر کے پیش خدمت کی تو بہت خوش ہوئے ـــ ایک روز نمازِ عصر کے بعد مولوی

---

[1] حضرت مولانا داؤد غزنوی، ص ۱۴

غلام قادر نے عرض کیا "حضرت میرے لیے دُعا فرمائیں۔" پوچھا "کیا دُعا کروں؟" عرض کیا، مجھے بعض دفعہ دردِ سر کا ایسا شدید دورہ پڑتا ہے کہ بے حال ہو جاتا ہوں اور نمازیں قضا ہو جاتی ہیں۔ دُعا فرمائیں کہ ایک تو دردِ سر کی شکایت دُور ہو جائے، دوسرے نماز باجماعت قضا نہ ہو۔ تیسری کسی اور چیز کے لیے دُعا کی درخواست کی جو (مضمون نگار مولانا محی الدین احمد قصوری) کو یاد نہیں رہی، حضرت مولانا نے ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی اور فرمایا: "قبول شُد ان شاء اللہ۔"

مولوی غلام قادر اس وقت بالکل جوان تھے۔ کُل ستر سال کی عمر پائی یعنی دُعا کے بعد کم و بیش پچاس سال زندہ رہے۔ اس طویل مدت میں نہ کبھی دردِ سر ہوا، نہ سفر و حضر میں کبھی نماز باجماعت قضا ہوئی۔ زندگی کی آخری رات عشاء کی نماز باجماعت ادا کی۔ تہجد کی نماز پڑھ چکے تھے کہ پیغامِ اجل آ گیا۔ ذکرِ الٰہی شروع کیا اور فجر کی نماز سے قبل جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔[۱۱۲]

یہ حضرت مولانا غزنوی کے چند مریدوں کا ذکر ہے۔ ورنہ ان کا حلقۂ عقیدت و ارادت بہت وسیع تھا اور امرتسر تشریف لانے کے بعد پنجاب کے تقریباً تمام مقامات کے لوگ تصوف و سلوک میں انھیں اپنا کعبۂ مقصود قرار دیتے تھے۔

قید خانے کی سختی اور پشاور کو روانگی

امرتسر میں ورود سے قبل مولانا عبداللہ غزنوی اپنے تین بیٹوں — مولانا محمد، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالجبار — سمیت کابل کے قید خانے میں بند رہے۔ یہ ان کے لیے انتہائی اذیت کا زمانہ تھا۔ سنگ دل حاکموں نے ایک حبّہ بھی ان کے خرچ کے لیے مقرر نہ کیا۔ یہ بے گناہ لوگ قید میں ڈال دیے گئے، پھر کسی نے خبر نہ لی کہ کس حال میں ہیں۔ شہر کے لوگوں کے دلوں میں اللہ کی طرف سے القا ہو گیا کہ یہ لوگ بھوک پیاس میں مبتلا اور سخت پریشانی کے عالم میں ہیں۔ چنانچہ اہلِ شہر ہر وقت قسم قسم کے کھانے اور نوع بنوع پھل ان کے لیے

---

[۱۱۲] حضرت مولانا داؤد غزنوی، ص ۱۴، ۱۵

اس قدر فراخی اور کثرت سے لاتے کہ اپنے گھر میں بھی یہ فراخی اور کثرت نہ دیکھی تھی۔
اس اثنا میں امیر افضل خاں بعارضۂ وبا انتقال کر گیا تو امیر اعظم خاں کابل کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے مولانا پر یہ ستم ڈھایا کہ خان ملا خاں عبدالرحمٰن کے بہکانے سے ان کو اور ان کے بیٹوں کو جیل سے نکالا، ان کے اہل وعیال کو غزنی سے کابل بلایا اور خاندان کے ان افراد کو جن میں عورتیں، مرد اور بچے شامل تھے، شدید گرمی کے موسم میں پیادہ پا، کوئی زادِ راہ یا سفر خرچ دیے بغیر پشاور کی طرف نکال دیا اور سخت دل سپاہیوں کو ان پر متعین کیا اور تاکید کی کہ بہت جلد ان کو پشاور پہنچا دیں۔ اُوپر سے گرمی کی آگ برستی تھی اور نیچے زمین کی تپش سے پاؤں جلتے تھے۔ ان پتھر دل سپاہیوں کی سختی کی وجہ سے جو ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، آرام کا ایک لمحہ بھی میسر نہ تھا۔ خطرناک اور پہاڑی راستے میں ڈاکو بار بار ان پر حملہ آور ہوتے اور یہ مظلومین اپنا دفاع کرتے۔ حملہ آور حکومتِ کابل کے اپنے آدمی تھے جن کو خاص طور سے اس نے اس کام کے لیے مقرر کیا تھا۔

اس الم ناک سفر میں مولانا کے دو خادم ساتھ تھے۔ ایک خادم کا نام "ملا سفر" تھا اور ایک کا "ملا مراد"! دھوپ کی شدت اور سفر کی تھکاوٹ کے باعث آپ کے لیے چلنا مشکل ہو جاتا تو وفادار خادم ملا سفر آگے بڑھتا اور آپ کو پیٹھ پر اُٹھا لیتا۔ اسی بنا پر ملا سفر کو "راحلۂ عبداللہ" کے نام سے موسوم کیا گیا اور یہ خوش بخت خادم اسی نام سے مشہور رہا۔ غرض نہایت جسمانی تکلیف اور بدنی اذیت برداشت کرتے ہوئے یہ لوگ پشاور پہنچے[۲۱۳]

مولانا عبدالجبار غزنوی تحریر فرماتے ہیں کہ اس قسم کی مصیبتیں اور تکلیفیں وہ پندرہ سال سے برداشت کرتے چلے آرہے تھے[۲۱۴] یعنی حکومتِ افغانستان اور علمائے سو نے ان کو پورے پندرہ سال مبتلائے اذیت رکھا۔

---

۲۱۳ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۱

۲۱۴ ایضاً، ص ۲۲

پشاور میں وہ تھوڑی مدت قیام پذیر رہے اور وہاں سے بعض دوستوں کی استدعا سے پنجاب کے شہر امرتسر تشریف لے گئے[۱۱۵]۔ یہ ان کی امرتسر میں آمد کا تیسرا اور آخری مرحلہ تھا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ خاندان کے تمام افراد ایک ہی وقت میں غزنی سے امرتسر نہیں آگئے تھے، بعض حضرات جن میں مولانا کے کچھ قریبی عزیز بھی شامل تھے، بعد میں آئے۔

اس کاروانِ فقر و درویشی کو افغانستان کی حدود سے نکلے ہوئے پورا ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ امیر اعظم خان کی حکومت ختم ہو گئی اور وہ ہزیمت اُٹھا کر ملک سے بھاگ گیا۔ اس پر ایسی مصیبت نازل ہوئی کہ پہاڑوں کے غاروں اور جنگلوں میں بھاگا پھرتا تھا، اور کہیں پناہ نصیب نہ ہوتی تھی۔ اس کے اہل و عیال عمر بھر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے تھے، لیکن اس کی وجہ سے اُنھیں بھی نکال دیا گیا اور محلات و قصور میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والے لوگ در در کی ٹھوکریں کھانے لگے۔ تمام خاندان انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو گیا، اور اس بھری پڑی دُنیا میں کوئی ان پر ترس کھانے والا نہ تھا۔ امیر دوست محمد خاں افغانستان کا پہلا حکمران تھا جس نے کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں مولانا عبداللہ غزنوی کو ہدفِ ستم بنایا تھا، اب خود اس کا شاہی خاندان انتہائی اذیتوں میں مبتلا تھا۔

مولانا عبداللہ غزنوی کو افغانستان کے چار بادشاہوں نے مبتلائے اذیت کیا، جن کے علی الترتیب نام یہ ہیں:۔

(۱) امیر دوست محمد خاں (۲) امیر شیر علی خاں (۳) امیر محمد افضل خاں اور (۴) امیر محمد اعظم خاں — اس کے بعد یہ ہوا کہ ان کے خاندان کے بہت سے لوگ پشاور، پنجاب اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انگریزی حکومت کی قید میں آئے، اس کا تختۂ مشق بنے، اور کئی قسم کی اذیتوں سے دوچار ہوئے۔

امرتسر میں پہلی دفعہ آمد اور قیام

مولانا عبداللہ غزنوی امرتسر آئے تو یہ شہر ان کے لیے کوئی اجنبی اور غیر مانوس شہر نہ تھا،

---

[۱۱۵] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۱۔

اس سے پہلے وہ دو دفعہ اس شہر میں آچکے اور قیام فرما چکے تھے۔ پہلی دفعہ کب آئے؟ پھر دوسری دفعہ کب آئے اور کتنا عرصہ وہاں رہے؟ اس موقعے پر اس کی وضاحت ضروری ہے۔ مولانا غلام رسول صاحب نے اس ضمن میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

جب ان کو دوسری مرتبہ غزنی سے نکالا گیا اور ان کے خلاف بہت بڑا ہنگامہ بپا ہوا تو وہ سوات آئے اور وہاں اقامت اختیار کر لی۔ سوات میں ایک بزرگ اخوند عبدالغفور تھے جو زہد و ریاضت اور عبادت و تدین میں ممتاز تھے۔ وہ تصوف میں مجددیہ قادریہ سلسلے سے منسلک تھے اور صائم الدہر اور شب زندہ دار تھے۔ مولانا ان کے ہاں پہنچے تو نہایت شفقت اور مروّت سے پیش آئے اور ان کی بہت دل دہی اور دل داری کی۔ لیکن جب افغانستان میں مولانا کے حاسدوں کو اس کا علم ہوا، تو انھوں نے اخوند عبدالغفور کو ان کے خلاف ایک خط تحریر کیا۔ اخوند صاحب نے وہ خط پڑھا تو اصل معاملے کی تحقیق کیے بغیر مولانا سے سلسلۂ مروّت منقطع کر لیا۔ اس کے بعد بھی مولانا کچھ مدت سوات رہے، لیکن اخوند صاحب کی ہمدردیاں ان سے ختم ہو گئی تھیں اور رابطہ ٹوٹ گیا تھا، اس طرح سوات کی اس مدتِ قیام کو ان کے دورِ ابتلا ہی سے تعبیر کرنا چاہیے۔

اب ان کے لیے سوات میں مزید قیام ممکن نہ رہا تھا اور اخوند صاحب کی مخالفت بہت رُوحانی پریشانی کا باعث بن گئی تھی، اس لیے وہ وہاں سے نکلے اور علاقۂ سرحد کے ایک مقام "کوٹھہ" تشریف لے گئے۔ وہاں سید امیر صاحب کے ہاں مقیم ہوئے جو حضرت سید احمد شہید بریلوی کے مرید اور خلیفہ تھے اور اپنی برگزیدگی اور دین داری میں پورے علاقے میں شہرت رکھتے تھے۔ سید امیر صاحب نے مولانا کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی اور انتہائی شفقت سے پیش آئے۔ سید صاحب ممدوح سے مولانا نے تبرکاً شرفِ بیعت بھی حاصل کیا۔ وہیں مولانا غلام رسول صاحب (قلعہ میہاں سنگھ والے) سے ملاقات ہوئی اور جلد ہی دونوں کے درمیان رشتۂ اخوت و

تعلق مودت استوار ہوگیا۔ سید امیر صاحب اس پر بے حد مسرت کا اظہار کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ آپ کی اس مودت و اخوت پر میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، آپس میں اسی قسم کا برتاؤ ہونا چاہیے تاکہ ایک کے دل سے دوسرے کے دل میں نور کی شعاع پہنچتی رہے۔ مولانا غلام رسول صاحب بھی سید امیر کے مرید اور ان سے بیعت تھے اور مولانا عبداللہ کی آمد سے پہلے سید صاحب کے ہاں مقیم تھے۔

حضرت سید امیر صاحب بہت ہی مہربان اور مشفق بزرگ تھے۔ جب تک حضرت عبداللہ صاحب وہاں رہے وہ ہمیشہ ان کی تسکینِ خاطر فرماتے رہے اور شروع سے آخر تک ایک ہی منہج اور دستور کے مطابق ان سے معاملہ قائم رکھا۔ اُنھوں نے مولانا عبداللہ غزنوی اور افغانستان کے امیر اور علما کے درمیان مصالحت کرانے کی بھی کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ دونوں فریقوں میں مسائلِ شرعیہ سے متعلق جو اختلافات پیدا ہوگیا ہے، رفع ہوجائے اور مولانا اپنے وطن غزنی واپس چلے جائیں۔ لیکن مولانا کی طبعی آہستہ روی اور اس باب میں عدم دلچسپی کی بنا پر تصفیہ و مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر افغانستان نے بھی مولانا کی طرف دستِ صلح بڑھانے کی کوشش کی تھی۔

اسی اثنا میں گرمی کا موسم آگیا۔ مولانا نے سید صاحب ممدوح سے سرد علاقے میں جانے کی اجازت طلب کی اور منگل تھانہ میں رہنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مولانا غلام رسول نے ہزارہ اور اس کے گرد و نواح میں قیام کرنے کا مشورہ دیا اور مولانا عبداللہ نے اس مشورے کو قبول فرمایا۔ سید امیر نے ان کو رخصت عطا کی، ان کا مقصد یہ تھا کہ سکندر پور (ہری پور، ہزارہ) کے باغ میں جو چھوٹی سی مسجد ہے، اس میں یہ حیات گل کے پاس رہیں اور ان کو تلقین کریں۔ چنانچہ مولانا وہاں گئے اور قیام پذیر ہوئے۔ وہاں اُن کو امیر افغانستان کا خط پہنچا کہ "آئندہ آپ جانیں اور افغانستان کے علما۔ ہم اس میں دخل نہیں دیں گے اور نہ آپ سے کچھ کہیں گے۔" اس خط کا مطلب بالکل ظاہر ہے اور وہ یہ کہ امیر افغانستان نے مولانا کے متعلق اپنا رویہ بدل لیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ مولانا

افغانستان واپس آ جائیں۔

امیر افغانستان کے نقطۂ نظر میں اس تبدیلی کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ ملک میں مولانا کے مریدین بہت بڑی تعداد میں موجود تھے اور وہ اس کو مجبور کرتے تھے کہ ان کو مراجعتِ وطن کی اجازت دی جائے اور جو پابندیاں اُن پر عائد کی گئی ہیں وہ ختم کی جائیں ــــ مولانا کابل کے امیر کا خط پڑھ کر پہلے تو وطن جانے کو تیار ہو گئے اور اس ارادے سے نوشہرہ تک چلے بھی گئے۔ لیکن دوسرے دن صبح کو ارادہ بدل گیا اور اپنے دوستوں سے فرمایا کہ یہاں سے ہم نے شاہ جہان آباد یعنی دہلی جانے کا عزم کر لیا ہے، کوئی شخص ہم کو اس سے نہ روکے۔

اب وہ نوشہرہ سے یکے میں سوار ہوئے اور ایک ہفتے میں لاہور پہنچے۔ لاہور میں کچھ عرصہ قیام کیا اور لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ان کی صحبت نہایت مؤثر تھی، جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی اور قلب میں عجز و انکسار کے دروازے کھول دیتی تھی۔

لاہور سے چلے تو امرتسر پہنچے۔ وہاں حافظ محمود کے پاس باغ والی مسجد میں قیام فرمایا اور اپنی توجہاتِ خاص سے غافل لوگوں کے دلوں سے بُرائی کا زنگ اتارا۔[۱۱۶]

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مرتبہ امرتسر کتنا عرصہ مقیم رہے، البتہ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ مہینے سے زیادہ عرصہ قیام رہا اور لوگوں کو وعظ و ارشاد سے مستفید فرمایا۔

اس سے آگے مولانا غلام رسول لکھتے ہیں:۔

امرتسر سے دہلی کا عزم کیا اور وہاں سے یکے میں سوار ہو کر آٹھ روز میں دہلی پہنچے۔ دہلی میں میاں سید نذیر حسین صاحب کے مدرسے میں گئے اور صحیح بخاری پڑھی۔[۱۱۷]

معلوم ہوتا ہے سوات سے لے کر دہلی تک کے اس تمام سفر میں مولانا غلام رسول صاحب ان کے ہم رکاب تھے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ درس بخاری میں وہ اُن

---

۱۱۶ مولانا غلام رسول، ص ۳۲، ۳۳

۱۱۷ ایضاً، ص ۳۳

کے ساتھ تھے۔

اس سے آگے لکھتے ہیں :

سید نذیر حسین بے تکلف آدمی تھے، اپنے کام کاج خود ہی کر لیتے تھے کسی قسم کا تصنع نہ فرماتے تھے۔اس لیے مولانا عبداللہ ان سے بہت خوش تھے۔[۱۱۸]

اس سے آگے تحریر فرماتے ہیں :

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی وجہ سے ہم لوگ زیادہ عرصہ سید نذیر حسین صاحب کے پاس دہلی میں نہ رہ سکے۔ مولانا عبداللہ کو اس پر بہت افسوس تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تھوڑی مدت مزید اقامت کا موقع مل جاتا تو بہت فائدے مرتب ہوتے، لیکن اب تو دہلی ویران ہوگئی اور لوگ بکھر گئے۔ دہلی سے راہ داری یعنی انگریزی حکومت سے تحریری اجازت لے کر نکلے تو امرتسر تشریف لائے اور حافظ محمود کی تربیت کرنے لگے۔ جب حافظ محمود کو اذکار میں بخوبی جمعیت حاصل ہوگئی، نماز میں حضورِ قلب ہونے لگا اور تلاوتِ قرآن میں ان کی استعداد کے مطابق سرور و لذت کی نعمت حاصل ہونے لگی تو ایک سال کے بعد امرتسر سے رخصت ہو کر اپنے وطنِ عزیز چلے گئے۔[۱۱۹]

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ امرتسر میں مستقل قیام سے قبل مولانا عبداللہ امرتسر سے پوری طرح واقف تھے۔ وہاں وہ دو دفعہ جا چکے تھے اور دونوں دفعہ لوگوں کو فائدہ پہنچایا اور نیکی کی ترویج و اشاعت کی تھی۔ ایک مرتبہ تو دہلی سے واپسی پر پورا ایک سال وہاں قیام کیا تھا، امرتسر کے لوگ ان سے متاثر تھے اور فیض حاصل کرتے رہے تھے۔ حافظ محمود صاحب تو ان کے باقاعدہ مرید تھے، بعض اور لوگ بھی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے افغانستان سے ہجرت کے بعد باقاعدہ سکونت کے لیے امرتسر کو ترجیح دی۔

---

[۱۱۸] مولانا غلام رسول، ص ۳۲

[۱۱۹] ایضاً۔

موضع خیر الدین میں مدتِ قیام

مولانا عبداللہ غزنوی کو جب آخری مرتبہ کابل کے قید خانے سے نکالا گیا تو ان کی پہلی منزل پشاور تھی، جہاں افغانستان کے سپاہی انھیں چھوڑ گئے تھے۔ پھر وہاں سے مختلف بلاد و قصبات میں سے گزرتے ہوئے بستی خیر الدین پہنچے۔ یہ گاؤں امرتسر سے سات کوس کے فاصلے پر جنوب مغرب میں ہے۔ مولانا کی آمد کے بعد اس گاؤں کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور مولانا سے فیض حاصل کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت ہر وقت وہاں موجود رہتی تھی۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کئی مہینے اس گاؤں میں مقیم رہے۔ وہ متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ انھوں نے دنیوی مال و دولت کے حصول کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس زمانے میں بالخصوص ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور وہ تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے ایک بیٹے کا اسمِ گرامی سید احمد غزنوی تھا۔ ایک تحریر سے پتا چلتا ہے کہ وہ باپ کی ہجرت کے بعد غزنی سے روانہ ہوئے تھے اور قریہ خیر الدین میں آکر ان سے ملے تھے۔ اس دور میں ان کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ زیادہ نہیں تو چند مہینے لازماً خیر الدین میں اس قافلۂ خیر و صلاح کا قیام رہا۔ مولانا سید احمد غزنوی فرماتے ہیں:۔

یاد دارم وقتے کہ در قریہ خیر الدین بخدمت والد صاحب از غزنی آمدہ بودم روزے خط محمد حسن خاں کہ برائے طلب احقر فرستادہ بود، پیش والد مرحوم عرض کردم کہ نام بردہ ایں خط برائے من ارسال داشتہ وگزارۂ من دراں سرزمین نہایت تنگ، اگر مرضئ والد باشد احقر ملازمت او اختیار کند۔ وگرنہ فصبر جمیل۔[۲۰۱]

یعنی مجھے یاد ہے کہ جب میں غزنی سے قریہ خیر الدین میں والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ایک دن محمد حسن خاں کا خط آیا۔ جس میں انھوں نے مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ میں یہاں نہایت تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ خط میں نے والد صاحب مرحوم

---

[۲۰۱] مکتوبات امام الزمان شیخ عبداللہ غزنوی علیہ الرحمۃ والغفران" ص ۸۲۔

کی خدمت میں پیش کیا کہ وہ اجازت دیں تو میں محمد حسن خاں کی ملازمت اختیار کر لوں اور اگر نہ اجازت دیں تو صبرِ جمیل کو اوڑھنا بچھونا بنا لوں۔

مولانا نے بیٹے کی اس گزارش پر دو تین روز غور کیا اور مراقبے کے بعد کچھ وصیت کی، لیکن ملازمت کی اجازت نہیں دی۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ علم و فقر کا یہ قافلہ کافی عرصہ خیر الدین میں قیام پذیر رہا — یہ عرصہ اگر سال بھر کو نہیں تو چند مہینوں پر ضرور محیط ہے۔ دوسرے یہ کہ ان دنوں یہ حضرات مالی لحاظ سے بہت تنگ دست اور پریشان تھے۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔

حکومت کابل کے اُمرا میں سے ایک امیر عالم گل خاں کہا کرتا تھا کہ مولانا عبداللہ کو جب ہدفِ ستم بنایا گیا وہ کبیر السن بھی تھے اور کمزور جسم بھی، لیکن نہایت صبر سے تکلیفیں برداشت کرتے تھے — اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے وقت مولانا کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔

امرتسر میں مستقل سکونت

امرتسر کے جو لوگ ان سے تعلق ارادت رکھتے تھے وہ انھیں موضع خیر الدین سے امرتسر لے گئے۔ وہاں جس مقام پر علم و تصوف کا یہ کارواں جا کر اُترا، اس نے محلہ غزنویہ کے نام سے شہرت پائی، جو مسجد تعمیر کی گئی وہ مسجد غزنویہ کہلائی اور جو مدرسہ قائم کیا گیا وہ مدرسہ سلفیہ غزنویہ کے نام سے موسوم ہوا — مولانا عبدالجبار غزنوی تحریر فرماتے ہیں کہ اس شہر کو مرکز بنا کر مولانا عبداللہ نے کتاب و سنت کی نشر و ترویج میں بے حد کوشش کی، توحیدِ الٰہی، اتباعِ سنت اور عقائد سے متعلق بہت سی کتابوں اور رسالوں کے فارسی اور اُردو زبان میں ترجمے کرا کے شائع کیے، جس سے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا[۱۲۱]۔

مولانا عبداللہ غزنوی اور ان کے فرزندانِ گرامی کے زمانے میں "جس قدر

---

[۱۲۱] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۲

خوش عقیدہ لوگ" اس شہر امرتسر میں موجود تھے، بقول مولانا عبدالجبار غزنوی کے "گمان نہیں کہ ہندوستان اور خراسان کے شہروں میں سے کسی شہر میں اس قدر خوش عقیدہ لوگ موجود ہوں، باوجودیکہ یہ شہر ہندوؤں اور کافروں کی قرارگاہ ہے۔[۱۲۲]

افغانی اصحابِ عقیدت کی آمد و رفت

مولانا کے پرپوتے جناب عثمان غزنوی صاحب نے ان سطور کے راقم کو اپنے بعض بزرگوں کے حوالے سے بتایا کہ جب یہ خانوادہ فضل و کمال غزنی سے ہجرت کر کے مستقل طور پر امرتسر آگیا تو افغانستان کے مختلف مقامات، غزنی کے گرد و نواح اور پشاور و ہزارہ وغیرہ کے بہت سے لوگ مولانا عبداللہ اور ان کے فرزندانِ عالی قدر کی خدمت میں آتے اور مستفیض ہوتے تھے۔ وہ لوگ پرانے واقعات بیان کرتے اور ان کے آبا و اجداد کی بہت سی باتیں سنایا کرتے تھے۔ کئی کئی دن وہ لوگ امرتسر رہتے اور مستفید ہوتے ــــ عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ امرتسر کے مقامی باشندے بھی افغانی اصحابِ عقیدت سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے اور نہایت شوق اور توجہ سے ان کی باتیں سنتے۔ وہ اس انداز سے اُن کے دردناک واقعات بیان کرتے کہ سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

عثمان غزنوی صاحب مولانا سید داؤد غزنوی مرحوم کے بھتیجے اور حافظ سلیمان غزنوی مرحوم کے بیٹے ہیں اور اپنے ان بزرگوں سے جو مولانا عبداللہ کے قریب العہد تھے، اُنھوں نے بہت سی باتیں سنی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا عبداللہ غزنوی کی وہاں تھوڑی بہت جائداد بھی تھی۔ اس کا کچھ حصہ ان کے بعد بعض عقیدت مندوں نے فروخت کر دیا تھا، اس کی رقم وغیرہ ادا کرنے کے لیے بھی وہاں سے لوگ ان کے ہاں آیا کرتے تھے۔ لیکن مولانا عبداللہ اور ان کے بیٹوں کو اس جائداد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

---

[۱۲۲] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۲

امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصانیف سے شغف

مولانا عبداللہ غزنوی کے فرزندِ گرامی مولانا عبدالجبار غزنوی تحریر فرماتے ہیں کہ میرے والد مکرم حضرت عبداللہ غزنوی کا یہ معمول تھا کہ:

از دیادِ ہدایت کے لیے ہمیشہ ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور اس کے آگے گریاں و نالاں رہتے۔ یوں سمجھیے کہ ان کا تمام جسم اللہ کی طرف راغب تھا اور وہ اس سے خوف و خشیت کی مکمل تصویر تھے۔ کتب محققین محدثین کی طلب میں بہت حریص تھے۔ بالخصوص امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی تصانیف کے طلب و مطالعہ کے بے حد شائق تھے۔ ہر صورت میں ان کی تصانیف حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ان کے مطالعہ سے کبھی سیر نہ ہوتے۔ ان دونوں سے ان کو بہت ہی تعلقِ خاطر تھا۔ ان کو اکثر اہلِ علم پر فضیلت دیتے اور فرماتے کہ شاہ ولی اللہ کی نسبت ان سے ایسی ہے جیسی علمائے خراسان کی شاہ ولی اللہ سے ہے۔ امام ابن تیمیہ کی فضیلت میں فرمایا کرتے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ جس دن نور تقسیم ہوا، ابن تیمیہ کو نور کا ایک بڑا حصہ ملا۔ امام ابن تیمیہ کی تصنیف "زاد المعاد" سے بالخصوص انھیں پیار تھا، اُسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی سعی فرماتے۔ پورے انہماک سے اس کا مطالعہ کرتے اور اللہ سے دُعا کرتے کہ یا ارحم الراحمین زاد المعاد کو میرے لیے توشۂ آخرت بنا۔[۱۲۳]

قبولیتِ دُعا

مولانا ممدوح مستجاب الدعوات تھے اور اللہ تعالیٰ اُن کی دُعا کو قبولیت بخشتا تھا۔ اس ضمن میں مولانا عبدالجبار غزنوی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ آپ کی دُعا قبول کرنے میں اس قدر جلدی فرماتا، یہاں تک کہ مستجاب الدعوات ہونا آپ کا ہندوؤں میں بھی مشہور تھا۔ آخر الامر اللہ تعالیٰ کی ولایت سے جس کے ساتھ وہ متوکلوں کو خاص کرتا ہے اور اندھیروں سے نکال کر ان کو نور میں لاتا ہے، صوفیا کے تمام مشاغلِ مستحدثہ کو ترک کرکے

---

[۱۲۳] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۴۔

ان کو بدعت کہنے لگے ، کل بدعة ضلالة کے مضمون کے مطابق۔[۱۲۴]

بلاشبہ حضرت عبداللہ غزنوی ولیِ کامل تھے۔ تمام امور سے منقطع ہو کر انھوں نے فقط اللہ سے رشتہ قائم کر لیا تھا۔ اُٹھنا بیٹھنا ، چلنا پھرنا ، قول و فعل ، میل جول سب اللہ کے حکم کے تابع تھا۔ وہ بہت بڑے صوفی تھے ، لیکن صوفیا کے ایک گروہ نے جو بدعات و محدثات اختیار کر رکھی ہیں ، ان سے انھیں شدید نفرت تھی۔ ان کا تصوف مبنی بر کتاب و سنّت تھا اور ان کی ولایت احکامِ الٰہی اور فرامینِ رسُول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم آہنگ تھی۔ ان کی قبولیتِ دُعا کی اصل وجہ یہی تھی کہ ان کا معاملہ براہِ راست اللہ سے تھا اور جو بات دل سے نکلتی تھی وہ اپنے اندر خلوص اور للّٰہیت رکھتی تھی۔

تلاوتِ قرآن اور ادعیہ ماثورہ

زیادہ تر تلاوتِ قرآن مجید میں مصروف رہتے یا ان دُعاؤں کا ورد کرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اور ادعیہ ماثورہ کہلاتی ہیں۔ زندگی کے ابتدائی دور میں وہ شاید ایسے وظائف بھی پڑھتے ہوں گے ، جو حدیث رسُول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود نہیں ہیں لیکن صوفیا سے منقول ہیں۔ مگر بعد میں یہ سب چیزیں ترک کر دی تھیں۔ اور فقط قرآن مجید کی تلاوت اور مسنون دعاؤں کو اپنا معمول قرار دے لیا تھا ۔۔۔ مولانا عبدالجبار غزنوی فرماتے ہیں :۔

مولوی عبداللہ ساکن قلعہ (میہاں سنگھ) نے جو غلام رسول کے نام سے مشہور رہی ، آپ کے حالات و واردات چند ورق میں لکھے ہیں۔ ایک دن وہ رسالہ آپ کے پاس ایک شخص پڑھ رہا تھا۔ اس رسالے کے آخر میں آپ نے یہ چند حرف اپنے ہاتھ سے لکھے۔

"در آخر ہمہ اشغال را ترک کردند بجز تلاوت کلام اللہ و ادعیۂ ماثورہ ، و از بدعت احترازی کرد خواہ بدعت اصلی باشد یا وصفی"۔[۱۲۵]

---

۱۲۴ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی ، ص ۲۵

۱۲۵ ایضاً ،

یعنی بعد میں تمام اشغال کو ترک کر دیا تھا اور بجز تلاوتِ قرآن اور مسنون دعاؤں کے اور کوئی مشغلہ نہ رہا تھا۔ امورِ بدعت سے کلیتہً احتراز کرتے، خواہ وہ بدعت اصلی ہو یا وصفی۔

سخاوت وجودت

نہایت سخی اور کھلے دل کے مالک تھے۔ دنیا کے مال وزر کو کوئی اہمیت نہ دیتے۔ سیکڑوں روپے ان کے پاس آتے، لیکن جس وقت آتے، اسی وقت لوگوں میں بانٹ دیتے۔ چونکہ بہت زیادہ سخاوت اور دریا دلی کا مظاہرہ فرماتے، اس لیے یتیم اور مسکین نہایت بے تکلفی سے روپیہ طلب کرتے۔ جس وقت کوئی رقم آپ کے پاس ہوتی، مستحق لوگ آپ کے ہاتھ اور دامن سے فوراً کھینچ لے جاتے۔ ان کی اس بے تکلفی اور دلیری پر آپ مسکرا دیتے، کسی کو کچھ نہ کہتے۔ جن لوگوں کو کچھ نہ ملتا وہ آپ کی جیبیں ٹٹولتے اور ہاتھ اور رومال وغیرہ کی تلاشی لیتے کہ شاید کچھ مل جائے۔ آپ ہنستے اور مسکراتے ہوئے ان کو کپڑے اور جیبیں ٹٹولنے کا پورا موقع دیتے۔ مستحقین سے کہتے کہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہی، سب کچھ تقسیم کر دیا گیا ہے، پھر کچھ آیا تو ان شاء اللہ تمھیں ضرور دیا جائے گا۔[۱۲۶]

عفو ودرگزر

کسی سے کوئی عداوت اور دشمنی نہ رکھتے۔ کوئی شخص اگرچہ کتنی بھی تکلیف پہنچاتا، اسے فوراً معاف کر دیتے۔ عفو ودرگزر ان کا شیوہ تھا۔ مولانا قاضی عبدالاحد خان پوری بہت بڑے عالم اور ان کے مرید تھے، انھوں نے ایک دن درخواست کی کہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ایمان واستقامت عطا فرمائے۔ فرمایا، میں اس شخص کے لیے بھی دعا کرتا ہوں، جو کابل میں نہایت سختی سے مجھ کو مارتا پیٹتا تھا، میں اللہ سے اس کے لیے التجا کرتا ہوں کہ اے اللہ اس کو معاف فرما اور جنت میں داخل کر، کیونکہ وہ

---

[۱۲۶] مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۳۔

جاہل تھا، کوئی بات جانتا نہ تھا۔ مولانا عبدالاحد خان پوری سے فرمایا: جب اپنی جان کے دشمنوں کے ساتھ میرا یہ رویہ ہے اور ان کے لیے دعا کرتا ہوں تو آپ کے لیے کیوں نہ کروں، ضرور کروں گا۔

فرمایا میرے دل سے بے اختیار تمام مسلمانوں کے لیے دعا نکلتی ہے۔ آدم سے لے کر اب تک میں سب کے لیے دعا گو ہوں۔ میں اُن کافروں کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرتا ہوں جو زندہ ہیں۔

فرمایا کرتے کہ جن لوگوں نے مجھے مختلف قسم کی تکلیفیں پہنچائیں اور گوناگوں آلام میں مبتلا کیا، میں نے ان سب کو معاف کر دیا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری وجہ سے کسی کو نہ پکڑے۔

جب علمائے سوء اور ارکانِ حکومت آپ کی زدوکوب اور تشہیر سے فارغ ہوئے اور آپ کو بیٹوں سمیت قید خانے میں لے گئے تو بعض احباب نے کہا کہ اس زدوکوب کا کچھ علاج کرنا چاہیے ورنہ آپ کی جان کا خطرہ ہے۔ لیکن جب کپڑا اُٹھا کر پشت کو دیکھا گیا تو نہ کوئی جگہ سُرخ ہوئی تھی اور نہ مار پیٹ کا کوئی نشان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چوٹ نہیں لگی۔

فرماتے تھے کہ گرفتاری کے بعد کابل کے ایک بہت بڑے پہلوان کو مجھے زدوکوب کرنے کے لیے مقرر کیا گیا، وہ نہایت زور سے مارتا تھا، کیونکہ اسے اسی کام پر مامور کیا گیا تھا، لیکن مجھے قطعاً کوئی احساس نہ تھا کہ وہ مار رہا ہے یا نہیں مار رہا ہے۔

اُمرائے کابل میں سے ایک امیر کا نام عالم گل خاں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مجھے اسی واقعہ کی وجہ سے ان کے ولی ہونے کا کامل یقین ہو گیا۔ جس قدر مار انھیں پڑی ہے اور جو بے پناہ سختی ان پر کی گئی ہے، اگر میرے ہاتھی پر کی جاتی اور اُسے اس بے دردی سے مارا جاتا تو بخدا وہ ہلاک ہو جاتا۔ لیکن اس شخص کو باوجود اس قدر جسمانی ضعف اور کبر سنی کے کچھ نہیں ہوا[۱۲۷]۔ بہرحال آپ نے ان سب لوگوں کو معاف کر دیا۔

۱۲۷ـ مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۰

وفات

مولانا عبداللہ غزنوی نے ۱۵ ربیع الاوّل ۱۲۹۸ھ (۱۸۷۹ء) کو منگل کی آدھی رات کے وقت وفات پائی اور بُدھ کے روز زوالِ آفتاب کے بعد نمازِ ظہر سے پہلے دفن کیے گئے۔ بہت بڑی کثرت کے ساتھ لوگوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ انسانوں کا اس قدر ازدحام تھا کہ بازار بند ہو گئے تھے۔ ہر طبقہ وخیال کے لوگ کثیر تعداد میں شریکِ جنازہ تھے۔ غریب، امیر، رئیس، علما سب موجود تھے اور جنازے کو اُٹھانا اور کندھا دینا ہر ایک کے لیے ممکن نہ رہا تھا ـــ مولانا عبدالجبار غزنوی لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کے اس قول کی سچائی کا اس دن پتا چلا کہ الفرق بیننا و بین اھل البدع یوم الجنائز یعنی ہمارے اور اہلِ بدعت کے درمیان فرق جنازوں کے دن معلوم ہوتا ہے۔

کئی دن لوگ ان کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھتے رہے اور روتے اور آنسو بہاتے رہے۔ ہندوستان کے اکثر شہروں میں اُن کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ ان کا مرقد امرتسر میں دروازہ سلطان ونڈ کے باہر عبدالصمد کاشمیری کے تالاب کے کنارے ہے[۱۲۸]

اولاد

مولانا عبداللہ غزنوی کے بارہ بیٹے اور پندرہ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں:
(۱) مولانا محمد (۲) مولانا عبداللہ (۳) مولانا احمد (۴) مولانا عبدالجبار (۵) مولانا عبدالواحد (۶) مولانا عبدالرحمٰن (۷) مولانا عبدالستار (۸) مولانا عبدالقیوم (۹) مولانا عبدالعزیز (۱۰) مولانا عبدالحی (۱۱) مولانا عبدالقدوس (۱۲) مولانا عبدالرحیم ـــ ان میں سے بعض کے نام آپ نے مختلف اوقات میں خط بھی لکھے اور وصیتیں بھی تحریر کیں۔ یہ تمام حضرات اپنے وقت کے جلیل القدر عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم پر عبور رکھتے تھے، بعض اہم کتابوں کے مصنف، مترجم اور

---

[۱۲۸] ملاحظہ ہو سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی ص ۲۳، ۲۴

شارح تھے۔ ان حضرات نے بہت سی عمدہ کتابیں شائع کیں۔ دین داری اور تقوے میں ممتاز تھے۔ ان کے جو حالات میسّر آسکے، وہ چودھویں صدی ہجری کے فقہائے برِصغیر میں کتاب کے اصل مقام پر بیان ہوں گے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

مولانا عبداللہ غزنوی کے مکتوبات میں ان کی بعض بیٹیوں کے نام بھی مرقوم ہیں۔ اُنھوں نے بیٹوں کے ساتھ بیٹیوں کو بھی خط تحریر فرمائے۔ ان میں سے جن قابلِ احترام خواتین کے نام معلوم ہو سکے ہیں، وہ یہ ہیں:۔

(۱) فاطمہ (۲) مریم (۳) امۃ اللہ (۴) امۃ الغفار (۵) امۃ الرحیم (۶) امۃ الحمید (۷) امۃ الوہاب (۸) امۃ الفتاح۔

بھائی اور والدہ

مولانا غزنوی کے بھائی بھی تھے۔ بھائیوں میں سے صرف دو کے نام معلوم ہو سکے ہیں، جن کے نام انھوں نے خطوط بھی ارسال کیے ہیں اور وہ ہیں عبدالعظیم اور عبدالخالق ——— والدہ ماجدہ کے نام بھی اُنھوں نے خطوط لکھے۔ یہ خطوط فارسی میں ہیں اور نہایت نصیحت آموز ہیں۔ اندازِ بیان واعظانہ اور ناصحانہ ہے۔ ان میں ادب کی چاشنی بھی ہے اور تصوّف کا رنگ بھی۔ ان کے خطوط ایک مستقل مضمون کے متقاضی ہیں۔ یہ خط اُنھوں نے اپنے زمانۂ قید اور جلا وطنی میں لکھے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کی عورتیں اور مرد سب پڑھے لکھے اور متقی و متدین تھے۔

بیٹوں کی اولاد

مولانا عبداللہ غزنوی کے چار بیٹوں مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبدالستار، مولانا عبدالحئی اور مولانا عبدالقدوس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ لاولد ہی اس دنیا سے تشریف لے گئے ——— باقی بیٹوں کی اولادیں اس طرح ہیں:۔

۱۔ مولانا محمدؒ کے دو بیٹے نام اور کام میں بہت مشہور ہیں ——— مولانا عبدالاوّل غزنوی اور مولانا عبدالغفور غزنوی۔

۲۔ مولانا احمد کے بھی دو بیٹے تھے۔ حکیم عبدالشافی اور مولانا عبدالوارث۔

۳ - مولانا عبداللہ بن عبداللہ کی اولاد سے ایک بزرگ حافظ عبداللہ غزنوی تھے، جو اسلامیہ کالج پشاور میں پروفیسر تھے۔

۴ - مولانا عبدالجبار غزنوی کے بیٹوں کے نام یہ تھے: مولانا احمد علی، مولانا عبدالستار، مولانا محمد داؤد، مولانا عبدالغفار اور حافظ محمد سلیمان۔

۵ - مولانا عبدالواحد غزنوی کے صاحبزادوں کے نام یہ تھے: مولانا محمد اسماعیل غزنوی، مولانا عبدالحمید، مولانا ابراہیم اور مولانا عبدالوالی۔

۶ - مولانا عبدالعزیز کے بیٹے مولانا عبدالاعلیٰ تھے۔

۷ - مولانا عبدالرحیم غزنوی کے بیٹوں کے نام یہ تھے: مولانا یحییٰ، مولانا ہارون، مولانا عیسیٰ، حافظ زکریا، مولانا موسیٰ، مولانا احمد اور مولانا نوح۔

پھر آگے چل کر مولانا کے پوتوں اور پڑپوتوں کی اولادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے لیکن اس خاندان کے علما سے نیکی اور تدین کا جو ایک خاص تصور ابھرتا تھا، اب ختم ہو گیا ہے۔ مولانا داؤد غزنوی مرحوم اس خاندان کے مختلف افراد کے درمیان نقطۂ اتصال تھے۔ ان کی زندگی میں دودمانِ غزنویہ کے سب لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، خود وہ بھی ان کے ہاں تشریف لے جاتے تھے، لیکن ان کی وفات کے بعد یہ رابطہ ٹوٹ گیا۔ وہ اس سلسلے کی آخری کڑی تھے۔

مولانا عبدالرحیم اور مولانا عبدالواحد دونوں بھائیوں کی تجارت کے سلسلے میں عرب کے بعض علاقوں میں آمد و رفت تھی۔ اس ضمن میں وہ کویت گئے تو وہاں نجد و حجاز کے والی سلطان عبدالرحمٰن اور ان کے بیٹے سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان دنوں کویت میں مقیم تھے اور نجد پر حملے کی تیاری کر رہے تھے۔ غزنوی برادران سے ان باپ بیٹوں نے کچھ تعلیم بھی حاصل کی، نجد کی فتح کے بعد اپنے ہاں ان کو درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرنے کی بھی دعوت دی، چنانچہ یہ بزرگ تقریباً پانچ سال وہاں رہے اور خاندانِ سعود کے بعض افراد اور اہلِ نجد ان سے مستفید ہوئے۔

اس اثنا میں امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی بعض قلمی کتابیں بھی ان کی وساطت

سے برصغیر میں پہنچیں جو یہاں کے ناشروں اور خاندانِ غزنویہ کے علما نے شائع کیں۔ مولانا اسماعیل اور مولانا داؤد غزنوی کی زندگی تک آلِ سعود سے ان کے تعلقات کسی نہ کسی شکل میں قائم رہے۔

علمائے غزنویہ کی تصنیفی اور اشاعتی خدمات

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ جب افغانستان سے ہجرت کر کے وارد ہند ہوئے، ان کے بارہ بیٹے اور پندرہ بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹے کا نام باپ نے اپنے نام پر عبداللہ رکھا تھا۔ ہجرت کے وقت ان میں سے اکثر ان کی رکاب میں یہاں پہنچے۔ بعض کو یہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی اور وہ اس ملک میں آنے کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے۔ یہ سب حضرات قرآن و حدیث کے بھی عالم تھے اور طریقت و سلوک کی منزلوں سے بھی پوری طرح آشنا تھے۔ ان میں سے جن بزرگوں کے جو حالات فراہم ہو سکے، کتاب کے اصل مقام پر بیان ہوں گے۔ ان شاء اللہ العزیز — یہاں اس دودمانِ عالی قدر کے معزز ارکان کی تصنیفی خدمات بیان کرنا مقصود ہے۔ اس فہرست میں ان کی وہ خدمات بھی شامل ہیں جو انھوں نے اہم کتابوں کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں انجام دیں۔ یہ معلومات مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف سے حاصل ہوئی ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ تفسیر جامع البیان مع حاشیہ: جامع البیان قرآن مجید کی مشہور تفسیر ہے اور اہلِ علم میں متداول ہے۔ اس کا حاشیہ مولانا عبداللہ غزنوی کے سب سے بڑے صاحبزادے مولانا محمد غزنوی نے لکھا۔ یہ تفسیر مع حاشیہ مولانا محمد غزنوی ۱۸۹۲ء میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی — اس تفسیر کے ساتھ مندرجہ ذیل تیرہ کتابیں پہلی دفعہ چھپیں:

- اکلیل فی استنباط التنزیل: امام جلال الدین سیوطی۔
- مفحمات الاقران فی مبہمات القرآن: امام جلال الدین سیوطی
- تفسیر سورۃ النور: امام ابن تیمیہ
- فوائد شتّٰی: تفسیر کے سلسلے کے مختلف علمی فوائد
- خاتمۃ الطبع المشتملۃ علی الفوائد المبہمہ:

• فوائد شریفیہ :- امام ابن تیمیہ
• فتیا فی مسئلہ" کلام اللہ تعالیٰ : امام ابن تیمیہ
• کتاب الرد علی الجھمیۃ : امام احمد بن حنبل
• رسالہ فی القرآن : امام ابن تیمیہ
• قاعدۃ فی القرآن : امام ابن تیمیہ
• الفوز الکبیر فی اصول التفسیر : شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
• احادیث التوحید ورد الشرک :
• اسباب الاحتراز من الشیطٰن :

۲۔ حمائل غزنویہ : یہ وہ حمائل غزنویہ ہے جس کے ترجمہ وحواشی نواب وحید الزمان خاں کے تحریر فرمودہ ہیں۔ یہ حمائل مولانا محمد غزنوی کے صاحب زادے مولانا عبد الاول غزنوی نے مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے شائع کی۔

۳۔ حمائل غزنویہ : یہ وہ حمائل غزنویہ ہے جس کا ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کا ہے اور فوائد سلفیہ اور حواشی مولانا عبد الاول غزنوی کے ہیں۔ سب سے پہلے مولانا عبد الغفور بن مولانا محمد غزنوی نے امرتسر سے شائع کی اور پھر کئی دفعہ چھپی۔ اس حمائل غزنویہ نے اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر بڑی شہرت پائی اور بہت مقبول ہوئی۔ اب نایاب ہے۔

۴۔ مصفّٰی مع مسوّٰی : یہ دو کتابیں ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیف کردہ ہیں اور موطا امام مالک کی شرحیں ہیں۔ مسوّٰی فارسی میں ہے اور مصفّٰی عربی میں ـــ یہ دونوں شرحیں ایک ساتھ پہلی مرتبہ مولانا محمد غزنوی نے دہلی سے شائع کیں۔

۵۔ کشف المغطا : یہ موطا امام مالک کا اردو ترجمہ ہے جو نواب وحید الزمان خان مرحوم نے کیا۔ اسے پہلی دفعہ مولانا محمد غزنوی نے مطبع مرتضوی دہلی سے شائع کیا۔

۶- ریاض الصالحین : حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے ایما سے پہلی دفعہ لاہور سے شائع ہوئی اور اس کا اردو ترجمہ مولانا ممدوح کے ایک مرید مولانا احمد الدین کومری نے کیا۔ "کوم" ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) میں ایک گاؤں ہے۔ یہ ریاض الصالحین کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔

۷- مشارق الانوار : یہ حدیث کی مشہور کتاب ہے اور امام حسن بن محمد صغانی لاہوری (متوفی ۶۵۰ھ) کی تصنیف ہے۔ کسی زمانے میں یہ باقاعدہ نصاب درس میں شامل تھی۔ پہلی مرتبہ مع ترجمہ تحفۃ الاخیار کے علمائے غزنویہ نے شائع کی۔

۸- ایقاظ ھمم اولی الابصار : از فلانی۔ یہ کتاب ردِ تقلید سے متعلق ہے۔ مولانا عبداللہ غزنوی کے ایما پر میاں عبدالعزیز مرحوم بار ایٹ لا کے والد مکرم مولوی الٰہی بخش مرحوم کے خرچ سے پہلی دفعہ لاہور میں چھپی۔

۹- ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح : مشکوٰۃ کا اردو ترجمہ مولانا عبدالاوّل غزنوی نے کیا۔ کئی بار چھپا اور بہت مقبول ہوا۔

۱۰- نصرۃ الباری ترجمہ صحیح بخاری : مولانا عبدالاوّل غزنوی نے نصرۃ الباری کے نام سے صحیح بخاری کا اردو ترجمہ مع حواشی کے شروع کیا تھا۔ صرف آٹھ پارے مکمل ہو سکے۔

۱۱- انعام المنعم ترجمہ صحیح مسلم : مولانا عبدالاوّل غزنوی نے صحیح مسلم کا اردو ترجمہ انعام المنعم کے نام سے شروع کیا تھا۔ اس کا صرف ایک پارہ چھپا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ترجمہ مکمل ہو گیا تھا یا نہیں۔

۱۲- اجتماع الجیوش الاسلامیہ علی غزو المعطلات الجھمیہ : یہ امام ابن قیم کی تصنیف ہے۔ پہلی مرتبہ مولانا عبدالغفور و عبدالاوّل غزنوی نے مطبع القرآن والسنہ امرتسر سے شائع کی۔

۱۳- رسالہ الحقیقۃ والمجاز : یہ ابن امام تیمیہ کا رسالہ ہے جو پہلی دفعہ مولانا عبدالغفور

مولانا عبدالاوّل غزنوی نے شائع کیا۔

۱۴۔ جلاء الافہام فی الصلوٰۃ والسلام علی خیر الانام: امام ابن قیّم کی تصنیف ہے۔ مولانا عبدالغفور و عبدالاوّل غزنوی نے مولانا عبدالقدوس بن مولانا عبداللہ غزنوی کی کوشش سے پہلی مرتبہ مطبع القرآن والسنہ امرتسر سے شائع کی۔

۱۵۔ شرح حدیث النزول: امام ابن تیمیہ کی تصنیف ہے۔ اسے پہلی دفعہ مولانا عبدالغفور و عبدالاوّل غزنوی نے مطبع القرآن والسنہ امرتسر سے شائع کیا۔

۱۶۔ شرح خمسین:۔ ابن رجب حنبلی کی تصنیف ہے۔ مولانا عبدالغفور و عبدالاوّل غزنوی نے پہلی مرتبہ امرتسر سے شائع کی۔

۱۷۔ تحفۃ العراقیہ فی الاعمال القلبیہ: امام ابن تیمیہ کی تالیف ہے۔ مولانا عبدالغفور و عبدالاوّل غزنوی نے پہلی مرتبہ امرتسر سے شائع کی۔

۱۸۔ فتوی الحمویہ: اس کے مصنف بھی امام ابن تیمیہ ہیں۔ اسے بھی پہلی مرتبہ امرتسر سے مولانا عبدالغفور و عبدالاوّل غزنوی نے شائع کیا۔

۱۹۔ مجموعہ البیان المبدی لشناعۃ القول المجدی: علامہ سلیمان بن سحمان نجدی اس کے مصنف ہیں۔ اسے بھی مولانا عبدالغفور و عبدالاوّل غزنوی نے پہلی دفعہ امرتسر سے شائع کیا۔

۲۰۔ مجموعۃ التوحید النجدیہ و مجموعۃ الحدیث النجدیہ: اسے بھی پہلی مرتبہ علمائے غزنویہ نے مطبع انصاری دہلی سے شائع کیا۔

۲۱۔ فتح المجید شرح کتاب التوحید: یہ کتاب مولانا عبدالغفور و عبدالاوّل غزنوی نے پہلی مرتبہ شائع کی۔

۲۲۔ فتح اللہ الحمید المجید شرح کتاب التوحید: یہ کتاب مولانا عبدالغفور و عبدالاوّل غزنوی کے اہتمام میں پہلی دفعہ مطبع القرآن والسنہ امرتسر سے اشاعت پذیر ہوئی۔

۲۳۔ اثبات علو الرب ومباینتہ عن الخلق :۔ یہ حضرت امام مولانا عبد الجبار غزنوی کی تصنیف ہے اور عربی میں ہے۔

۲۴۔ اثبات الالہام والبیعۃ :۔ یہ بھی مولانا عبد الجبار غزنوی کی تصنیف ہے اور اردو میں ہے۔

۲۵۔ اعانۃ الملت الاسلامیہ : مولانا عبد الجبار غزنوی کا یہ رسالہ اُردو میں ہے اور کفار کی ملازمت کے عدم جواز سے متعلق ہے۔

۲۶۔ الاربعین بان ثناء اللہ لیس علی مذھب المحدثین :۔ یہ بھی مولانا عبد الجبار غزنوی کا رسالہ ہے اور عربی میں ہے۔ اس میں ان چالیس مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے، جن کی تعبیر میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم نے اسلاف کے متعین کردہ خطوط سے مختلف زاویۂ فکر کا اظہار کیا ہے۔ یہ رسالہ ان مباحث پر محیط ہے جو علمائے غزنویہ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے درمیان کسی زمانے میں موضوعِ گفتگو رہے ہیں۔

۲۷۔ معارج الوصول بان الاصول والفروع مبیّنۃ الرّسول :۔ یہ حضرت مولانا عبد الواحد غزنوی مرحوم کا رسالہ ہے۔

۲۸۔ تحشیہ دارمی : حضرت مولانا عبد اللہ غزنوی کے لائق فرزند مولانا عبد الرحیم غزنوی نے حدیث کی مشہور کتاب سنن دارمی پر عربی میں حاشیہ لکھا تھا۔ افسوس ہے یہ حاشیہ گم ہو گیا، اس کا آخری حصہ البتہ قلمی صورت میں موجود ہے۔

مولانا عبد اللہ غزنوی کے سوانح حیات

مولانا عبد اللہ غزنوی کے سوانح حیات ان کے دَور کے دو جیّد علمائے کرام نے قلم بند کیے۔ ایک ان کے فرزندِ نام دار مولانا عبد الجبار غزنوی نے اور ایک ان کے مریدِ خاص مولانا غلام رسُول قلعہ میہاں سنگھ والا نے۔ یہ دو الگ الگ سوانح حیات ہیں، اگرچہ بہت مختصر ہیں، تاہم ان میں خاصا مواد موجود ہے۔ ان کے علاوہ مولانا غزنوی کے مکتوبات اور ملفوظات بھی ہیں، پھر ان کے مرشد ملا حبیب اللہ قندھاری

کے ملفوظات بھی قلمی صورت میں موجود ہیں۔ مولانا سید داؤد غزنوی مرحوم چاہتے تھے کہ ان سب کو سامنے رکھ کر حضرت عبداللہ غزنوی کی ایک مفصل سوانح عمری مرتب کی جائے۔ اس کے لیے اُنھوں نے ان سطور کے راقم سے مشورہ کیا تو میں نے مولانا غلام رسول مہر کا نام تجویز کیا اور عرض کیا کہ یہ ان کا خاص موضوع ہے، دوسرا کوئی شخص ان سے بہتر سوانح عمری نہیں لکھ سکے گا۔ اس دور کے افغانستان اور ہندوستان کے سیاسی اور علمی کوائف اور مولانا کے معاصرین کا تذکرہ نہایت ضروری ہے اور یہ مہر صاحب ہی ضبط تحریر میں لا سکتے ہیں۔ مولانا نے میری اس تجویز سے اتفاق فرمایا اور مجھے مہر صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ میں نے مہر صاحب سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں اس ضمن میں ضروری مشورے کے لیے مولانا کے پاس آؤں گا۔ مولانا نے اس اثنا میں میری معرفت ملفوظاتِ حبیب اللہ قندھاری (قلمی) بھی خرید لیے تھے۔ بہر حال میں نے مولانا کو بتایا کہ مہر صاحب کسی روز آپ کے ہاں آئیں گے تو فرمایا کہ میں خود جا کر ان سے بات کروں گا۔ اس کا علم مولانا کے صاحبزادے مولانا ابوبکر غزنوی کو ہوا تو اُنھوں نے کہا کہ میں خود حضرت عبداللہ غزنوی کی سوانح عمری لکھوں گا۔ مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تصنیف و تالیف کا کام بہت مشکل اور انتہائی نازک ہے۔ ہر شخص اسے کما حقہ انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے خاص ذہن کا حامل ہونا ضروری ہے۔ مہر صاحب ہی اس کام کے لیے موزوں ترین آدمی ہیں۔ اس سے کچھ عرصہ بعد (۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو) مولانا وفات پا گئے اور جو مواد اُنھوں نے جمع کیا تھا، وہ ابوبکر صاحب کے قبضے میں چلا گیا، اور کوئی کام نہ ہو سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مواد کو جو مولانا عبداللہ غزنوی کے سلسلے میں دستیاب ہے، بُنیاد بنا کر ان کی ایک مفصل سوانح عمری معرضِ تحریر میں آ سکتی ہے۔

برِصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش وہ خطۂ زمین ہے جس میں بے شمار علما و فقہا اور مشائخ و صوفیا پیدا ہوئے یا کسی اور ملک سے نقلِ مکانی کر کے یہاں آئے اور پھر اسی کو اپنا مستقر قرار دے لیا۔ اُنھوں نے یہاں بے پناہ خدمات انجام دیں۔

بعض نے درس و تدریس کے حلقے قائم کیے، بعض نے تصوف و طریقت کی مسندیں بچھائیں، بعض تصنیف و تالیف میں مصروف ہوئے اور بعض نے وعظ و تقریر کو تبلیغ دین کا ذریعہ بنایا۔ ان بزرگانِ عالی مرتبت میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، شیعہ ہر مسلکِ فقہی کے اہل علم موجود تھے، مگر احناف کی تعداد زیادہ تھی۔ یہ اپنے وقت کے جلیل القدر لوگ تھے لیکن افسوس ہے ان میں سے بہت سے حضرات کے حالات محفوظ نہیں کیے گئے اور ان کی سرگرمیوں اور نتیجہ کاوشوں کو ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا لائق فخر ماضی بے خبری کی دبیز تہوں میں دفن ہو گیا ہے۔ مولانا عبداللہ غزنوی اس قطعۂ زمین کی نادرۂ روزگار شخصیت تھے علم و کمال، تدین و تقویٰ، تصوف و سلوک اور اعتدال و توازن میں مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن ہماری علمی تاریخ کا یہ ایک المیہ ہے کہ ان کے حالات زیادہ تفصیل سے نہیں ملتے، اور تو اور ان کے موجودہ اخلاف بھی ان سے بے خبر ہیں۔

تعلقات کا پیمانہ

مولانا عبداللہ غزنوی اور ان کے فرزندانِ گرامی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور یہی ان کا شعار اور یہی ان کی پہچان تھی۔ وہ بہت بارعب، خوب رو، وجیہ اور حسین و جمیل لوگ تھے۔ علم و فضل اور فہم و فراست کی دولت سے بھی اللہ نے ان کو خوب نوازا تھا۔ للہیت، خوفِ خدا اور تقوے کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔ عزت و تکریم سے بھی حصۂ وافر عطا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود نہایت منکسر اور متواضع تھے۔ ان سے برصغیر کے بعض نوابوں اور رئیسوں نے رشتے داریاں قائم کرنے کی کوشش کی، اونچے اونچے خاندان ان سے تعلقات مناکحت پیدا کرنے کے لیے مساعی ہوئے مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ نہ کسی دولت مند کو لڑکی دی اور نہ کسی امیر کے گھر اپنے کسی بیٹے کی شادی کی۔ شادی اور نکاح کے سلسلے میں ان کا صرف ایک ہی معیار تھا، اور وہ تھا تقویٰ، نیکی اور صالحیت۔ ذات پات یا دنیا کے مال و دولت کو اس باب میں ان

ہاں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ جو شخص ان کے نزدیک ان اوصاف کا حامل ہوتا، اس سے رشتے داری قائم کر لیتے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی ہے اور لطیفہ بھی کہ مولانا امام عبدالجبار غزنوی کے مدرسے امرتسر میں ایک صاحب مولانا محمد حسین ہزاروی تھے، جن میں دنیوی وجاہت کی کوئی بات بھی نہ تھی، البتہ نیک اور عالم آدمی تھے۔ ایک دن امام صاحب نے ان سے فرمایا، مولوی محمد حسین! آج عصر کے بعد میں تجھ سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا چاہتا ہوں، اگر تم اس پر راضی ہو تو یہیں مسجد میں رہنا۔ مولانا محمد حسین کے لیے یہ بات بالکل خلافِ توقع تھی، وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ امام صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر وہ کانپنے لگے اور ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ امام صاحب نے تسلی دی اور فرمایا، گھبراؤ نہیں، عصر کے بعد اسی مسجد میں یہ سنّت پوری ہوگی۔

اس ایک ہی واقعہ سے ان لوگوں کے تدین و تقویٰ کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک انسان کی پرکھ کا اصل پیمانہ کیا تھا۔ وہ طالبِ دنیا نہ تھے، طالبِ دین تھے۔ وہ مال و زر کی حرص نہ رکھتے تھے، اتباعِ شریعت اور احکامِ دین کی پابندی ان کا مطمحِ نظر تھا۔۔۔ آج ہم اسلام کا نام تو بہت لیتے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک اس کی تبلیغ و اشاعت بھی کرتے ہیں، لیکن ہم میں کتنے ہیں جو اس معیار اور اصول پر کاربند ہوں، جو ان بزرگوں نے اپنے عمل و کردار سے قائم کیا۔

فتاویٰ غزنویہ

علمائے غزنویہ کی خدماتِ بوقلموں میں ایک قابلِ ذکر اور لائقِ تحسین خدمت فتاویٰ غزنویہ ہے، جسے اب فقہی ابواب کی ترتیب سے دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور کے شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب مرتب کر رہے ہیں۔ مختلف مسائل سے متعلق یہ فتاوے مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالواحد غزنوی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے تحریر فرمودہ ہیں۔۔۔ اُمید ہے جلد ہی کتابت و طباعت کے مراحل سے گزر جائیں گے۔

فتویٰ نویسی بہت اہم اور نازک کام ہے مفتی کے لیے جہاں کتاب و سنت کا عالم ہونا ضروری ہے وہاں فقہیات پر عبور بھی لازمی ہے۔ علمائے غزنویہ کا اس باب میں ایک خاص اسلوب اور نقطۂ نظر تھا۔ مولانا سید داؤد غزنوی علمی اور فقہی اعتبار سے اس خانوادۂ عالی مرتبت کے آخری رکن تھے، یہ اسلوب اور نقطۂ نظر ان کی زندگی تک قائم رہا۔ غزنوی علما، کتاب و سنت کی روشنی میں فتویٰ لکھتے تھے، لیکن اس کی تائید میں فقہ کے ائمۂ اربعہ میں سے کسی ایک امام کا قول ضرور پیش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے علمائے غزنویہ کے فتوے کو اہل علم میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی۔ مولانا داؤد غزنوی کا فتویٰ ان شرعی مسائل میں جو قانونی نوعیت کے حامل ہیں، عدالت میں باقاعدہ تسلیم کیا جاتا اور مدارِ فیصلہ قرار پاتا تھا۔

علمائے غزنویہ فقہ کی تعلیم و تحصیل کو طلبا کے لیے ضروری قرار دیتے تھے چنانچہ مولانا داؤد غزنوی کے کتب خانے میں تمام مسالکِ فقہ کی کتابیں موجود تھیں اور وہ باقاعدہ انھیں زیرِ مطالعہ رکھتے تھے۔ جو عالم علم فقہ سے دلچسپی نہ لیتا، غزنوی اس کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

حافظ محمود امرتسری

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے تذکرے میں حافظ محمود کا ذکر ایک سے زائد مرتبہ آیا ہے۔ امرتسر میں مستقل سکونت سے قبل حصولِ حدیث کے لیے دہلی جاتے ہوئے بھی مولانا ان کے ہاں مقیم رہے اور انھیں تلقین کی۔ واپسی پر بھی اُن کے ہاں تشریف لائے اور ایک سال اقامت اختیار کیے رکھی۔

حافظ محمود صاحب مولانا کے بہت ہی مخلص مرید تھے اور باقاعدہ عالم تھے امرتسر میں باغ والی مسجد کے امام تھے۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا سے ان کے پرانے تعلقات تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے سے متاثر تھے۔ جبھی تو مولانا نے ان کو اس درجے اہمیت دی کہ دو مرتبہ ان کے پاس تشریف لائے۔

طویل عرصے تک اقامت گزیں رہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

۲۸۔ سیّد عبداللطیف حُسینی ویلوری

سیّد عبداللطیف بن ابوالحسن کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللطیف بن ابوالحسن بن عبداللطیف بن ابوالحسن بن عبداللطیف بن ولی اللہ بن عبداللطیف بن محمد بن عبدالحق بن قطب الدین بن عبدالفتاح عسکری حُسینی نقوی۔ اپنے عہد کے شیخ و امام اور متقی عالم تھے۔ جنوبی ہند کے شہر ویلور کے باشندے تھے۔ فقہ اور تصوّف کے نامور علما میں سے تھے۔ ہفتے کے روز ۱۴ جمادی الاخریٰ ۱۲۰۷ھ کو پیدا ہوئے۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو پہلے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ پھر اپنے والد سید ابوالحسن حُسینی نقوی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور علم حاصل کرنے لگے۔ بعد میں مولانا محمد حسین قادری مدراسی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بہت سی درسی کتابیں پڑھیں۔ اس زمانے میں مدراس کو بلدۂ فضل وکمال کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے مدرسے میں مولانا علاءالدین انصاری لکھنوی کا سلسلۂ تدریس جاری تھا۔ مولانا علاءالدین اپنے علم و ادراک کی وجہ سے "ملک العلما" کے لقب سے ملقب تھے۔ سیّد عبداللطیف نے مدراس میں ان سے بھی استفادہ کیا اور ۱۲۴۲ھ میں سندِ فراغ حاصل کی۔ ۱۲۶۰ھ میں عازمِ حجازِ مقدس ہوئے اور حجِ بیت اللہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی ہندوستان سے ہجرت کرکے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں درسِ حدیث دیتے تھے۔ سیّد عبداللطیف ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۶۲ھ میں ان سے سندِ حدیث لی۔ اس کے بعد ہندوستان واپس آئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر اس عالمِ دین اور فقیہِ نامور نے پوری زندگی علوم و معارف کی نشرواشاعت میں صرف کردی۔

سیّد عبداللطیف حسینی وسیع العلم، فہیم و فرلیں اور ذہین وفطین عالم تھے۔ آخرِ عمر

میں انگریزی زبان سیکھی اور ملکۂ برطانیہ کو انگریزی میں ایک رسالہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو قبول اسلام کی دعوت دی۔ یہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور تھا اور ہندوستان انگریزی حکومت کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ انگریزی حکومت نے اس عہد میں مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے، وہ برطانوی حکومت کی تاریخ جبر و استبداد کا ایک نہایت الم ناک باب ہے۔ اس عہد میں کسی انگریز کو اسلام کی دعوت دینا، بالخصوص ملکۂ برطانیہ کے سامنے اسلام کی حقانیت ثابت کرنا اور پھر اس کو قبول کرنے پر زور دینا، انتہائی مشکل کام تھا۔ لیکن سید موصوف کی جرأتِ مومنانہ اور جذبۂ تبلیغ اسلام ملاحظہ ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمنوں کو بھی اس کی دعوت دے رہے ہیں۔

اس وقت سید عبداللطیف مدراس میں قیام پذیر تھے۔ سید محمد علی حسینی رام پوری بھی وہیں تھے۔ ایک اور عالم مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی بھی مدراس میں اقامت فرما تھے۔ سید محمد علی حسینی رام پوری، امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی کے مرید اور علاقۂ مدراس میں ان کے خلیفہ تھے، جب کہ مولانا جمال الدین انصاری ان کے شدید مخالف تھے، وہ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کی تکفیر کرتے اور ان کی کتاب "تقویۃ الایمان" کو غلط قرار دیتے تھے۔ اس مسئلے میں سید محمد علی رام پوری اور مولانا جمال الدین انصاری کے درمیان بحث شروع ہوئی، جو بہت جلد شدید نزاع کی صورت اختیار کر گئی، پھر علمائے مدراس میں یہ سلسلۂ بحث انتہائی نازک صورتِ حال میں بدل گیا تھا۔ سید عبداللطیف حسینی نے ان دنوں سید محمد علی رام پوری سے ملاقات کی، وہ اُن کے حامی تھے۔ چنانچہ اس موضوع سے متعلق انھوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی، جس میں علمائے مدراس اور سید محمد علی رام پوری کے درمیان نزاعی مسائل کو وضاحت سے بیان کیا۔ اس کتاب کو انھوں نے "القول الفصل" کے نام سے موسوم فرمایا۔ "القول الفصل" کے علاوہ سید عبداللطیف حسینی نے چند اور کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں "جواہر الحقائق" اور "جواہر السلوک" شامل ہیں۔

سید عبداللطیف حسینی نقوی ویلوری، تیرھویں صدی ہجری کے ہندی علما میں

ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور حدیث و فقہ کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے ۱۱ محرم ۱۲۸۹ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی[۱۲۹]

۲۹ — سیّد عبد المغنی پھلواروی

پھلواری کے علمائے نامدار اور فقہائے ذی اکرام میں سیّد عبد المغنی بن معین الدین ہاشمی جعفری پھلواروی کا اسمِ گرامی قابلِ ذکر ہے۔ یہ اس نواح کے شیخ و عالم اور فقیہ و مفتی تھے۔ پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ شیخ وحید الحق پھلواروی سے علم حاصل کیا اور شیخ مجیب اللہ جعفری سے تصوف و طریقت کا درس لیا۔ فقہ و اصول اور دیگر علوم عربیہ میں یگانۂ عصر ہوئے اور بہت شہرت پائی۔ ماہرِ فقہ و اصول اور عالمِ کتاب و سنّت ہونے کی وجہ سے مدّتِ دراز تک پھلواری کے عہدۂ افتا پر متعین رہے۔

اپنے دور کے جلیل القدر فاضل اور پرہیز گار عالم تھے۔ اپنے مفوضہ فرائض کو نہایت حُسن و خوبی سے انجام دیتے رہے اور حتی الامکان کسی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ بلند اخلاق اور عالی کردار عالم تھے۔ انتہائی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد فتویٰ جاری کرتے۔

پھلواری کے اس نامور عالم و فقیہ نے ۲۷۔ رمضان المبارک ۱۲۳۳ھ کو اپنے وطن پھلواری میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔[۱۳۰]

۳۰ — مفتی عبد الواجد خیر آبادی

مفتی عبد الواجد خیر آبادی مسلکاً حنفی تھے اور شیخِ عصر اور عالمِ کبیر تھے۔ شیخ محمد اعلم

---

[۱۲۹] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۰۹، ۳۱۰ بحوالہ حدیقۃ المرام

[۱۳۰] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۱

سندیلوی کے بھانجے تھے۔ اکثر کتبِ درسیہ انہی سے پڑھیں، پھر بعض کتابوں کے لیے قاضی وہاج الدین گوپاموی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ احمد اللہ حسینی خیرآبادی سے شرح ہدایۃ الحکمت کا کچھ حصہ پڑھا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد خیرآباد ہی میں قیام کیا اور درس و تدریس میں مصروف ہوگئے۔ طویل عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے اور بہت سے علماء و طلبا کو مستفید فرمایا۔

بعد ازاں راجہ ٹکیت رائے نے لکھنؤ تشریف لانے کی دعوت دی اور اس شہر کا منصب افتا پیش کیا۔ یہ اس زمانے کا بہت بڑا منصب تھا جس پر فقہیات کے کسی ماہر ہی کو متمکن کیا جاتا تھا۔ افتا کی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں مسندِ درس بھی آراستہ کی اور متعدد علما و طلبا کو تعلیم دی۔ ان کے شاگردوں کی وسیع تعداد میں مولانا فضل امام خیرآبادی بھی شامل ہیں۔

مفتی صاحب ممدوح نے جمعۃ المبارک کی رات ۴ شوال ۱۲۱۶ھ کو وفات پائی۔[۱۳۱]

۱۳۱۔ مفتی عبدالواحد فرنگی محلی لکھنوی

مفتی عبدالواحد انصاری فرنگی محلی لکھنوی تیرھویں صدی ہجری کے شیخ و فاضل اور مفتی تھے۔ بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے پوتے اور مولانا عبدالاعلیٰ کے بیٹے تھے۔ فقہ و اصول میں دسترس رکھتے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ ابتدائی درسی کتابیں مولانا ازہار الحق لکھنوی سے پڑھیں۔ اس زمانے میں ان کے جدِ محترم مولانا عبدالعلی مدراس کی مسندِ درس پر فائز تھے۔ عبدالواحد نے مدراس کا عزم کیا اور انتہائی کتابوں کی تکمیل اپنے جدِ امجد سے کی، سندِ فراغ بھی انہی سے لی۔ فتویٰ نگاری اور فقہیات میں عبور تھا، اس لیے کسی اونچے منصب کے متمنی تھے۔ اس وقت بنگال کا چیف جسٹس انگریز تھا جس کا نام

---

۱۳۱ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۳۔ تراجم الفضلاء ص ۱۱۰، ۱۱۱۔

رنگٹن تھا۔مفتی صاحب اس کے پاس کلکتے پہنچے اور وہاں کی عدالتِ عالیہ میں عہدۂ قضا و افتا کی درخواست کی۔ کافی عرصہ اس سلسلے میں وہاں مقیم رہے، لیکن یہ منصب قاضی نجم الدین کاکوروی کے سپرد تھا، مفتی صاحب کو حاصل نہ ہوسکا۔ قاضی صاحب ممدوح کی وفات کے بعد دوبارہ کوشش کی تو یہ عہدہ مفتی سراج الدین کے حصے میں آیا۔ مفتی صاحب اب بھی اس کے حصول میں ناکام رہے۔ بعدازاں انھیں پنجاب کے شہر "رہتک" کا قاضی و مفتی بنایا گیا اور دو سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ کافی عرصے تک رہتک میں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر رہتک سے ان کو پانی پت بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی سرکاری طور پر اسی منصب پر فائز رہے۔ پانی پت میں تبدیل ہونے کے کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے۔

مفتی عبدالواحد فرنگی محلی نے علم و فضل کی گود میں پرورش پائی تھی اور اپنے عہد کے نامور علمائے احناف میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ۲۹ محرم ۱۲۶۱ھ میں ان کا انتقال ہوا۔[۱۳۲] ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہوسکا۔

۳۲ــــ مولانا عبدالوہاب مدراسی

مولانا عبدالوہاب مدراسی کے والد کا نام مولانا محمد غوث اور دادا کا ناصر الدین تھا۔ مسلکاً شافعی تھے اور اہلِ علم خاندان کے فرد تھے۔ ۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۰۸ھ کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی اس وقت مدراس میں نواب محمد علی خاں والاجاہ کے مدرسے میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے اور پورے ہندوستان میں ان کے فضل و کمال کا شہرہ تھا۔ عبدالوہاب اسی شہر کے رہنے والے تھے اور ان کے خاندان کے لوگ بحرالعلوم کی فراوانیٔ علم سے خوب آگاہ تھے۔ وہ عبدالوہاب

---

۱۳۲ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۳۶ ــــ نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۳ ــــ تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۴۲۔

کو بحر العلوم کی خدمت میں لائے اور اس نو عمر طالب علم نے ان سے تبرکاً علم صرف کی ابتدائی کتاب میزان الصرف پڑھی۔ اس کے بعد مولانا عبدالقادر، مولانا جعفر جبین اور مولانا علاء الدین لکھنوی وغیرہ علمائے عصر اور اساتذۂ علم و فن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں۔ آخری اور انتہائی کتابوں کی تکمیل اپنے والدِ مکرم مولانا غوث محمدؒ سے کی اور انہی سے سندِ فراغت حاصل کی ۔۔۔ شیخ علی بن عبداللہ حموی اس زمانے میں قرأت و تجوید کے ماہر تھے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد عبدالوہاب نے ان سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور قرأت و تجوید سیکھی۔

یہ جلیل القدر شافعی عالم دو مرتبہ حج و زیارت کی سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہوئے۔ پہلا حج ۱۲۶۴ھ میں کیا اور دوسری مرتبہ ۱۲۷۸ھ میں یہ شرف حاصل کیا۔

مولانا عبدالوہاب کا شمار مدراس کے امرائے سلطنت میں ہوتا تھا اور وہاں کے نواب نے ان کو متعدد بڑے بڑے خطابات سے سرفراز کیا تھا۔ مثلاً مدار الامرا، مدیر الملک، مختار الدولہ، وزارت خان بہادر، ارسطو جنگ وغیرہ خطابات سے ممتاز تھے۔ ان کے والدِ محترم بھی جیّد عالم ہونے کے باوجود حکومتِ مدراس کے اعلیٰ مناصب پر متعین رہے تھے، ان کی وفات کے بعد یہ مناصب بلکہ اس سے بھی زیادہ بیٹے کو تفویض ہوئے۔

مولانا عبدالوہاب بلند اخلاق، باہمت، جرأت مند اور سخی تھے اور معاملاتِ دین و دنیا کی عقدہ کشائی میں ماہر تھے۔ ان کے والد نے ۱۱ صفر ۱۲۳۸ھ کو وفات پائی اور اس کے بعد اُن کو بعض حکومتی ذمے داریوں پر مامور کیا گیا۔۔۔ ۱۲۴۲ھ میں افواجِ مدراس کے سربراہ مقرر ہوئے، ۱۲۵۴ھ میں منصبِ وزارت سے سرفراز ہوئے، ۱۲۶۰ھ میں کئی بڑے بڑے خطابات سے نوازے گئے۔ ۱۲۷۰ھ میں حکومت کی ذمے داریاں سے الگ ہو گئے۔

۱۲۳۸ھ سے لے کر ۱۲۷۰ھ تک حکومتِ مدراس کے متعدد اہم مناصب پر

فائز رہے، لیکن بائیس سال کے اس طویل عرصے میں والیِ مدراس نے ان کو ہمیشہ ان آداب سے مستثنیٰ قرار دے رکھا، جن کا کسی والیِ ریاست کے حضور پیش ہونے کے وقت امراء و عمال کے لیے بجا لانا ضروری ہے۔ یعنی سلام اور کورنش وغیرہ سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا۔

اس عالمِ دین میں ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ حکومت کی تمام ذمے داریاں سرانجام دینے کے ساتھ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لیے بھی وقت دیتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں :۔

۱۔ اکمل الوسائل لرجال الشمائل :۔ یہ کتاب شمائل ترمذی کے رجال سے متعلق ہے۔

۲۔ الکواکب الدراریہ منتخب احادیث مجالسۃ الدینوریہ :۔

۳۔ کشف الاحوال عن نقد الرجال :۔ ضعیف روات حدیث سے متعلق ہے۔

۴۔ مبدء الغرر فی اسماء القرأۃ العشرہ :

۵۔ ایک رسالہ جغرافیے سے متعلق۔

۶۔ نہایۃ السول فی مناقب ریحانۃ الرسول۔

۷۔ کاشف الرموزات الی الورقات :۔ یہ کتاب اصول فقہ سے متعلق ہے۔

۸۔ ھبۃ الوھاب :۔ یہ فقہ شافعی کے بارے میں ہے۔

۹۔ سند الزامرین فی الرد علی الوھابیین۔

یہ تمام کتابیں عربی میں ہیں :

۱۰۔ سفر نامہ :

مدراس کے اس شافعی المسلک فقیہ نے تہتر ۷۳ سال کی عمر پائی اور ۵ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ کو انتقال کیا۔[۱۳۳]

---

[۱۳۳] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۵، ۳۱۶، نیز تاریخ احمدی۔

۲۳۔ قاضی علی احمد گوپاموی

قاضی علی احمد بن قاضی مصطفیٰ علی خاں فاروقی گوپاموی کو قاضی ارتضا علی خاں کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اپنے دور اور علاقے کے شیخ و فاضل اور علامہ تھے۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم تھے۔ ۱۱۹۸ھ میں صوبہ یوپی کے شہر "گوپامئو" میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی مصطفیٰ علی خان کا شمار اپنے عہد کے جید علما میں ہوتا تھا۔ بیٹے نے درس نظامیہ کی ابتدائی کتابیں انہی سے پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے، وہاں اساتذۂ عصر کی کثیر تعداد مشغول درس و افادہ تھی، ان کی خدمت میں گئے اور حصولِ علم کیا۔ سات سال علمائے لکھنؤ سے استفادہ کرتے رہے۔ پھر سندیلہ گئے، وہاں منطق و فلسفہ کے مشہور عالم ملا حمد اللہ سندیلوی کے بیٹے مولانا حیدر علی سندیلوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور منطق، فلسفہ اور علمِ کلام کی تحصیل کی۔ بعد ازاں بلگرام کا قصد کیا، بلگرام میں مولانا ابراہیم مالاباری سے علمِ حدیث پڑھا اور شیخ نصیر الدین سعدی بلگرامی سے اخذِ طریقت کیا۔ سات سال بلگرام میں مقیم رہے۔ جب علوم عقلیہ و نقلیہ اور تصوف و سلوک میں مہارت پیدا کر لی تو واپس اپنے وطن گوپامئو تشریف لے گئے۔

اس زمانے میں ان کے والد قاضی مصطفیٰ علی خاں بہادر مدراس کے قاضی القضاۃ تھے، یہ بھی ۱۲۲۵ھ میں مدراس چلے گئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۲۳۰ھ میں وہاں ــــ ب افتا پر فائز ہوئے۔ ۱۲۳۳ھ میں ان کے والد قاضی مصطفیٰ علی خاں نے وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ۱۲۳۵ھ میں انہیں چتوڑ کے قاضی مقرر کیا گیا۔ ۱۲۴۱ھ میں شیخ عمر بن عبد الکریم مکی سے مکاتبتاً شرفِ سند و اجازہ حاصل کیا۔ ۱۲۴۴ھ میں ان کو مدراس کے جنوبی بلاد و قصبات کا عہدۂ قاضی القضاۃ تفویض ہوا۔ اس عہدۂ جلیلہ پر تیرہ سال متمکن رہے۔ اس سے کئی سال بعد فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے حرمین شریفین گئے اور وطن واپس آتے وقت حدیدہ کے مقام پر وفات پائی۔

قاضی علی احمد دو ناموں سے موسوم ہیں، ایک قاضی علی احمد سے اور دوسرے قاضی ارتضا علی خاں سے معلوم ہوتا ہے، ارتضا علی خاں ان کا سرکاری لقب تھا، جو چتوڑ کے مفتی اور مدراس کے جنوبی شہروں کا قاضی القضاۃ مقرر ہونے کے بعد ملا۔ چونکہ اصل وطن گوپامئو تھا، اس لیے قاضی علی احمد گوپاموی کہلائے۔ پھر مدراس کو اپنا مسکن بنا لیا تھا اور وہاں جا کر قاضی القضاۃ کے عہدے سے سرفراز ہو گئے تھے، لہذا قاضی ارتضا علی خاں مدراسی کے نام سے موسوم کیے گئے۔

یہ عالم دین تیرھویں صدی ہجری میں علاقۂ مدراس اور جنوبی ہند کے بہت بڑے مفتی، قاضی اور فقیہ تھے۔ مدراس اور اس کے گرد و نواح میں علم و کمال کے اعتبار سے کوئی ان کا حریف نہ تھا، مسائل فقہ میں ان کے فتوے اور فیصلے کو حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا۔ قضا و افتا کی عظیم ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ ان کا سلسلۂ تدریس بھی جاری تھا، جو بہت وسیع تھا۔ ان سے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ علاوہ ازیں بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ انھوں نے ہر علمی محاذ پر کام کیا اور شہرت پائی۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ النفائس الارتضائیہ شرح میزان البلاغہ: شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تصنیف میزان البلاغہ کی شرح۔

۲۔ الفرائض الارتضائیہ: علم وراثت سے متعلق ہے۔

۳۔ نقود الحساب۔

۴۔ تنبیہ الغفول فی اثبات ایمان آباء الرسول: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں آنحضرتؐ کے والدین کا ایمان ثابت کیا گیا ہے۔

۵۔ شرح قصیدہ بردہ: بوصیری کے قصیدہ بردہ کی شرح۔

۶۔ حاشیہ علیٰ شرح ہدایۃ الحکمۃ: شیرازی کی شرح ہدایۃ الحکمۃ پر حاشیہ۔

۷۔ حاشیہ علیٰ میرزاہد:

۸۔ حاشیہ علیٰ میرزاہد، ملا جلال:

۹ - حاشیہ علیٰ میرزاہد شرح المواقف -

۱۰ - فارسی اشعار کا دیوان -

۱۱ - الفوائد السعدیہ :- سلوک و تصوّف سے متعلق

۱۲ - منیۃ السراء فی شرح الدعاء :- اس کا نام کاشف الضراء بھی ہے -

۱۳ - شرح اسماء اللہ الحسنیٰ :- ۱۲۴۲ھ میں تصنیف کی -

نزہۃ الخواطر کے مصنف شہیر نے اس نامور عالم و فقیہ کی تاریخ وفات ۷ شعبان ۱۲۷۰ھ تحریر کی ہے اور تذکرہ علمائے ہند میں سال وفات ۱۲۵۱ھ مرقوم ہے[۱۳۴]۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف کا یہ لکھنا کہ وہ "درسال دوازدہ صد و پنجاہ و یک ہجری وفات فرمودہ" (۱۲۵۱ھ میں فوت ہوئے) صحیح نہیں - ۱۲۴۴ھ میں وہ بلادِ جنوبی مدراس کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے اور تیرہ سال اس عہدے پر متمکن رہے ۔ اس حساب سے وہ ۱۲۵۷ھ میں زندہ تھے ۔ اس کے بعد حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے ۔ ظاہر ہے ، یا تو صاحب تذکرہ علمائے ہند کو ان کی تاریخ وفات میں سہو ہو گیا ہے یا یہ کتابت کی غلطی ہے ۔

۳۴ - سیّد علی اعظم پھلواروی

پھلواری ہندوستان کے صوبہ بہار کا ایک مردم خیز شہر ہے ۔ تیرھویں صدی ہجری میں ، اس شہر میں جن ارباب علم اور اصحابِ فقہ نے جنم لیا ، ان میں سیّد علی اعظم بن سیّد افضل حسینی پھلواروی کا اسم گرامی بھی شامل ہے ۔ یہ حنفی المسلک فقیہ تھے اور اپنے وقت کے شیخ و فاضل بزرگ تھے ۔ زہد و عبادت اور تقویٰ و تدین میں یکتائے عصر تھے ۔ مولانا عبدالغنی بن عبدالمغنی جعفری سے تحصیل کی اور مرتبۂ کمال کو پہنچے ! اخذ طریقت

---

[۱۳۴] تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۱ ـــــ نزہۃ الخواطر ، ج ۷ ، ص ۳۲۴ ، ۳۲۵ بحوالہ مہر جہاں تاب ۔

شیخ ابوالحسن پھلواروی سے کیا۔ مسائل میں مرجع خلائق تھے۔ برصغیر میں جو بدعات پھیلی ہوئی ہیں ان کی شدید مخالفت کرتے اور لوگوں کو کتاب و سنت پر عمل کرنے اور خلافِ شرح امور سے بچنے کی تاکید فرماتے۔ اُنھوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی، جس میں قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں بزرگوں کے مزاروں پر نذر و نیاز دینے کی مخالفت کی ہے اور بتایا ہے کہ ائمۂ فقہ سے یہ رسوم کہیں منقول نہیں، یہ سب چیزیں بعد کی پیداوار ہیں۔ یہ کتاب اُنھوں نے ۱۲۸۲ھ میں تصنیف کی۔

پھلواری کے اس عالم و فقیہ نے ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۸ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۱۳۵]

۳۵- سیّد علی حبیب ہاشمی پھلواروی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں بے شمار اصحابِ علم اور اربابِ فضل پیدا ہوئے۔ اس صوبے کے شہر، قصبے اور قریے علمی لحاظ سے نہایت زرخیز تھے۔ جگہ جگہ علما کا بسیرا تھا اور گاؤں گاؤں میں مدرسے قائم تھے۔ ان مراکزِ علم میں ایک قابلِ ذکر مرکز "پھلواری" تھا۔ یہ شہر صحیح معنوں میں تصوّف و طریقت کا گلستان اور علم و معرفت کا مہکتا ہوا باغ تھا۔ تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں اس جنّتِ علم میں جن حضرات نے جنم لیا ان میں مولانا سیّد علی حبیب بن ابوالحسن بن نعمت اللہ ہاشمی جعفری کا اسمِ گرامی لائقِ تذکرہ ہے۔ وہ اپنے وقت کے شیخ و فاضل اور صالح عالمِ دین تھے۔ ۲۵ رمضان ۱۲۴۹ھ کو پیدا ہوئے۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ خاندان کے تمام افراد میدانِ علم کے شہسوار تھے اور ماحول نہایت صاف ستھرا تھا۔ بعض ابتدائی مروجہ کتابیں اپنے والد مکرم سیّد ابوالحسن سے پڑھیں، بڑی کتابوں کے لیے اپنے بھائی نورالعین اور چچا ابوتراب اور محمد حسین کے

---

[۱۳۵] نزھۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۲۷، ۳۲۸، بحوالہ تاریخ الکلا۔

حلقۂ درس میں شامل ہوئے ــــ یہ تمام حضرات مولانا احمد بی پھلواروی کے تلامذہ میں سے تھے۔

اس زمانے میں ان کے بھتیجے سیّد آل احمد پھلواروی جو جیّد عالم تھے، مدینۂ طیبہ میں فروکش تھے۔ وہ مدینۂ منوّرہ سے پھلواری آئے اور مسندِ درس آراستہ کی۔ بے شمار حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ استفادہ کرنے والوں کی وسیع فہرست میں صاحبِ ترجمہ سیّد علی حبیب پھلواروی کا نامِ نامی بھی شامل ہے۔ انھوں نے سیّد آل احمد سے پوری صحاح ستہ پڑھی اور سند و اجازہ سے سعادت اندوز ہوئے۔

سیّد علی حبیب پھلواروی تیرھویں صدی ہجری میں ارضِ ہند کے نامور عالم اور فقیہ تھے۔ ان کو کتابیں جمع کرنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا بے حد شوق تھا۔ مسائلِ فقہ پر کامل عبور تھا۔ سنّت رسولؐ کے شیدائی اور عمل بالحدیث میں انتہائی حریص تھے۔ بہت بڑے مبلغ اور متّبع کتاب و سُنّت تھے۔ بدعات و محدثات کے شدید مخالف تھے۔ بزرگانِ دین کی قبروں پر حصولِ برکت کے لیے حاضری دینے، اصحابِ قبور سے مُرادیں مانگنے، نذر و نیاز دینے، قبروں پر چراغ جلانے اور مجالسِ عرس منعقد کرنے کی سختی سے تردید کرتے اور اُسے خلافِ قرآن و حدیث قرار دیتے تھے۔

ابتلا کے وقت نمازِ فجر میں دُعائے قنوت کو جائز ٹھہراتے، تشہد میں رفعِ سبابہ کے قائل اور سرّی نمازوں میں فاتحہ خلف الامام کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔ بعد از رکوع اور دونوں سجدوں کے درمیان ادعیۂ ماثورہ خود بھی پڑھتے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے۔ ارکانِ نماز نہایت اعتدال سے ادا کرتے اور اوّل وقت میں نماز پڑھتے۔

سیّد علی حبیب پھلواروی متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جو فقہ و عقائد سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے چند کتابیں یہ ہیں:۔

۱۔ النعمۃ العظمیٰ:۔ یہ ان کی پہلی تصنیف ہے، جو بعض مسائلِ شرعیہ سے متعلق ہے۔ اس میں چند مسائل جو حدیث کے خلاف ہیں، ان سے بعد میں رجوع کر لیا تھا۔

۲۔ شواھد الجمعہ: اس میں ثابت کیا ہے کہ ہر بستی اور ہر شہر کے لوگوں پر جمعہ پڑھنا فرض ہے۔ فرضیتِ جمعہ کے سلسلے میں فقہائے حنفیہ نے جو شرائط بیان کی ہیں حدیث کی رُو سے انہیں غلط قرار دیا ہے۔

۳۔ الاسوۃ الحسنہ:۔ خلفائے راشدین کی فضیلت سے متعلق ہے۔

۴۔ صلاۃ المحبین:۔

۵۔ فارسی اشعار کا دیوان۔

سید علی حبیب جعفری پھلواروی شاعر بھی تھے، ان کا ایک فارسی دیوان بھی ہے۔ نصرؔ تخلص کرتے تھے۔

ان میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ فقہ حنفیہ کے مسائل پر گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے۔ ان کا حدیثِ صحیحہ سے موازنہ کرتے، جو مسئلہ حدیث کے مطابق ہوتا اس پر عمل کرتے اور جو حدیث سے ہم آہنگ نہ ہوتا، اُسے بلا تامل ترک کر دیتے۔

پھلواری کے اس ممتاز عالم و فقیہ نے دو شنبہ کے روز ۲۷ ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ کو وفات پائی[۱۳۶]

۳۶ —— سیّد علی سجاد جعفری پُھلواروی

برِصغیر پاک و ہند اس عالمِ آب و گِل کا وہ خطہ ہے جس کے تمام بلاد و امصار اور قصبات و دیہات میں اصحابِ معرفت و ادراک نے جنم لیا اور ہر جگہ علم و عرفان کی شمعیں روشن ہوئیں۔ بعض علاقوں میں تو اس کثرت سے علما پیدا ہوئے کہ اس کو حد و شمار کے دائرے میں لانا اگر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے ــــ دُور تک نظر دوڑا کر دیکھیے اہلِ علم کے خیمے گڑے ہوئے دکھائی دیں گے اور ان سے قال اللہ و قال الرسول کی دلنواز صدائیں بلند ہو کر بار بار پردۂ سماع سے ٹکرائیں گی بالخصوص

---

[۱۳۶] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۳۱، ۳۳۲ ــ تذکرہ علمائے ہند (ص ۲۱) میں صرف یہ لفظ مرقوم ہیں: "مولوی علی حبیب سجادہ نشین پھلواری"۔

یو پی اور بہار میں تو گاؤں کے گاؤں اصحاب تصوف اور اہل علم سے بھرے پڑے تھے۔ ان مقامات میں صوبہ بہار کے قصبہ پھلواری کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ قصبہ صحیح معنوں میں علم پرور اور علما آفریں تھا۔ صدیوں سے یہاں علم کی نہریں جاری اور معرفت کے چشمے رواں ہیں۔ یہاں کے تیرھویں صدی ہجری کے علما کی وسعت پذیر فہرست میں جن حضرات کو نمایاں مقام حاصل ہے، ان میں سید علی سجاد جعفری پھلواروی کا نام نامی لائق تذکرہ ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی سید نعمت اللہ اور دادا کا مجیب اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی تھا۔ اس خاندان کے سب افراد عالی مرتبے کے حامل تھے اور ہر شخص میدان کمالات میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھا۔

سید علی سجاد کی تاریخ ولادت ۱۹ ذیقعدہ ۱۱۹۹ھ ہے۔ پھلواری کے اس نونہال نے مولانا احمدی بن وحید الحق ہاشمی جعفری سے حصول علم کیا جو اپنے علاقے اور عہد کے جید عالم اور نامور مدرس تھے۔ طریقت و سلوک کی منزلیں اپنے والد گرامی سید نعمت اللہ کی صحبت میں طے کیں اور ایک عرصے تک ان سے مستفیض ہوتے رہے۔ علم سے فراغت کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور بے شمار تشنگان علوم کی علمی تشنگی بجھائی۔ سلوک و تصوف کی رُوح پرور وادی سے بھی بہت سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ تصنیف و تالیف کی راہوں میں بھی قدم زن ہوئے۔ شعر و شاعری کی محفلیں بھی آراستہ کیں۔ غرض ہر مقام علم پر رسائی حاصل کی اور ہر باب خیر پر دستک دی۔ ان کی تصنیفات میں درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:-

۱۔ فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۳۔ رسالہ در فقہ حنفی

۴۔ دیوان شعری، فارسی

سید علی سجاد ہاشمی جعفری پھلواروی نے ۱۸ رمضان ۱۲۷۱ھ کو اس دنیائے فانی سے منہ موڑا اور عالم آخرت کی راہ لی۔[۱۳۷]

---

[۱۳۷] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۳۲ بحوالہ شجرۂ شیخ بدر الدین

۳۷ــــ سیّد علی کبیر الہ آبادی

سیّد علی کبیر بن علی جعفر بن علی رضا بن فقیر اللہ حسینی الہ آبادی، تیرھویں صدی ہجری کے علمائے ہند میں علمی اور تحقیقی اعتبار سے نہایت ممتاز تھے۔ شیخ و فاضل اور متقی بزرگ تھے۔ فقہ اور دیگر علوم پر عبور حاصل تھا۔ ۲۸ محرم ۱۲۱۲ھ کو الہ آباد میں ولادت ہوئی۔ مختصراتِ درسیہ اپنے والدِ مکرم کے عمِ محترم سیّد نور الحسن سے پڑھیں۔ شرح ھدایۃ الحکمت اور شرح عقائد نسفی کے لیے شیخ رضی الدین الہ آبادی اور ان کے بیٹے نصیر الدین الہ آبادی کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ تحریر اقلیدس، سلم العلوم، شرح سلم، میر زاہد ملّا جلال، رسالہ میر زاہد وغیرہ کتب منطق کی تحصیل شیخ برہان الدین فقیہ دہلوی سے کی۔ مختصر المعانی کا کچھ حصّہ مولانا محمد حنیف ولایتی سے پڑھا۔ باقی کتبِ درسیہ مولانا روح الفیاض موی سے مکمل کیں اور ان سے مختلف علوم و فنون میں بہت استفادہ کیا۔ سیّد علی کبیر کے والدِ محترم سیّد علی جعفر علوم ظاہری و باطنی میں مہارت رکھتے تھے، ان سے سندِ حدیث بھی لی اور اخذِ طریقت بھی کیا۔ سیّد ادریس مغربی محدّث سے بھی حدیث کی سند حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تدریس و تصنیف میں مشغول ہوئے اور اس میں خوب شہرت پائی۔

سیّد علی کبیر الہ آبادی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ تحفۃ الکبیر فی مناقب الخلفاء واصحاب التطہیر۔

۲۔ اتحاف ارباب الحیات لارواح الاموات۔

۳۔ وظیفۃ القبول فی تعیین مولد الرسول۔

۴۔ غایۃ التوضیح فی مشروعیۃ التسبیح۔

۵۔ رسالہ ابطال تقیہ۔

۶۔ ھدایۃ الاحباب فی کشف عما شجر بین الاصحاب۔

۷۔ خلاصۃ المناقب فی فضائل بیت سید آل غالب۔

۸۔ غایۃ المطالب فی بحثِ ایمان ابی طالب۔

۹۔ اظہار السعادہ شرح اسرار الشہادہ۔

۱۰۔ الاربعین فی مناقب الخلفاء الراشدین۔

۱۱۔ نجوم الاہتداء فی اقتداء الاربعۃ من الائمۃ الخلفاء۔

۱۲۔ مطلوب الطالبین فی اسماء رجال الاربعین۔

۱۳۔ غایۃ البیان فی ذم مروان۔

۱۴۔ ضیاء القلوب فی سیر المحبوب۔

۱۵۔ تقویۃ الایمان فی فضائل شہر رمضان۔

۱۶۔ غرۃ الکمال فی ذکر شہر شوال۔

۱۷۔ بسط الکلام فی فضائلِ ذی الحجۃ الحرام۔

۱۸۔ العشرۃ المبشرہ فی مناقب العشرہ۔

۱۹۔ الفوائد الجعفریہ۔

۲۰۔ انتخاب العقیدہ۔

۲۱۔ صحیفۃ العوائد فی ذکر وفات الوالد۔

۲۲۔ ترجمہ رجال الشمائل ترمذی۔

بلاشبہ سید علی کبیر الٰہ آبادی جلیل القدر مصنف، جید عالم اور نامور فقیہ تھے۔ درس و تدریس میں بھی ان کا دائرۂ خدمت بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ۴ محرم ۱۲۸۵ھ کو انتقال کیا۔[۳۸]

۳۸ — مفتی علی کبیر مچھلی شہری

مفتی علی کبیر جعفری مچھلی شہری اپنے مشہور عالم مولانا علی احمد جعفری مچھلی شہری کے فرزندِ نامدار

---

[۳۸] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۲۳، ۳۲۴۔ تذکرہ ذیل الوفیات۔

تھے۔ اپنے وقت اور علاقے کے عالمِ کبیر اور فاضلِ اجل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت جعفر طیار کی اولاد سے تھے، اِس لیے جعفری کہلاتے۔ مولد و منشا جون پور ہے اور سنِ ولادت ۱۱۷۰ھ ہے۔ چونکہ جائے پیدائش جون پور ہے، لہٰذا انھیں جون پوری بھی کہا جاتا ہے۔ اپنے والدِ گرامی مولانا علی محمد کے ظلِ عاطفت میں پرورش پائی۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے اور بعض ابتدائی درسی کتابیں والدِ مکرم سے صرف دو سال میں پڑھ لیں۔ اس کے بعد علومِ عربی و فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور لکھنؤ پہنچے۔ وہاں مولانا محمد مبین فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں شرکت کی، ان سے منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ فنونِ ریاضیہ کی تکمیل علامہ تفضل حسین کشمیری سے کی۔ پھر عازمِ دہلی ہوئے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حدیث اور فقہ کی تحصیل کی۔ شیخ محمد آفاق نقشبندی سے اخذِ طریقت کیا۔ تکمیلِ علم کے بعد حصولِ ملازمت کے لیے کوشاں ہوئے۔ اُن کے والدِ مکرم اس زمانے میں مچھلی شہر (یوپی) میں مقیم تھے۔ وہاں پہنچے تو انگریزی حکومت نے مچھلی شہر کی مسندِ افتا تفویض کی اور اپنے علم و دیانت اور حسنِ کارکردگی کی بنا پر عمالِ حکومت اور عوام و خاص میں عزت و احترام کے مستحق قرار پائے۔ اُن کے چچازاد بھائی اور بعض دیگر اعزہ بھی ان کی سفارش سے حکومت کے بلند مناصب پر فائز ہوئے۔ ان کے خاندان کے متعدد افراد کو ان کی قابلیت کے مطابق عدل و انصاف اور افتا و قضا وغیرہ کے محکمے عطا کیے گئے، جس کی وجہ سے مچھلی شہر اور اس کے گرد و نواح میں اس خاندان کو بہت اعزاز و اکرام حاصل ہوا، اور یہ لوگ جو کہ اصلاً جون پور اور دیگر علاقوں کے رہنے والے تھے، مچھلی شہر آکر مچھلی شہری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ اس علاقے کے لوگوں کو ان کے علم و فضل سے بہت فائدہ پہنچا۔

مفتی علی کبیر بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ بلند اخلاق، رحم دل، بامروت، مشفق، حلیم الطبع اور کریم النفس تھے۔ اس کے علاوہ خدا شناس، متقی، صاف دل اور صاف گفتار تھے۔

مفتی صاحب ۱۲۴۴ھ میں انگریزی حکومت کے منصب افتا سے علیحدہ ہو گئے تھے اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ ایک عرصہ گھر ہی میں بیٹھے ہوئے گزر گیا۔ اس کے بعد حج بیت اللہ کے لیے ارضِ حجاز کا سفر کیا۔ حج سے فارغ ہو کر واپس وطن آ رہے تھے کہ مچھلی شہر سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر فرید پور کے مقام میں وفات پائی۔

وہ بہت بڑے مفتی اور فقیہ تھے، اسی لیے انھیں مچھلی شہر کی مسندِ افتا سونپی گئی تھی اور اس اہم مسند کا مستحق وہی عالم قرار پاتا ہے جو حدیث و فقہ میں مہارت رکھتا ہو، لیکن ان کی تصنیفات میں فقہ سے متعلق کسی کتاب کا علم نہیں ہو سکا۔ ان کی جن دو کتابوں کا علم ہو سکا ہے، ان میں سے ایک کا نام مخروطاتِ جبری اور ایک کا مخروطاتِ ہندسی ہے۔

سو سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے مگر بینائی بالکل صحیح تھی۔ آخر عمر تک مطالعۂ کتب جاری رہا۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف رحمان علی لکھتے ہیں کہ میں نے ان کو ۱۲۶۰ھ میں دیکھا تھا جب کہ میں ان کے بھانجے مولانا محمد شکور مچھلی شہری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھا۔ اس قدر ضعیف و نحیف تھے کہ صرف ہڈیوں اور کھال پر مشتمل ایک ڈھانچا باقی رہ گیا تھا۔ کمر جھک گئی تھی اور رکوع کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ غالباً اس زمانے میں نوے سال کی عمر ہو گی۔ ہم طلبا کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو نہایت اخلاق سے پیش آتے اور بڑی شفقت کے ساتھ ہمارا حال پوچھتے۔ اگر کوئی طالب علم ان سے کوئی کتاب مانگتا تو جس حالت میں کتاب رکھی ہوتی اسی حالت میں اٹھا کر دے دیتے اور فرماتے:

کتابم می دہم لاکن بایں شرط   کہ طبل دبوق دہند وقش لنسازی

اس ہندی عالم و فقیہ نے جمعۃ المبارک کی رات ۲۲ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ کو وفات پائی۔[۱۲۰]

---

[۱۲۰] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۵، ۱۲۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۳۴، ۳۳۵۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۶۸، ۲۶۹۔

۳۹۔ مولانا علی محمّد مچھلی شہری

مولانا علی محمد جعفری مچھلی شہری کا شمار اپنے دور کے علمائے صالحین میں ہوتا ہے۔ ممتاز فقیہ، نامور فاضل اور شیخ وقت تھے۔ مفتی علی کبیر مچھلی شہری کے (جن کا گزشتہ صفحوں میں تذکرہ ہوا) والدِ مکرم تھے۔ شروع سے آخر تک تمام علوم مولانا باب اللہ مچھلی شہری سے پڑھے۔ جامعیتِ علوم اور کمالاتِ فنون میں یگانۂ عصر تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اور اس خدمت میں بڑی شہرت پائی۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ علوم ظاہری کی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبا کو تصفیۂ باطن کی بھی تلقین فرماتے۔ جو شخص ان کے درس میں شامل ہوا، مرتبۂ کمال کو پہنچا۔ شب بیدار اور عبادت گزار عالم تھے۔ طلبا کے دلوں پر بھی اُن کی رُوحانیت اور نیکی کے اثرات نقش ہوتے۔ نہایت دھیمے مزاج کے عالم تھے، علم اور حلم دونوں اوصاف سے متصف تھے۔

تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف میں بھی ان کا ایک مقام تھا۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں :۔

۱۔ منہاج الاسلام :۔ مسائلِ فقہ اور احکام عقائد پر محیط ہے۔

۲۔ تہذیب الایمان :۔ عربی میں ہے اور اخلاق و آداب کے موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۳۔ چہار عناصر :۔ فارسی میں ہے اور صرف و نحو اور منطق سے متعلق ہے۔

مچھلی شہر (یوپی) کے اس عالم و فقیہ نے دوشنبہ کے روز ۲۴ رمضان المبارک ۱۲۳۶ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔[1]

---

[1] تجلّی نور، ج ۲، ص ۱۲۳ —— نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۳۵، ۳۳۶۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۷، ۶۸۔

۴۰۔ مفتی علیم الدین کاکوروی

ہندوستان کے شہر کاکوری کو کسی زمانے میں اہلِ علم کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں بے شمار فقیہ، مفتی، قاضی، مدرس اور صوفی پیدا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری کے علمائے کاکوری میں مفتی علیم الدین کاکوروی نامور فاضل، شیخ اور مفتی گزرے ہیں۔ ان کے والد کا اسمِ گرامی قاضی نجم الدین کاکوروی تھا، جو کلکتے کے منصبِ قاضی القضاۃ پر متمکن تھے اور دیارِ ہند کے جیّد عالم اور فقیہ تھے۔ مفتی علیم الدین نے بھی حصولِ علم کے بعد خوب ترقی کی اور نام پایا۔

اُنھوں نے درسی کتابیں اپنے والد قاضی نجم الدین، مولانا فضل اللہ نیوتینی، مفتی عبدالواحد خیر آبادی اور مولانا عماد الدین لبکنی سے پڑھیں۔ فقہ و اصول اور دیگر علوم میں خوب مہارت پیدا کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عہدۂ افتا پر فائز ہوئے، اس کے بعد قاضی مقرر کیے گئے، پھر منصبِ صدارت پایا۔

نہایت ذکی، فطین اور ذہین عالم تھے۔ مروّجہ علوم و فنون میں کامل تھے۔ ۱۷ ذی الحجہ، ۱۲۵۷ھ کو انتقال کیا۔[۱۴۱]

۴۱۔ سید علیم اللہ جالندھری

خطۂ پنجاب کے علمائے مشاہیر میں جالندھر (مشرقی پنجاب) کے سید علیم اللہ حسینی جالندھری کا نام نامی قابلِ ذکر ہے۔ وہ سید عتیق اللہ حسینی جالندھری کے فرزندِ گرامی تھے۔ جالندھر کو پنجاب میں ایک مردم آفرین علاقے کی حیثیت حاصل تھی، اس میں بے شمار علما و فقہا، بہت سے مؤلفین و مصنفین اور متعدد داد با دشعرا پیدا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری میں جن نامور اہلِ علم اور ممتاز اصحابِ فقہ نے اس خطے میں جنم لیا، ان میں سید علیم اللہ

---

۱۴۱ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۳۶، ۳۳۷۔

نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یہ اپنے دور کے فاضلِ کبیر اور شیخِ عالی قدر تھے۔ علمِ فقہ کے بھی جیّد عالم تھے اور معرفت وطریقت میں بھی بہت مشہور تھے۔

سیّد علیم اللہ حسینی ۲۲ جمادی الاولی ۱۱۰۹ھ کو جالندھر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ اس زمانے میں جالندھر اور انبالے کو علما وصوفیا کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ جالندھر کے علما میں شیخ بہلول برکی اور انبالے کے اربابِ تصوّف میں شیخ محمد سعید انبالوی بڑی شہرت کے مالک تھے۔ سید علیم اللہ نے فیض کے ان دونوں چشموں سے قلب وروح کی کھیتی کو سیراب کیا۔ شیخ بہلول برکی اور جالندھر کے بعض دیگر علما سے اخذ علم کیا اور شیخ محمد سعید انبالوی کی خدمت میں کسبِ فیض کے لیے حاضر ہوئے۔ ان سے طریقۂ چشتیہ میں منازلِ سلوک طے کیں اور طویل عرصے تک ان کی صحبت میں رہے۔

سیّد علیم اللہ حسینی اپنے دور کے نامور مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ انہار الاسرار:۔ تصوف وطریقت سے متعلق ہے۔
۲۔ نزھۃ السالکین:۔ اس کا موضوع بھی تصوّف وطریقت ہے۔
۳۔ زبدۃ الروایات:۔ یہ کتاب مسائل فقہ پر محیط ہے۔
۴۔ منثور الجواھر: یہ مرزا خاں محدث برکی جالندھری کی عربی کتاب نظم الدرر والمرجان کا فارسی ترجمہ ہے۔

مرزا خان برکی کا لقب اوحد الدین تھا، وہ فارسی اور عربی کے جیّد عالم تھے۔ انھوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ "نظم الدرر والمرجان فی تلخیص سیر سیّد الانس والجان" کے نام سے عربی میں تصنیف کی۔ اس کا ایک خطی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطاتِ شیرانی میں محفوظ ہے اور اس کا نمبر ۱۱۵۸ ہے — ۱۱۳۷ھ میں سیّد علیم اللہ حسینی جالندھری نے اس کا فارسی ترجمہ کیا جو ۱۹۰۲ء میں "پیسہ اخبار" لاہور میں شائع ہوا۔ فاضل مترجم نے

دیباچے میں لکھا ہے کہ : میں نے محسوس کیا کہ اوحد الدین میرزا خان البرکی جالندھری کی عربی کتاب "نظم الدرر والمرجان فی تلخیص سیر سید الانس والجان" اگرچہ مبسوط نہیں، تاہم یہ نادر معلومات پر محیط ہے اور ہر چند کہ خواص اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں، لیکن عوام اس کے اشارات سے محروم رہتے ہیں، اس لیے مجھے خیال آیا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے کے لیے اختصار کو بصورت تفصیل پیش کر کے "منثر الجواھر فی تلخیص سیر ابی الطیب والطاھر" کے نام سے اس کا فارسی میں ترجمہ کر دوں، چنانچہ میں نے ترجمہ شروع کر دیا (دیباچہ صفحہ ۲)

سٹوری نے "نظم الدرر اور نثر الجواھر دونوں کا اکٹھا ذکر کیا ہے، لیکن تفصیل بیان کرتے ہوئے اسے غلط فہمی ہو گئی ہے، اس نے لکھا ہے کہ : کتاب "نظم الدرر" علیم اللہ حسینی کی تصنیف ہے اور اس کا ترجمہ مرزا خاں نے "نثر الجواھر" کے نام سے کیا ہے، لیکن جیسا کہ اُوپر کی عبارت میں واضح کیا گیا ہے، حقیقت اس کے برعکس ہے۔

۵۔ شرح اخلاق ناصری۔

۶۔ شرح بوستانِ سعدی۔

۷۔ زبدۃ الروایات۔

ان تصانیف و شروح کے علاوہ مختلف عنوانات سے متعلق انھوں نے اور بھی متعدد کتب و رسائل قلم بند کیے۔

سید علیم اللہ حسینی نے ۹۳ سال کی عمر پا کر ۱۶ صفر ۱۲۰۲ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔[۱۴۲]

---

[۱۴۲] خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، ص ۳۳۷، ۳۳۸ ــــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۷ ــــــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۳۷، ۳۳۸ ــــــ انوار العارفین، ص ۶۲۹ ــــــ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ "ذیل لفظ "برکی"۔

۴۲۔ مولانا عمادالدین رفیقی کشمیری

کشمیر کی سرسبز و شاداب وادی میں ہر عہد میں علما و فقہا کی کثیر جماعت پیدا ہوئی اور ہر عالم و فقیہ نے اپنی خدماتِ گوناگوں میں شہرت پائی۔ ان حضرات میں مولانا عمادالدین رفیقی کشمیری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ عمادالدین بن عبدالرسول بن ابراہیم بن اسلم بن یحییٰ بن معین رفیقی کشمیری۔

مولانا عمادالدین رفیقی نیک و صالح عالم تھے اور علمِ فقہ اور دیگر علوم میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے دور کے بہت سے نامور اساتذہ سے حصولِ علم کیا۔ بعدازاں مشہور عالم و شیخ احمد علی واعظ سے صحیح بخاری پڑھی اور سندِ حدیث لی۔ شیخ احمد نار بلی سے اخذِ طریقت کیا اور خرقۂ تصوف پہنا۔ اس کے بعد سفرِ حجاز کیا اور سعادتِ حج حاصل کی۔

مولانا عمادالدین رفیقی نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسندِ درس بچھائی اور متعدد اہلِ علم نے ان سے استفادہ کیا، جن میں شیخ نظام الدین، شیخ حمزہ اور مولانا کے بعض اعزہ و اقارب شامل ہیں۔

کشمیر کے اس فقیہِ نامدار اور عالمِ صالح نے جمعہ کے روز عصر کے وقت ۸ رمضان المبارک ۱۳۰۰ھ کو رحلت فرمائی۔ کل ۵۱ سال عمر پائی[۲۴۳]۔

۴۳۔ مولانا عمر رام پوری

مولانا محمد بن ابوعمر حنفی رام پوری کو محمد عمر کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ یہ علمائے حنفیہ میں اونچے مرتبے کے شیخ اور فقیہ تھے۔ مسلکِ احناف کی مدافعت میں نہایت تیز تھے۔ مذہب حنفی پر جو

---

۲۴۳ تذکرہ علمائے ہند ۱۵۱ ـــــ حدائق الحنفیہ ص ۴۹۳، ۴۹۴ ـــــ نزھۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۳۸۔

اعتراض کیے جاتے ان کا جواب دینے میں انتہائی جوش و جذبے کا ثبوت دیتے مختلف فیہ مسائل میں علمائے اہل حدیث سے ان کے خوب مناظرے اور مباحثے رہتے۔

ان کا مولد و منشا رام پور ہے، لیکن اس سے ریاست رام پور مراد نہیں، بلکہ وہ رام پور مراد ہے جو یوپی کے ضلع سہارن پور میں ایک گاؤں ہے۔

مولانا عمر رام پوری نے کچھ ہوش سنبھالا تو حصولِ علم میں مشغول ہوئے بعض درسی کتابیں مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے پڑھیں، لیکن زیادہ اور انتہائی کتابیں دہلی میں مولانا محمد علی حامد پوری کے حلقۂ درس میں مکمل کیں۔

اپنے مذہب کے تحفظ و دفاع کے لیے انھوں نے جو کوششیں کیں اور اس ضمن میں غیر احناف اہلِ علم سے ان کی جو مناظرانہ بحثیں ہوئیں، وہ ان کی مذہبی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔ اپنے مذہب کے دفاع کے سلسلے میں جن اہل حدیث علما سے ان کے مناظرے اور مباحثے جاری رہتے اُن میں مولانا محمد حسین بٹالوی کا اسم گرامی قابلِ ذکر ہے۔ مولانا بٹالوی اپنے دور کے جلیل القدر اہل حدیث عالم تھے اور صاحبِ ترجمہ مولانا عمر رام پوری کا شمار بھی چوٹی کے حنفی علما میں ہوتا تھا۔

مولانا عمر رام پوری بعض کتابوں کے مصنف اور شارح بھی تھے اور اس میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں:۔

۱۔ تعلیقات علی شرح ھدایۃ الفقہ:۔ علامہ عینی کی شرح ہدایہ پر تعلیقات۔

۲۔ طنطنۂ صولت۔

۳۔ سماع کی بحث سے متعلق ایک رسالہ۔

۴۔ عشرہ مبشرہ:۔ مولانا محمد حسین بٹالوی نے بعض مسائل میں ان پر دس اعتراضات کیے تھے۔ رسالہ عشرہ مبشرہ میں ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

مولانا عمر رام پوری نے صرف چھبیس برس عمر پائی اور عین عالم جوانی میں مرضِ استقا سے ۳ رمضان ۱۲۹۸ھ کو دہلی میں فوت ہوئے۔[۴۴۰]

---

[۴۴۰] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۴۱ —— حدائق الحنفیہ، ص ۴۸۹، ۴۹۰۔

۴۴۔ مولانا عمران رام پوری

رام پور (یوپی) کے علمائے حنفیہ میں مولانا عمران بن عفران بن تائب بن سعد اللہ رام پوری بہت سے اوصاف کے حامل تھے۔ علم فقہ اور دیگر علوم میں شہرت رکھتے تھے اور اپنے علاقے کے مشاہیر فقہا میں سے تھے۔

مولد و منشا رام پور ہے۔ ان کے والد گرامی مولانا عفران بھی ممتاز عالم تھے۔ بیٹے نے فقہ کی کتابیں باپ کے حلقۂ درس میں مکمل کیں اور باقی کتب درسیہ کی تکمیل مولانا حیدر علی رام پوری ٹونکی سے کی۔ طویل عرصے تک مولانا حیدر علی سے وابستہ رہے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ پھر والد کے ساتھ کلکتہ تشریف لے گئے۔

اس وقت باپ بیٹا دونوں بوڑھے ہو چکے تھے، جو لوگ ان کے باہمی رشتے سے واقف نہ ہوتے وہ انھیں بھائی بھائی سمجھتے۔

مسائلِ فقہ پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس کے مشکل مقامات کی عقدہ کشائی میں منفرد تھے۔ فتوے کے لیے لوگ انھی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

میت کی تجہیز و تکفین کے متعلق اُردو میں ایک رسالہ بھی لکھا۔ اس رسالے میں فقہ حنفیہ کے نقطۂ نگاہ سے یہ مسائل بیان کیے ہیں۔ تمام عمر درس و افادہ اور علم و علما کی خدمت میں صرف کر دی۔

مولانا عمران رام پوری نے بہتر سال کی عمر میں ۱۲۷۱ھ کو انتقال کیا۔[۱۴۵]

۴۵۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی

کاکوری ہندوستان کے صوبہ یوپی میں لکھنؤ کے قریب وہ مقام ہے جس میں بے شمار علما و فقہا نے جنم لیا اور بلند مناصب تک رسائی حاصل کی۔ سلسلۂ فقہائے ہند کی

تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۰۵ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۴۱

انگریز حاکم بہت خوش ہوا، اور پھر یہی کتاب ان کی رہائی کا سبب بنی۔

۲۔ علم الفرائض:۔ یہ ان کی سب سے پہلی کتاب ہے جو ۱۲۶۲ھ میں طبع ہوئی۔ یہ علم فرائض کے بارے میں ہے۔

۳۔ ملخصات الحساب:۔ ۱۲۶۳ھ میں شائع ہوئی۔

۴۔ تصدیق المسیح وردع حکم القبیح:۔ ۱۲۶۸ھ میں طبع ہوئی۔

۵۔ الکلام المبین فی آیات رحمۃ للعالمین:۔ ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوئی۔

۶۔ محاسن العمل الافضل فی الصلوٰۃ:۔ یعنی نماز میں کون سے اعمال افضل ہیں۔ مطبوعہ ۱۲۷۲ھ۔

۷۔ الدالفرید فی مسائل الصیام والقیام والعید:۔ یہ کتاب نماز، روزہ، قیام اللیل اور عید کے مسائل پر مشتمل ہے۔ ۱۲۷۲ھ میں طبع ہوئی۔

۸۔ ھدایات الاضاحی:۔ یہ رسالہ ۱۲۷۲ھ میں طبع ہوا۔

۹۔ لیلۃ القدر:۔ یہ ایک رسالہ ہے جس میں شب قدر کے بارے میں فضائل مرقوم ہیں۔ ۱۲۷۲ھ میں طبع ہوا۔

۱۰۔ فضل العلم والعلماء:۔ یعنی علم اور علمائے دین کے فضائل میں۔ مطبوعہ ۱۲۷۲ھ۔

۱۱۔ فضائل درود وسلام:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے فضائل کے بارے میں ایک رسالہ۔ مطبوعہ ۱۲۷۲ھ۔

۱۲۔ میلوں کی مذمت میں:۔ یہ ایک رسالہ ہے جو ہولی، دیوالی اور ہندوؤں کی مذہبی تقریبات میں مسلمانوں کی شرکت کے رد میں ہے۔ اس کا مطلب مسلمانوں کو بدعات سے دور رکھنا ہے۔ ۱۲۷۲ھ میں طبع ہوا۔

۱۳۔ ضمان الفردوس:۔ ترغیب وترہیب کے انداز کا ایک رسالہ۔

۱۴۔ الاربعین من احادیث النبی الامین:۔ ۱۲۷۵ھ میں طبع ہوئی۔

۱۵۔ علم الصیغہ:۔ یہ علم صرف کی کتاب ہے، جو انڈیمان میں حافظ وزیر علی کی فرمائش پر لکھی۔ مطبوعہ ۱۲۷۲ھ۔

۱۶۔ وظیفہ کریمہ:۔ مطبوعہ ۱۲۷۶ھ۔

۱۷۔ تاریخ حبیب اللہ :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ۔ ۱۲۷۵ھ میں طبع ہوئی ۔

۱۸۔ خجستۂ بہار :۔ گلستان کے انداز کی فارسی نثر میں یہ کتاب ۱۲۷۶ھ میں طبع ہوئی ۔

۱۹۔ مواقع النجوم :۔ صوبہ یوپی کے گورنر ٹامس نے یہ کتاب دیکھی تو اسے بہت پسند کیا ۔

تقویم البلدان کے اُردو ترجمے کی وجہ سے انڈمان کے انگریز حاکم کی سفارش سے رہا ہوئے تو واپس ہندوستان آئے اور رکان پور میں اقامت اختیار کی ۔ وہاں مطبع نظامیہ کے مالک حاجی عبدالرحمٰن مرحوم نے ان کے لیے ایک مدرسہ قائم کردیا تھا جو "مدرسۂ فیضِ عام" کے نام سے مشہور رہوا ۔ وہاں صرف تین سال پڑھایا ۔ اس کے بعد حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے ۔ جب جہاز جدّہ کے قریب پہنچا تو ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا ۔ دوسرے عازمینِ حج کے ساتھ یہ بھی سمندر میں ڈوب گئے اور درجۂ شہادت پایا ۔

مفتی صاحب کا ذوقِ شعری بھی بڑا بلند تھا اور برجستہ گوئی میں کمال حاصل تھا ۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دن کچھ لوگ بیٹھے اس مصرعے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور اس پر گرہ لگانے کی فکر میں تھے ۔ ؏

سحر برخاستم از خواب و بوسیدم درِ خود را

اتنے میں مفتی صاحب بھی تشریف لے آئے ۔ مصرع سن کر فوراً پہلا مصرع لگایا اور شعر مکمل کر دیا ۔

بہ شب در خواب دیدم بر درِ خود دلبرِ خود را
سحر برخاستم از خواب و بوسیدم درِ خود را

مفتی صاحب ممدوح نہایت متقی، متورع اور فاضل متبحر تھے ۔ علمائے ربانیین میں ان کا شمار ہوتا تھا ۔ ان کی وفات کا واقعہ ۱۷ شوال ۱۲۷۹ھ (مطابق

۷ اپریل ۱۸۶۳ء (۱۲۸۰ھ) کو پیش آیا۔[۱۳۶]

۴۶۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی

مولانا عنایت علی عظیم آبادی کا شمار برِ صغیر پاک و ہند کے نہایت جری، شجاع اور مجاہد علما و فقہا کی جماعت میں ہوتا ہے۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: عنایت علی بن فتح علی بن وارث علی ہاشمی صادق پوری عظیم آبادی ــــــ!

عظیم آباد اُس زمانے میں صوبہ بہار کے دارالخلافہ پٹنہ کا نام تھا اور صادق پور اس کا ایک محلہ تھا۔ مولانا عنایت علی کے اعزہ و اقارب اسی محلے میں رہتے تھے۔ وہ ایک با اثر اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے اسلاف میں ایک بزرگ احمد علی تھے جو ضلع گیا کے ایک قصبہ "ارہدل" کے جج تھے۔ اس خدمت کے صلے میں مغل حکومت کی طرف سے ان کو بہت بڑی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ ان کے نانا رفیع الحسن خاں تھے جو صوبہ بہار کے ایک دولت مند اور معزز رئیس تھے۔ بلکہ مولانا عبدالرحیم الدر المنثور فی احوال صادق پور میں لکھتے ہیں کہ وہ مغل دور میں صوبہ بہار کے آخری ناظم تھے۔

مولانا عنایت علی کے خاندان کے تمام افراد علم و فضل کے زیور سے آراستہ تھے اور اپنے علاقے اور عہد میں دینی اور دنیوی اعتبار سے مرجعِ خلائق تھے۔ مولانا ممدوح نے ہوش سنبھالا تو خاندانی روایت کے مطابق حصولِ علم میں مشغول ہوئے اور اپنے زمانے کے متعدد علما سے تحصیل کی۔ ان کے بڑے بھائی مولانا ولایت علی تھے۔ (جن کا تذکرہ ان شاء اللہ اس کتاب کے اصل مقام پر ہوگا) مولانا ولایت علی نے سید احمد شہید

---

[۱۳۶] تذکرہ مشاہیر کاکوری، ص ۲۹۶ ــــــ تیسرالتواریخ ج ۲، ص ۳۶۱ ــــــ نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۲۱ تا ۳۲۳ ــــــ ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۰۴، ۲۰۵ ــــــ تذکرہ مصنفین درسِ نظامی، ص ۱۸۰ تا ۱۸۲ ــــــ معارف، اعظم گڑھ۔ جلد ۶۸ شمارہ ۳، و جلد ۶۹ شمارہ ۳۔

کی بیعت کی تو یہ بھی ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہو گئے۔ سید صاحب جہاد کے لیے سرحد پار گئے تو یہ بھی ساتھ تھے، لیکن کچھ عرصے کے بعد سید صاحب نے انھیں وطن واپس بھیج دیا تھا اور دعوت و تبلیغ کے لیے بنگال میں متعین کر دیا تھا۔ یہ بنگال ہی میں تھے کہ بالاکوٹ میں سید صاحب کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ لیکن مولانا عنایت علی اس کے بعد بھی بنگال میں فریضۂ دعوت و تبلیغ میں مصروف رہے۔ جب مجاہدین کی تنظیم کا سلسلہ معرض خطر میں پڑ گیا تو مولانا ولایت علی نے اس چھوٹے بھائی (مولانا عنایت علی) کو سرحد بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا ولایت علی خود بھی مستقلاً وطن سے ہجرت کر کے سرحد پار پہنچ گئے اور مجاہدین نے ان کو اپنا امیر مقرر کر لیا۔ اس اثنا میں طریق کار کے سلسلے میں دونوں بھائیوں میں اختلاف بھی پیدا ہوا، اور مولانا عنایت علی منگل تھانہ چلے گئے۔

مولانا عنایت علی کی مقصد سے محبت اور جذبۂ جہاد سے تعلق کا یہ عالم تھا کہ وطن میں لاکھوں روپے کی جائداد چھوڑی، آرام و آسائش کی زندگی کو ترک کیا، دنیوی نعمتوں سے منہ پھیرا، اور خطروں سے پُر اندازِ زیست اختیار کیا۔ ان کی زندگی سراپا جہاد اور سراسر جہد و امتحان کی زندگی تھی۔

پہلے مولانا ولایت علی مجاہدین کے امیر تھے۔ وہ ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ (۵ نومبر ۱۸۵۲ء) کو فوت ہوئے تو یہ ذمے داری مولانا عنایت علی کے سپرد ہوئی۔ انھوں نے اس عظیم ذمے داری کو نہایت ہمت اور استقلال کے ساتھ نباہا۔ ان کے زمانۂ امارت میں بہت سے مشکل ترین مراحل پیش آئے، لیکن وہ ہر موقعے پر ثابت قدم رہے اور تمام امور انتہائی حسن و خوبی سے انجام دیے۔

مولانا عنایت علی نے اپنے علم و مطالعہ کی بنا پر مسلمانوں کی زندگی کا جو نقشہ مرتب کیا تھا، وہ اس طرح تھا۔

۱۔ جس ملک پر کافروں کا تسلط ہو جائے، وہاں کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ متحد ہو کر کافروں سے جنگ کریں۔

۲۔ جو لوگ کافروں سے جنگ کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں، وہ ہجرت کر کے کسی آزاد ملک میں چلے جائیں۔

۳۔ وہ اپنے زمانے میں ہجرت کو فرض قرار دیتے تھے۔ جو لوگ ہجرت کی راہ میں رکاوٹ

پیدا کرنے کی کوشش کرتے، اُن کے نزدیک وہ منافق قرار پاتے تھے۔

۴۔ مولانا ممدوح دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ جو لوگ ہجرت بھی نہ کر سکیں وہ کافروں کی حکومت سے قطع تعلق کر لیں یعنی نہ کسی معاملے میں کافر حکومت کی مدد کریں اور نہ اس کی عدالتوں میں جائیں، اگر ان میں کوئی تنازع پیدا ہو جائے تو اس کو نمٹانے کے لیے اپنی پنچایتیں اور کمیٹیاں بنا لیں جو اچھے اور دیانت دار افراد پر مشتمل ہوں۔

اُنھوں نے اس قسم کے کئی اعلامیے جاری کیے تھے اور بنگال میں جب وہ دعوت و تبلیغ کا کام کرتے تھے، تو مسجدوں کی تعمیر اور آبادی کا بھی انتظام کرتے تھے۔ پھر فصلِ خصومات کے لیے وہ پنچایتیں اور کمیٹیاں بناتے تھے۔ مجاہدین کے زمانۂ امارت میں انھوں نے اس قسم کے متعدد اعلامیے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں بھیجے تھے۔

مولانا کی پہلی شادی سید محمد مسافر کی صاحب زادی سیدہ آمنہ سے ہوئی تھی۔ بہار کے ایک مسلمان خاندان میں یہ پہلی شادی تھی جو انتہائی سادگی سے شریعت کے مطابق ہوئی۔ سیدہ آمنہ سے حافظ عبدالمجید پیدا ہوئے۔ کچھ مدت بعد اس خاتون کا انتقال ہو گیا تو مولانا کا نکاح ثانی شاہ محمد حسین کی صاحب زادی سے ہوا جو بیوہ تھیں۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام ہاجرہ تھا۔

حافظ عبدالمجید نے اپنے چچا مولانا فرحت حسین سے تعلیم پائی۔ اس کے بعد یہ بھی اپنے والد کے ساتھ سرحد چلے گئے تھے اور وہیں فوت ہوئے۔

مولانا عمر بھر تبلیغِ دین و اشاعتِ اسلام میں مصروف رہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں زندگی صرف کر دی۔ ظاہر ہے اس اثنا میں اُنھوں نے تبلیغ و اشاعت سے متعلق چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے بھی لکھے ہوں گے۔ لیکن ان کے صرف ایک چھوٹے سے رسالے کا پتا چلتا ہے، جس کا نام ہے "بُت شکن"۔ یہ رسالہ اس مجموعۂ رسائل میں شائع ہوا تھا جو مولانا عبدالرحیم نے "رسائل تسعہ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور اہلِ بیت کے مصائب مؤثر انداز میں بیان کیے گئے

ہی ساتھ ہی تعزیہ داری کی حقیقت بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ حضرت حسین اور اہل بیت کے عمل اور اُسوہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ غیر شرعی رسوم اور غیر دینی امور کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔

مولانا نے فارسی میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی، جس میں جہاد کے احکام بیان کیے گئے تھے اور لکھا تھا کہ ہماری جنگ انگریز سے تھی ــ "کہ ایں جنگِ ما با فرنگی بود۔"

بلاشُبہ مولانا عنایت علی ایک پُرجوش اور با حمیت عالم تھے۔ اُنھوں نے ہر موقع پر اللہ کی راہ میں انتہائی عزیمت و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ان کی تمام زندگی امورِ دینیہ کے لیے وقف رہی۔ اُنھوں نے بنگال اور ملک کے دوسرے حصّوں میں بے حد محنت اور عزم و استقلال سے تبلیغ اسلام کی۔ اس زمانے میں سکھ اور انگریز دونوں مسلمانوں کے دشمن تھے۔ مولانا اپنی استطاعت کے مطابق دونوں سے برسرِ آزما ہوتے۔ اُنھوں نے اپنی تمام دولت اللہ کی راہ میں لُٹا دی۔ جب ملک میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا، اُس وقت مجاہدین کی زمامِ امارت اِنھی کے ہاتھ میں تھی اور یہ ان کی تاریخ کا بہت ہی نازک موڑ تھا جو کامیابی سے طے ہوا ــ مجاہدین کو جو مسائل پیش آتے، اُن کے فیصلے یہی کرتے اور یہی مرکز سے فتوے جاری فرماتے۔

مولانا موصوف علاقۂ سرحد میں جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اُن پر بخار کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اُس وقت وہ غالباً پرگنہ منصور جدون کے مقام نوبانڈہ میں تھے۔ وہاں سے لوگوں نے ان کی چارپائی اٹھائی اور چنّبئی کی جانب روانہ ہوئے۔ کوہِ چنبئی کی چڑھائی پر بخار بہت تیز ہو گیا اور مولانا نے کاغذ اور قلم دوات طلب کی لیکن اسی لمحے سکراتِ موت کا عالم طاری ہو گیا اور کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ لکھنے کی سکت نہ رہی۔ ان کے بیٹے حافظ عبدالمجید نے پوچھا کہ ہمیں کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں اور آپ کے بعد امیر کون ہو ــ؟ اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

اِن کی صحیح تاریخ وفات کا تو علم نہیں ہو سکا، البتہ اتنا معلوم ہے کہ ۶ شعبان

۱۲۷۴ھ (۲۲ مارچ ۱۸۵۸ء) کو زندہ تھے۔ اِس سے ایک یا دو روز بعد انتقال کیا۔ ان کا حادثۂ موت انگریز کے پنجپار، چنگئی، منگل تھانہ اور ستھانہ پر حملے سے پہلے پیش آیا۔[۱۴۷]

---

[۱۴۷] تفصیل کے لیے دیکھیے سرگزشت مجاہدین، ص ۲۸۲ تا ۲۹۰، ۲۹۹ تا ۳۰۴ نیز اس کتاب کے مختلف مقامات ـــــ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج ۳ ص ۹۱ تا ۱۰۷، نیز اس کتاب کے مختلف مقامات ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۴۳، ۳۴۴۔

بعض دیگر فقہائے کرام

ردیف ع کے یہ وہ چھیالیس[۴۶] فقہائے کرام تھے، جن کے کم یا زیادہ حالات کتابوں میں مرقوم ہیں۔ اب آئندہ سطور میں اس ردیف کے ان حضرات کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو تذکرہ نگاروں نے فقیہ تو بے شک لکھا ہے، مگر ان کے حالات نہیں ملتے، یا ملتے ہیں تو انتہائی مختصر۔ یہ ردیف ع کے چھتیس فقہا و علمائے کرام ہیں، جن کا مندرجہ ذیل سطور میں ذکر کیا جاتا ہے:۔

۱۔ مولانا عبدالباسط انصاری لکھنوی :۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے :۔

عبدالباسط بن عبدالرزاق بن جمال الدین بن علاء الدین بن انوار الحق انصاری لکھنوی۔ تاریخ ولادت ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ ہے۔ ان کا شمار علمائے فرنگی محل میں ہوتا ہے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر اپنے والد مولانا عبدالرزاق انصاری لکھنوی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حصولِ رزق کی غرض سے حیدرآباد (دکن) کا عزم کیا اور مدت تک وہاں امیر ریاست کی خدمت میں رہے۔ چار سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر تھی۔ بہت عابد و زاہد عالم تھے۔ فقہائے حنفیہ میں ان کا مرتبہ بڑا اونچا تھا۔ رسالہ "ردِ نیاچرہ"

ان کی تصنیف ہے۔ اپنے والد کی زندگی میں ۲۱ ذوالحجہ ۱۲۹۵ھ کو عالمِ شباب میں وفات پائی۔[۱]

۲۔ **مولانا عبدالباقی دیوی** :۔ مولانا عبدالصمد حسینی دیوی کے فرزند تھے اور مفتی عبدالسلام اعظمی دیوی کی اولاد سے تھے۔ اپنے وقت کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے، فقہ واصول کے ماہرین میں سے تھے۔ یوپی کے ایک مقام دیوہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اپنے والد گرامی مولانا عبدالصمد حسینی سے علم حاصل کیا اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ پھر ان کے ساتھ ہی فرخ آباد چلے گئے۔ والد کی وفات کے بعد نواب غالب جنگ نے ان کو اپنے بیٹے مظفر جنگ کا اتالیق مقرر کر دیا تھا۔ مدت دراز تک فرخ آباد میں اقامت اختیار کیے رکھی۔ بعد ازاں اپنے شہر دیوہ آگئے۔ مثنوی مولانا روم پر خوب عبور حاصل تھا۔ اس کی ایک شرح بھی قلم بند کی۔ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے اس کو بہت عمدہ شرح قرار دیا ہے۔[۲] تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۳۔ **مولانا عبدالجامع فرنگی محلی** : مولانا عبدالنافع کے بیٹے اور بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے پوتے تھے۔ ولادت اور نشوونما لکھنؤ میں ہوئی۔ اپنے عم محترم مولانا عبدالرب فرنگی محلی، مولانا نورالحق اور مولانا قدرت علی سے علم حاصل کیا، علوم مروجہ میں مہارت پیدا کی اور فقہائے حنفیہ میں منفرد حیثیت کے حامل ہوئے۔ علم سے فراغت کے بعد کوئی ذریعۂ معاش نہ ہونے کی وجہ سے حصولِ ملازمت کے لیے حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ وہیں ۲۳ شوال ۱۲۷۲ھ کو فوت ہوئے۔[۳]

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۷ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۳۵ ــــ تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۰۱۔

[۲] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۳۵ ــــ تاریخ فرخ آباد۔

[۳] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۷ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۳۵ ــــ تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۴۴۔

۴۔ مولانا عبدالجبار شاہ جہان پوری : تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز حنفی المسلک فقیہ اور شیخ و عالم تھے۔ صالح اور پاک باز علما میں گردانے جاتے تھے۔ ولادت و تربیت شاہ جہان پور میں ہوئی۔ اپنے عصر کے معروف اساتذہ سے علم حاصل کیا۔[۴]

۵۔ سید عبدالجلیل بریلوی : سید عبدالجلیل بن محمد بن ابواللیث بن ابوسعید حسنی بریلوی حضرت سید علم اللہ حسنی بریلوی کی اولاد سے تھے۔ رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ علم و مشیخت کی گود میں پرورش پائی اور عالی مرتبے کو پہنچے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے اخذ طریقت کیا اور ان کے ساتھ ہی حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ رائے بریلی کی مسندِ مشیخت پر فائز تھے اور بہت نیک، متدین اور صالح عالم و فقیہ تھے۔ ان کا کتب خانہ بڑا شان دار تھا اور تمام علوم و فنون کی کتابیں اس میں موجود تھیں۔ سید ممدوح ادیب و عالم، ذہین و فطین، کریم النفس اور پاکیزہ خصال تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر سید عبدالحی حسنی نے صغر سنی میں ان سے قرآن مجید کا کچھ حصہ پڑھا تھا۔ ان کی ایک تصنیف بھی ہے، جس کا نام "کشکول" ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے، جو فقہ، ادب، تاریخ وغیرہ موضوعات پر مشتمل ہے۔ اس نیک طینت عالم و فقیہ نے ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ کو وفات پائی اور اپنے جدِّ امجد سید ابوسعید بریلوی کی قبر کے قریب دفن ہوئے۔[۵]

۶۔ مولانا عبدالحق ٹونکی : مولانا عبدالحق بن خلیل الرحمٰن بن عرفان یوسفی رام پوری ثم ٹونکی، نامور فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور اپنے علاقے کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ رام پور میں ولادت ہوئی اور وہیں نشو و نما پائی۔ کتب درسیہ اپنے والد مولانا خلیل الرحمٰن سے پڑھیں۔ پھر انہی کے ساتھ رام پور سے ٹونک گئے

---

[۴] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۳۰، بحوالہ تاریخ فرخ آباد۔

[۵] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۳۸، ۲۳۹۔

اور وہاں سکونت اختیار کی۔ ٹونک میں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور وہیں وفات پائی[6]

۷۔ **مولانا عبدالحق رام پوری**: مولانا عمران یوسفی رام پوری کے بیٹے تھے اور مشہور فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ اپنے دور کے شیخ و فاضل شخص تھے۔ رام پور میں نشو و نما پائی اور اپنے والد مولانا عمران اور دیگر علمائے عصر سے علم حاصل کیا، پھر دکن چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۲۹۲ھ میں فوت ہوئے[7]

۸۔ **مولانا عبدالحکیم شیخپوری**: مولانا عبدالحکیم بن کرامت حسین بن ثناء اللہ شیخپوری، بہت بڑے فاضل اور ممتاز عالم تھے۔ حنفی المسلک فقیہ تھے۔ منطق، فلسفہ، نحو، کلام، فقہ اور اصولِ فقہ میں درک رکھتے تھے۔ بہت سے علما نے اُن سے استفادہ کیا۔ ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا[8]

۹۔ **مولانا عبدالخالق پشاوری**: اپنے عہد اور شہر کے فاضل آدمی تھے۔ نہایت نیک اور شیخ تھے۔ فقہ، اصول اور کلام کے ماہر تھے۔ مسلکاً حنفی تھے۔ حیدر آباد (دکن) گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ ۱۲۹۳ھ میں جنت کو سدھارے[9]

۱۰۔ **مفتی عبدالرب لکھنوی**: مفتی عبدالرب بن شرف الدین بن محی الدین اعظمی لکھنوی علم و فضل میں یکتا تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ، فرائض، شعر، نجوم، جفر اور موسیقی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں ولادت ہوئی اور وہیں پرورش پائی۔ صرف ایک سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ نہایت تیز ذہن اور فہیم و فرلیں تھے۔ اس زمانے میں مولانا ظاہر جون پوری اور مولانا وجیہ الدین جون پوری لکھنؤ میں شیخ

---

[6] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۳۶

[7] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۹ — نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۳۹ — تذکرہ کاملانِ رام پور۔ ص ۲۰۱۔

[8] نزھۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۴۷ بحوالہ تذکرۃ النبلا۔

[9] ایضاً، ص ۲۵۱۔ بحوالہ مہر جہاں تاب۔

پیر محمد لکھنوی کی خانقاہ میں درس دیتے تھے۔ عبدالرب بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور تمام علوم مروّجہ کی تحصیل کی۔ یہاں تک کہ اپنے سب اقران و معاصرین پر فوقیت لے گئے اور فتویٰ نویسی کے منصب پر فائز ہوئے۔ بحث و مناظرے میں تیز تھے۔ عابد و زاہد، سادہ مزاج اور قلیل الغذا تھے۔ مناصب دنیوی کے حصول کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوئے۔ ان کے تلامذہ کثیر تعداد میں تھے۔ دوشنبہ کے روز سلخ ربیع الاوّل ۱۲۰۸ھ کو فوت ہوئے۔[۱۰]

۱۱۔ مولانا عبدالرحمٰن جالندھری: ان کے والد کا اسم گرامی سیف الرحمٰن تھا۔ نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ فقہ و اصول میں منفرد تھے۔ شیخ علی دہلوی سے اخذ طریقت کیا۔ اور عرصے تک ان سے منسلک رہے۔ پھر حجازِ مقدس گئے اور سعادتِ حج حاصل کرنے کے بعد وطن واپس آئے۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ پھر عازمِ حج ہوئے۔ حج کے بعد واپس آئے، ابھی علاقہ سندھ میں تھے کہ انتقال کر گئے۔ جالندھر کے یہ مشہور شیخ اور صوفی تھے۔ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۲۸۵ھ میں جنت الفردوس کی راہ لی۔[۱۱]

۱۲۔ مولانا عبدالرحمٰن گجراتی: قاضی عبدالاحمد شافعی سورتی گجراتی بااعظہ کے بیٹے تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے فاضل تھے۔ شہر سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ ان کے والدِ محترم قاضی عبدالاحمد اپنے زمانے کے معروف عالم تھے، ان سے اور دیگر علما سے کسبِ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حصولِ معاش کے لیے حیدرآباد دکا عزم کیا اور اچھے خاصے منصب پر متمکن ہوئے۔ وہیں وفات پائی۔[۱۲]

۱۳۔ مولانا عبدالرحیم رام پوری: والد کا اسمِ گرامی محمد سعید تھا۔ پٹھان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے یگانۂ روزگار علما میں سے تھے،

۱۰؎ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۵۱، بحوالہ باغ دبہار۔

۱۱؎ ایضاً، ص ۲۵۲ بحوالہ خزینۃ الاصفیا۔

۱۲؎ ایضاً، بحوالہ، حقیقت سورت۔

بہت بڑے فاضل اور متبحر عالم تھے۔ تمام عمر رام پور میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔ زہد و قناعت کا پیکر تھے۔ دنیا اور اسبابِ دنیا کو کبھی قابلِ التفات نہیں گردانا۔ اس سلسلے میں ان کی طرف بہت سے عجیب و غریب واقعات منسوب ہیں۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ علاقہ روہیل کھنڈ کے انگریز گورنر ہاکنس کو جب ان کی وسعتِ علم کا پتا چلا تو ان کو بریلی تشریف لانے کی دعوت دی۔ وہ تشریف لائے تو گورنر نے بڑے احترام کے ساتھ کہا "ہم آپ کو انگریزی سکول میں علوم عربیہ کا استاد مقرر کرنا چاہتے ہیں، آپ کی خدمت میں ماہانہ ڈھائی سو روپے تنخواہ پیش کی جائے گی اور جلد ہی تین سو روپیے کر دی جائے گی۔" مولانا نے انگریز گورنر کی اس پیشکش کا عجیب تر جواب یہ دیا کہ "اگر میں نے آپ کے ہاں ملازمت کر لی تو والیٔ رام پور نواب احمد علی خاں جو مجھے دس روپے ماہانہ دیتے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔" گورنر نے کہا "ہم تو اس سے کئی گنا زیادہ دے رہے ہیں اور آپ کو دس روپے کی فکر پڑی ہے۔" یہ جواب مؤثر ثابت نہ ہوا تو فرمایا "میرے گھر میں ایک بیری کا درخت ہے، اس کے بیر بہت میٹھے ہیں، اگر میں آپ کے ہاں آ گیا تو وہ میٹھے بیر کیسے کھا سکوں گا؟" گورنر نے کہا "آپ کے گھر والے وہ بیر آپ کو بھیج دیا کریں گے۔" فرمایا "یہ تو ٹھیک ہے لیکن رام پور میں مجھ سے جو طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں، میرے بعد ان کا کیا بنے گا؟ اور وہ کس سے تعلیم حاصل کریں گے؟" عرض کیا "وہ سب طلبا آپ کے ساتھ ہی بریلی آ جائیں گے اور میں ان کے لیے وظائف مقرر کر دوں گا۔" فرمایا "آپ یہ بھی کر دیں گے، لیکن اگر اللہ نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم علم پڑھانے کے بدلے اُجرت لیتے تھے تو اس کا کیا جواب دوں گا؟"

اس کے بعد وہ رام پور واپس چلے گئے اور اپنی دس روپے میں جو نواب احمد علی خاں انھیں ماہانہ دیتا تھا، عمر صرف کر دی۔ یہ جید عالم دین تھے اور

بہت اُونچے مرتبے کے حامل تھے، جنھوں نے انگریزی حکومت کی ڈھائی تین سو روپے تنخواہ منظور نہیں کی اور خالصتاً لوجہ اللہ علوم و معارف کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔ اس ساری گفتگو کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں یا تو یہ انگریز کی ملازمت نہیں کرنا چاہتے تھے یا پھر قناعت کا ان پر اس قدر غلبہ تھا کہ دس روپے کو ہی کافی سمجھتے تھے۔ اس جلیل القدر عالم نے ۱۲۳۴ھ کو رام پور میں وفات پائی۔[۱۳]

۱۴۔ مولانا عبدالرحیم سندھی: مولانا عبدالرحیم ٹھٹھوی سندھی اپنے زمانے کے شیخ و فاضل تھے، اور خاندانِ اہلِ علم کے فرد تھے۔ ولادت و تربیت سندھ میں ہوئی اور ٹھٹھے کے اساتذہ سے فقہ و اصول، لغت و نحو اور علوم عربیہ کی تحصیل کی، پھر الٰہ آباد گئے، وہاں شیخ غلام حسین الٰہ آبادی سے علوم حکمیہ پڑھے۔ بعد ازاں فرخ آباد کا قصد کیا اور طویل عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ فرخ آباد میں ان کا وسیع سلسلۂ درس و تدریس تھا۔ اس کے بعد سندھ واپس آ گئے تھے۔[۱۴]

۱۵۔ مولانا عبدالرشید رام پوری: حنفی المسلک تھے اور فقہ و اصول اور دیگر علوم میں ان کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ رام پور میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔[۱۵]

۱۶۔ مولانا عبدالصمد پشاوری: مولانا عبدالصمد بن عبدالرب پشاوری مسلکاً حنفی تھے اور اپنے دور کے اذکیا میں سے تھے۔ کتبِ درسیہ پر عبور اور علوم متداولہ میں مہارت رکھتے تھے۔ حدیث، فقہ، اصول، منطق اور عربی ادبیات میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ بھوپال گئے تو نواب سیّد

---

[۱۳] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۵۸، ۲۵۹۔ بحوالہ نجم الغنی رام پوری۔

[۱۴] ایضاً، ص ۲۶۰، بحوالہ تاریخ فرخ آباد۔

[۱۵] ایضاً، ص ۲۶۲ بحوالہ "روزنامہ"

محمد صدیق حسن خاں نے اپنی تصنیفات کی تصحیح کا کام ان کے سپرد کیا تقریباً چالیس سال کی عمر میں شوال ۱۲۹۷ھ کو بھوپال میں وفات پائی[16]

۱۷۔ قاضی عبدالصمد افغانی : قاضی عبدالصمد قریشی قادری محمدی افغانی شیخ و عالم اور فقیہ نکتہ رس تھے۔ علوم و معرفت کے تمام گوشوں سے آگاہ تھے۔ سید احمد شہید بریلوی سے اخذ طریقت کیا، ان سے وابستہ رہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں ان کے جھنڈے تلے کام کیا۔ نہایت متقی اور نامور شیخ تھے۔ ۱۱۷۵ھ کو ولادت ہوئی اور جمعۃ المبارک کے دن ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۶۶ھ کو جنت کی راہ لی[17]

۱۸۔ مولانا عبدالعلی قنوجی : مولانا عبدالعلی بن علی اصغر قنوجی، شیخ صالح اور بہت بڑے فقیہ تھے۔ قنوج میں پیدا ہوئے اور اپنے برادر کبیر مولانا رستم علی قنوجی سے درسی کتابیں پڑھیں، یہاں تک کہ فقہ و اصول میں درجۂ کمال کو پہنچے اور فتویٰ و تدریس کے اہل ہوئے۔ اصول فقہ کی کتاب شرح المنار پر حاشیہ لکھا۔ موضع بندگی میں وفات پائی جو نواحِ کوڑہ جہاں آباد ضلع فتح پور ہسوہ میں ہے[18]

۱۹۔ سید عبدالعلی فیض آبادی : سید عبدالعلی حسینی فیض آبادی مشاہیر فقہائے شیعہ میں سے تھے۔ سید دلدار علی مجتہد نصیر آبادی ثم لکھنوی سے شیعہ فقہ کی کتابیں پڑھیں اور فیض آباد میں امامتِ نماز کا منصب سنبھالا۔ ایک خاص ڈھب کے عالم تھے۔ اِدھر محرم کا چاند نظر آتا اور اُدھر آہ و بکا شروع ہو جاتی۔ اپنے مذہب کے اونچے درجے کے عالم و فقیہ تھے[19]

---

[16] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۶۶

[17] ایضاً ص ۲۶۷ بحوالہ تذکرۃ النبلا

[18] ابجد العلوم، ص ۹۳۲، ۹۳۳ ـ نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۸۱ ـ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۳

[19] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۸۷ بحوالہ تذکرۃ العلما۔

۲۰۔ مفتی عبدالغنی پھلواروی : مفتی عبدالغنی بن عبدالمغنی بن معین الدین جعفری پھلواروی فقہ و اصول کے ماہرین میں سے تھے۔ اپنے عصر کے فاضل و شیخ تھے پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر مفتی محمد برکت عظیم آبادی اور دیگر علمائے وقت سے حصولِ علم کیا۔ شیخ حسن علی سے سلسلۂ علائیہ کے مطابق اخذِ طریقت کیا۔ اس کے بعد فرائضِ تدریس انجام دینے لگے۔ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ اپنے دور کے معروف مفتی تھے۔ ۱۲۷۰ھ میں فوت ہوئے[۲۰]

۲۱۔ مولانا عبدالقادر حیدرآبادی : فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔ متدین، متبحر عالم، مشہور فقیہ اور شیخ وقت تھے۔ سلسلۂ قادریہ میں مختلف مشائخ و صوفیا سے اخذِ طریقت کیا۔ پھر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں دہلی گئے۔ ۱۲۲۸ھ میں ان سے فیضِ تصوف حاصل کیا۔ سلخ ذی الحجہ ۱۲۶۹ھ کو حیدرآباد (دکن) میں وفات پائی[۲۱]

۲۲۔ قاضی عبدالکریم نگرامی : قاضی عبدالکریم بن محمد مقیم بن امین الدین نگرامی، اعمالِ لکھنؤ میں موضع نگرام میں پیدا ہوئے، ابتدائی درسی کتابیں اپنے ماموں محمد نذیر سے پڑھیں، فقہ و اصول کا درس حافظ امین الدین صالحی امیٹھوی سے لیا۔ منطق و حکمت کی تکمیل مولانا عبدالقدوس لکھنوی اور مولانا عبدالواجد خیرآبادی سے کی۔ علم طب حکیم ببر علی سے پڑھا۔ اخذِ طریقت قاضی عبدالکریم جوراسی سے کیا۔ رائے بریلی میں سکونت اختیار کی۔ علم فقہ اور باقی علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ انتہائی عبادت گزار، پاک باز، زاہد اور صوفی تھے۔ متعدد رسائل کے مصنف تھے، جن میں وسیلۃ النجات فی احکام الاموات، الکلام المتین فی کشف اسرار الحق والیقین، رسالہ دربیانِ مراتب ولایت و خاتم اب،

---

[۲۰] نزہۃ الخواطر، ص ۲۹۰ بحوالہ تذکرۃ الکملا۔

[۲۱] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۹۶ بحوالہ مقالاتِ طریقت۔

در محاکمہ بحث وجود مطلق و وجود عام، رسالہ در فرق میان، مروز و نتائج وغیرہ شامل ہیں۔ ۲۲ رجب ۱۲۴۹ھ کو رائے بریلی میں رحلت فرمائی[۲۲]

۲۳۔ مفتی عبداللہ سورتی: مفتی عبداللہ بن صابر بن زاہد بن حسن بن محمد قریشی سورتی، فقہ و اصول کے علمائے مشاہیر اور ممتاز مشائخ میں سے تھے۔ اپنے عم محترم مولانا خیر الدین محدث سورتی سے کسب علم کیا اور پھر سورت کے منصب افتا پر متمکن ہوئے۔ عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے[۲۳]

۲۴۔ مولانا عبدالوحید لکھنوی: عبدالوحید بن مفتی عبدالواحد بن عبدالاعلیٰ بن بحر العلوم مولانا عبدالعلی انصاری فرنگی محلی لکھنوی۔ فاضل آدمی تھے اور فقہ و اصول میں ماہر تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ اپنے چچا مولانا عبدالواحد سے علم حاصل کیا، مولانا قدرت علی لکھنوی کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہ کیا اور علوم رسمیہ بالخصوص فقہ، اصولِ فقہ اور فرائض میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ ۲۸ شعبان ۱۲۷۰ھ کو راہی ملکِ بقا ہوئے۔ اولاد سے محروم تھے[۲۴]

۲۵۔ مفتی عبدالودود مدراسی: مفتی سید عبدالودود حسینی نقوی مدراسی کے والدِ گرامی کا نام سید محی الدین حسینی تھا۔ موضع "چوگھریہ" میں پیدا ہوئے جو اعمالِ بردوان میں واقع ہے۔ مولانا امین اللہ، قاضی سراج الدین، قاضی غلام سبحان اور دیگر علمائے کلکتہ سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۲۲۲ھ میں مدراس گئے اور رنتھر نگر کے محکمۂ افتا پر متعین ہوتے۔ پھر جنگل پیٹھ

---

[۲۲] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۳۱ — نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۹۹

[۲۳] نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۰۱۔

[۲۴] تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۴۲، ۱۴۳ — نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۴ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۳۷۔ تذکرہ علمائے ہند میں سالِ وفات ۱۲۰۹ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں۔

کے منصب قضا پر فائز کیے گئے۔ بیس سال اس خدمت پر مامور رہے۔ اس کے بعد مدراس کے محکمۂ عدلیہ میں مفتی مقرر ہوئے، تقریباً چوبیس برس یہ خدمت انجام دی۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۶۸ھ میں انتقال ہوا۔[۲۵]

۲۶۔ قاضی عبیداللہ عظیم آبادی: قاضی عبیداللہ بن غلام بدر بن سلیم اللہ بن علیم اللہ نگرنہسوی عظیم آبادی کا شمار فحول علمائے عصر میں ہوتا تھا۔ ۱۶ ربیع الاول ۱۱۸۶ھ کو "موضع نگرنہسہ" میں ولادت ہوئی جو اعمالِ پٹنہ میں ہے۔ اپنے چچا مولانا امین اللہ سے کسبِ علم کیا۔ اس کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہوئے پھر علاقۂ مدراس کے ایک شہر "کم کرن" میں عہدۂ قضا پر متمکن کیے گئے۔ کافی عرصے تک وہاں کا عہدۂ قضا ان کے سپرد رہا۔ سینتیس[۳۷] برس کی عمر میں ۱۴ صفر ۱۲۲۳ھ کو "کم کرن" میں وفات پائی۔[۲۶]

۲۷۔ مولانا عزیز الحق جون پوری: شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد سے تھے اور اپنے عہد کے عالم و فقیہ اور شیخ صالح تھے۔ جون پور میں اقامت گزین تھے اور وہیں کے اساتذہ سے تحصیلِ علم کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد طویل مدت تک مصروفِ درس و افادہ رہے۔ شیخ غلام رشید جون پوری سے اخذِ طریقت کیا۔ بعد ازاں لکھنؤ گئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اپنے علم و فضل اور تدین و اخلاق کی بنا پر مقبولِ خلائق تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۲۱۳ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔[۲۷]

۲۸۔ مولانا عظیم الدین لکھنوی: اپنے دور کے شیخ و فاضل تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ وہیں کے علما سے علم حاصل کیا۔ ۱۲۱۲ھ میں مدراس گئے، وہاں بحر العلوم مولانا

---

۲۵ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۴۔ بحوالہ، حدیقۃ المرام۔

۲۶ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۷۔ بحوالہ، تذکرہ النبلا

۲۷ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۹

عبدالعلی لکھنوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد انھیں ترچناپلی شہر کی مسندِ افتا تفویض ہوئی اور یہ خدمت حسن و خوبی سے انجام دی۔ ۱۲۲۰ھ میں فوت ہوئے۔[۲۸]

۲۹۔ مولانا علی: مولانا علی بن حسن بن عسکری، مسلکاً شیعہ تھے اور اپنے دور میں علم و تحقیق کے اعتبار سے کبار علمائے شیعہ میں گردانے جاتے تھے۔ مشرف علی خاں کے نام سے مشہور تھے۔ سید محمد بن دلدار علی مجتہد لکھنوی سے علم حاصل کیا اور انھی سے فقہیات کی تکمیل کی۔ کئی کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں ایک کتاب "ازاحۃ الغی فی الرد علی عبدالحی" ہے۔ اس میں انھوں نے "صراطِ مستقیم" کے سلسلے میں مولانا عبدالحی بڑھانوی کا ردّ کیا ہے۔ ایک کتاب کا نام "کتاب المسائل" ہے۔ اس میں انھوں نے نامور شیعہ عالم سید محمد بن دلدار علی مجتہد لکھنوی اور ان کے بڑے بھائی سید حسین بن دلدار علی کے فتوے جمع کیے ہیں۔ ۱۲۴۰ھ کے قریب سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔[۲۹]

۳۰۔ مولانا علی کشمیری: مولانا علی بن یحییٰ بن معین الدین رفیقی کشمیری اکابر مشائخ حنفیہ میں سے تھے۔ ۴ رمضان ۱۱۵۲ھ میں تولد ہوئے اور اپنے والد مولانا یحییٰ اور بھائی مولانا اسلم کشمیری سے کسبِ علم کیا اور حدیث، فقہ اور علومِ عربیہ میں نمایاں مقام پر پہنچے۔ تمام عمر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ان کے بے شمار شاگردوں میں ان کے بیٹے عبدالاحد، بہاء الدین اور ضیاء الدین بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے چچا زاد بھائیوں، ابوالرضا محمد، ابوالطیب احمد، عبداللہ اور عبدالرسول نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت وسیع ہے۔ یہ وادیٔ کشمیر کے عالم باعمل، عارف باللہ، زاہد و متقی،

---

۲۸ نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۳، بحوالہ نتائج الافکار

۲۹ نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۲۱، بحوالہ تکملہ نجوم السماء۔

متورع اور نہایت عبادت گزار محدث و فقیہ تھے۔ تصوف و سلوک اور باطنی آداب و معارف سے بھی قلبی لگاؤ تھا۔ ۱۰ محرم ۱۲۱۴ھ کو جنت الفردوس کی راہ لی۔[۳۰]

۳۱۔ علی ابراہیم حسین آبادی: ان کا شمار اُمرائے حکومت میں ہوتا تھا۔ نواب علی ابراہیم کے نام سے موسوم تھے۔ درحقیقت مونگیر کے رہنے والے تھے اور عالم و فاضل امیر تھے۔ مرشد آباد کے نواب قاسم علی خاں سے تقرب ہوا، اور عرصے تک ان کے پاس رہے، پھر لارڈ ہوسٹنگ کے عہد میں بنارس کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ ادبیات سے بھی دلچسپی تھی۔ "خلاصۃ الکلام" کے نام سے شعرائے ایران کا تذکرہ لکھا اور "گلزارِ ابراہیم" کے نام سے "تذکرۂ شعرائے ہند" قلم بند کیا۔[۳۱]

۳۲۔ قاضی علی اشرف پھلواروی: قاضی علی اشرف بن علی اکبر بن وحید الحق جعفری پھلواروی فاضل فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ ۵ ربیع الثانی ۱۲۱۳ھ کو قصبہ پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد قاضی علی اکبر سے کسب علم کیا اور اخذِ طریقت کے لیے شیخ نعمت اللہ اور ان کے فرزند ابو تراب کی خدمت میں حاضری دی۔ پھر بہار چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ درس و افادۂ طلبا ان کا اصل مشغلہ تھا۔ بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔ ۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۹۲ھ کو وفات پائی۔[۳۲]

۳۳۔ سیّد علی ضامن نونہروی: سیّد علی ضامن بن امداد علی حسینی نونہروی معروف

---

[۳۰] حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۲ ——— نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۲۳ ——— تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۸۔

[۳۱] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۲۶۔

[۳۲] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۲۷ بحوالہ شجرۂ شیخ بدرالدین۔

فقہائے شیعہ میں گردانے جاتے تھے۔ مولد و منشا "نوہرہ" ہے جو اعمالِ غازی پور میں واقع ہے۔ تحصیلِ علم کے لیے مولانا عبد الحلیم لکھنوی اور مولانا تراب علی امروہوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ "شمس البازغہ" پر حاشیہ تحریر کیا۔ ۱۲۸۰ھ میں انتقال کیا۔[۳۳]

۳۴۔ مولانا علی محمد لکھنوی: مولانا علی محمد انصاری لکھنوی، جلیل القدر علما میں سے تھے۔ ولادت و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ اپنے چچازاد بھائی مولانا خادم احمد لکھنوی سے کسبِ علم کیا۔ علم فقہ بھی انہی سے پڑھا۔ اردو میں چند رسالے بھی لکھے جن میں ایک کا نام "ھدایتِ نسواں" ہے، ایک "چشمۂ فیض" ہے۔ جس میں پانی کی طہارت و نجاست کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ایک اور رسالہ "مسائل زکوٰۃ" سے متعلق ہے۔ اس عالم و فقیہ کا ارتحال ۱۲۸۸ھ میں ہوا۔[۳۴]

۳۵۔ مولانا علیم اللہ گنگوہی: مولانا علیم اللہ نقشبندی گنگوہی، عالم ربانی اور شیخ صالح تھے۔ فقہ و اصول میں یگانہ تھے۔ میرزا مظہر جان جاناں سے اخذِ طریقت کیا اور طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے اور فیض حاصل کیا۔ یہاں تک کہ علم و معرفت کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ ۱۲۱۱ھ کو وفات پائی۔[۳۵]

۳۶۔ مولانا عیاض رام پوری: مولانا عیاض بن ابو عیاض افغانی رام پوری، فقہ، نحو، اور ربانی علوم عربیہ میں دسترس رکھتے تھے۔ مفتی شرف الدین رام پوری کے شاگرد تھے۔ علم صرف میں "دستور المنتہی" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو صفی الدین ردولوی (متوفی ۱۳ ذیقعدہ ۸۱۹ھ) کی "دستور المبتدی" کے انداز کی کتاب ہے۔[۳۶]

✣ ✣ ✣ ✣ ✣

[۳۳] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۳۳۔ بحوالہ نجوم السماء [۳۴] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۳۵

[۳۵] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۳۸ بحوالہ خزینۃ الاصفیا

[۳۶] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۴۴۔

مراجع ومصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ آثارالاول من علماء فرنگی محل :۔ عبدالباری فرنگی محلی مطبع مجتبائی لکھنؤ۔

۲۔ آثارالصنادید :۔ سرسید احمد خاں۔ ترتیب وحواشی: ڈاکٹر معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی ۱۹۶۶ء۔

۳۔ ابجد العلوم :۔ نواب صدیق حسن خان مطبع صدیقی، بھوپال۔ ۱۲۹۵ھ۔

۵۔ اتحاف النبلا :۔ نواب صدیق حسن خاں مطبع نظامی، کان پور ۱۲۸۸ھ

۶۔ اخبار الصنادید :۔ حکیم نجم الغنی رام پوری مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۷۔ احوال علمائے فرنگی محل :۔ شیخ الطاف الرحمن، مطبع مجتبائی لکھنؤ۔

۸۔ انفاس العارفین :۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مطبع مجتبائی۔ دہلی ۱۹۱۷ء۔

۹۔ انوارالعارفین :۔ حافظ محمد حسین مرادآبادی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۷۶ھ۔

۱۰۔ انوارِ اقبال :۔ بشیر احمد ڈار۔ اقبال اکادمی پاکستان، کراچی۔ طبع اول، مارچ ۱۹۶۷ء۔

۱۱۔ تاریخ اہلِ حدیث :۔ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی۔ ناشر :۔ اسلامی پبلشنگ کمپنی۔ لاہور، ۱۹۵۳ء۔

۱۲۔ تاریخ شیراز ہند جون پور :۔ [illegible] ادارہ شیرازِ ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور۔ ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء۔

۱۳۔ تاریخ النوائط :۔ نواب عزیز جنگ بہادر، مطبع عزیزیہ [illegible] حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۲ھ۔

۱۴۔ تاریخی مقالات :۔ خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔ ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء۔

۱۵۔ تجلی نور المعروف بہ تذکرہ مشاہیر [illegible] :۔ نورالدین زیدی مطبع اعظم المطابع جون پور۔ ۱۸۸۹ء۔

۱۶۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل :۔ مولوی محمد عنایت اللہ۔ مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۳۰ء۔

۱۷۔ تذکرہ مشائخ بنارس :۔ ابوالاثر عبدالسلام، ندوۃ المعارف، بنارس، ۱۳۷۱ھ۔

۱۸۔ تذکرہ علمائے ہند :۔ رحمان علی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۴ء۔

۱۹۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری :۔ محمد علی حیدر، مطبع اصح المطابع، لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء۔

۲۰۔ تذکرہ مصنفین درس نظامی :۔ اختر راہی مسلم اکادمی، لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔

۲۱۔ تراجم علمائے حدیث ہند :۔ ابویحییٰ امام خاں نوشہروی۔ جید برقی پریس، دہلی ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۸ء۔

۲۲۔ تسہیل القاری۔ ترجمہ صحیح بخاری :۔ نواب وحیدالزمان خاں۔ طبع اول، لاہور

۲۳۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جیود الابرار :۔ نواب صدیق حسن خاں۔ مطبوعہ بھوپال، ۱۲۹۸ھ۔

۲۴۔ حجۃ اللہ البالغہ :۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مکتبہ سلفیہ، لاہور، ۱۹۷۵ء۔

۲۵۔ حضرت مولانا سید داؤد غزنوی :۔ مرتبہ :۔ سید ابوبکر غزنوی۔ طبع اول، لاہور۔

۲۶۔ جماعت مجاہدین :۔ مولانا غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۵ء

۲۷۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء واقعات و شخصیات : ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔ پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۷۶ء۔

۲۸۔ حدائق الحنفیہ :۔ مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۹ء۔

۲۹۔ حیات جاوید :۔ مولانا الطاف حسین حالی، اکادمی پنجاب، لاہور، ۱۹۵۷ء۔

۳۰۔ حیات شبلی :۔ سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء۔

۳۱۔ حیات ولی :۔ مولانا رحیم بخش دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء۔

۳۲۔ الحیات بعد المماۃ :۔ فضل حسین۔ طبع کراچی، ۱۹۵۹ء۔

۳۳۔ خزینۃ الاصفیا :۔ مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت

بیج ناتھ موسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ۔

۳۴ - رودِ کوثر :- شیخ محمد اکرام ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔

۳۵ - سرگزشتِ مجاہدین :- مولانا غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۶ء۔

۳۶ - سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی :- از مولانا عبدالجبار غزنوی و مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ۔ طبع لاہور۔

۳۷ - سیّد احمد شہید :- غلام رسول مہر۔ کتاب منزل لاہور۔ ۱۹۵۴ء۔

۳۸ - طرب الاماثل بتراجم الافاضل :- مولانا عبدالحی لکھنوی۔ مطبع یوسفی، لکھنؤ ۱۹۲۱ء۔

۳۹ - علمائے ہند کا شاندار ماضی :- مولانا محمد میاں۔ مکتبہ محمودیہ۔ لاہور۔ ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء۔

۴۰ - علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) مرتبہ محمد ایوّب قادری۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔ ۱۹۶۰ء

۴۱ - فتاویٰ عزیزی :- شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی۔ ترتیب: مولانا محمد احسن نانوتوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء۔

۴۲ - فقہائے ہند :- جلد پنجم حصّہ دوم :- محمد اسحٰق بھٹی۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۸۱ء۔

۴۳ - فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری :- جلد اوّل۔ محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۸۲ء۔

۴۴ - الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ :- مولانا عبدالحی لکھنوی۔ طبع مصر، ۱۳۲۴ھ

۴۵ - قاموس المشاہیر :- (جلد دوم) نظام الدین حسین نظامی بدایونی۔ نظامی پریس، بدایوں۔ ۱۹۲۵ء۔

۴۶ - قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب :- مولوی ذوالفقار احمد۔ مطبع فیض منبع مفیدِ عام، آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ۔

۴۷ - کالا پانی :- مولانا محمد جعفر تھانیسری - ترتیب و تہذیب : محمد سرور طارق - طارق اکیڈمی فیصل آباد - ۱۹۷۷ء -

۴۸ - لال قلعہ کی ایک جھلک :- ناصر نذیر فراق - طبع دہلی -

۴۹ - محاسن موضح قرآن :- مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی - طبع دہلی - ۱۹۷۷ء

۵۰ - مومن خاں مومن :- کلب علی فائق - مجلس ترقی ادب لاہور - ۱۹۶۴ء -

۵۱ - مفتاح التاریخ :- منشی دالنشور - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۲۸۴ھ -

۵۲ - مقالاتِ شبلی :- جلد ۳ - مرتبہ - سید سلیمان ندوی - دار المصنفین، اعظم گڑھ - ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ء -

۵۳ - ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی :- مطبع مجتبائی، میرٹھ - ۱۳۱۴ھ -

۵۴ - مکتوبات امام الزمان شیخ عبداللہ غزنوی علیہ الرحمۃ والغفران :- طبع لاہور -

۵۵ - مہر منیر (سوانح عمری پیر مہر علی شاہ) از مولانا فیض احمد فیض - مطبوعہ پاکستان انٹرنیشنل پرنٹرز، مغل پور - لاہور -

۵۶ - نزہۃ الخواطر، جلد ۷ - سید عبدالحی حسنی، دائرۃ المعارف العثمانیہ - حیدرآباد (دکن) ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۹ء -

۵۷ - ہمارے ہندوستانی مسلمان :- اردو ترجمہ : ڈاکٹر صادق حسین - اقبال اکیڈمی - لاہور - ۱۹۴۶ء

۵۸ - واقعات دار الحکومت دہلی :- (جلد ۲) بشیر الدین احمد دہلوی - شمسی مشین پریس، آگرہ ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء -

۵۹ - الیانع الجنی :- محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تیمی بکری ترہٹی - مطبع صدیقی پریس، بریلی، ۱۲۸۷ھ -

۶۰ - ماہنامہ "اسرارِ حکمت" اگست ۱۹۶۴ء - لاہور -

۶۱ - ہفت روزہ "الہام" اگست ۱۹۷۶ء - بہاول پور -

۶۲ - ہفت روزہ "الاعتصام"، فروری ۱۹۶۴ء - لاہور -

۶۳ - ہفت روزہ "الاعتصام" تحریک آزادی ۱۸۵۷ء نمبر (مئی ۱۹۵۷ء) لاہور -

۶۴ - ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ - مارچ ۱۹۳۹ء - ۶۵ - "المعارف" لاہور - جون ۱۹۸۳ء -